تدبّرِ قرآن

٦

الأنعام

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

۱۔ سورتوں کے دوسرے گروپ پر ایک اجمالی نظر

سورۂ مائدہ پر، جیسا کہ ہم مقدمے میں واضح کر چکے ہیں، سورتوں کا پہلا گروپ تمام ہوا۔ اب یہ انعام سے۔ دوسرا گروپ شروع ہو رہا ہے۔ اس میں چار سورتیں ہیں۔ انعام، اعراف، انفال، برأت۔ انعام اور اعراف مکی ہیں، انفال اور برأت مدنی۔ انعام و اعراف دونوں میں خطاب اہلِ مکہ سے ہے۔ انعام میں توحید، معاد اور رسالت کے بنیادی مسائل زیرِ بحث آئے ہیں اور اصل دینِ ابراہیمؑ کی وضاحت کی گئی ہے۔ بنائے استدلال تمام تر عقل و فطرت اور آفاق و انفس کے شواہد پر ہے یا پھر ان مسلمات پر جن کو اہلِ عرب تسلیم بھی کرتے تھے اور جو صحیح بھی تھے۔

اعراف میں انذار کا پہلو غالب ہے۔ اس میں قریش پر یہ حقیقت واضح کی گئی ہے کہ کسی قوم کے اندر ایک رسول کی بعثت کے مقتضیات و تضمنات کیا ہوتے ہیں، اس باب میں اللہ تعالیٰ کے قاعدے اور ضابطے کیا ہیں، اگر کوئی قوم اپنے رسول کی تکذیب پر جم جاتی ہے تو اس کے نتائج کیا ہوتے ہیں، اس معاملے میں تاریخ کی شہادت کیا ہے اور اگر وہ اپنی ضد اور ہٹ دھرمی کی اس روش سے باز نہ آئے تو اسے اپنے لیے کس روزِ بد کا انتظار کرنا چاہیے۔

انفال میں مسلمانوں کو اپنی کمزوریاں دور کر کے اللہ اور رسول کی اطاعت پر مجتمع ہونے اور کفارِ قریش سے جہاد پر ابھارا ہے۔ قریش کے متعلق صاف صاف یہ اعلان فرمایا ہے کہ ان کو بیت اللہ پر قابض رہنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ اس وراثتِ ابراہیمی کے حق دار مسلمان ہیں نہ کہ قریش۔ مسلمانوں کو ہدایت دی ہے کہ تم ان سے مرعوب نہ ہو، اب ان کے لیے ذلت اور عذاب کا وقت آ چکا ہے۔ اگر یہ اپنی روش سے باز نہ آئے تو منہ کی کھائیں گے اور دنیا و آخرت دونوں میں کوئی بھی ان کو پناہ دینے والا نہیں ہوگا۔

سورۂ برأت میں کھلم کھلا قریش کو الٹی میٹم ہے۔ ان کے لیے صرف دو راہیں کھلی چھوڑی گئی ہیں۔ اسلام یا تلوار۔ مسلمانوں کو ان سے ہر قسم کے روابط قطع کرنے کی ہدایت کی گئی ہے۔ جو مسلمان رشتہ و قرابت کی بنا پر ان سے در پردہ تعلق رکھتے تھے ان کو سخت سرزنش کی گئی ہے اور ان کے سامنے بھی واضح طور پر دو شکلیں رکھ دی گئی ہیں، یا تو اپنے آپ کو نفاق کی تمام آلائشوں سے پاک کر کے سچے اور پکے مسلمان بن جائیں یا پھر اسی انجام سے دوچار ہونے کے لیے تیار ہو جائیں جو اللہ و رسولؐ کے ان دشمنوں کا ہونے والا ہے۔

اس روشنی میں اگر تدبر کے ساتھ آپ اس گروپ کی تلاوت کریں گے تو معلوم ہوگا کہ ان چاروں سورتوں میں نہایت گہری حکیمانہ ترتیب ہے۔ انعام میں قریش پر اتمامِ حجت ہے، اعراف میں ان کو انذار ہے، انفال میں مسلمانوں کو جہاد کی تیاری کی ہدایت اور بیت اللہ کی تولیت سے قریش کی معزولی کا فیصلہ ہے۔ برأت میں قریش کو الٹی میٹم اور منافقین کو آخری تہدید ہے۔

پہلے گروپ میں اصل بحث اہل کتاب سے تھی، قریش سے اگر کہیں خطاب ہوا تھا تو ضمناً۔ برعکس اس کے اس گروپ میں اصل خطاب قریش سے ہے۔ اہل کتاب کا اس میں ذکر آیا ہے تو ضمناً۔ مواد استدلال میں بھی مخاطب کے اختلاف کے لحاظ سے بنیادی فرق ہے۔ اس گروپ میں بیشتر استدلال عقل و فطرت اور آفاق و انفس کے شواہد سے ہے اور پہلے گروپ میں اہل کتاب کے تعلق سے وہ ساری چیزیں استدلال کے طور پر استعمال ہوئی ہیں جن کو اہل کتاب مانتے تھے۔ پہلے گروپ میں اہل کتاب کو امامت کے منصب سے معزول کیا گیا ہے اور ان کی جگہ مسلمانوں کو دی گئی ہے۔ اس گروپ میں قریش کو بیت اللہ کی تولیت سے معزول کیا گیا ہے اور اس کی خدمت امتِ مسلمہ کے سپرد کی گئی ہے۔

یہ پورے گروپ پر ایک اجمالی تبصرہ ہوا۔ اب ہم اس کی ایک ایک سورہ کو الگ الگ لے کر اس کی تفسیر کریں گے۔ گروپ کی پہلی سورہ انعام ہے۔ اب ہم اللہ کا نام لے کر اس کی تفسیر شروع کرتے ہیں۔ وبید اللہ التوفیق۔

ب - سورہ کا عمود

سورۂ انعام میں، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، مخاطب قریش ہیں۔ ان کے سامنے توحید، معاد اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کے دلائل واضح کرتے ہوئے ان کو ایمان لانے کی دعوت دی گئی ہے اور ساتھ ہی یہ تنبیہ ہے کہ اگر انھوں نے یہ دعوت قبول نہ کی تو اس انجام سے دوچار ہونے کے لیے ان کو تیار رہنا چاہیے جس سے رسولوں کی تکذیب کرنے والی قوموں کو دوچار ہونا پڑا۔ اہلِ عرب چونکہ حضرت ابراہیمؑ کی اولاد تھے اور ان کا دعویٰ یہ تھا کہ جس مذہب پر وہ ہیں یہ ان کو حضرت ابراہیمؑ ہی سے وراثت میں ملا ہے اس وجہ سے اس سورہ میں اس حجت کو خاص طور پر نمایاں کیا گیا ہے جو حضرت ابراہیمؑ نے اپنی قوم کے سامنے پیش کی تاکہ قریش پر یہ واضح ہو جائے کہ اصل ملتِ ابراہیمؑ کیا ہے اور اس کے حقیقی پیرو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہؓ ہیں یا قریش —— سورہ کے اس عمود کو پیش نظر رکھتے ہوئے اب ایک اجمالی نظر سورہ کے مطالب پر ڈالیے۔

ج - سورہ کے مطالب کا تجزیہ

(۱-۵) توحید اور معاد کے بعض واضح دلائل کی طرف اشارہ۔ بالکل بدیہی حقائق سے اعراض پر اظہارِ تعجب۔ قرآن کی تکذیب ایک امرِ حق کی تکذیب ہے جس کا خمیازہ یہ بھگتیں گے۔ قرآن انھیں جن نتائج کی خبر دے رہا ہے وہ سب پیش آ کے رہیں گے۔

(۶-۷) رسولوں کی تکذیب کرنے والے عذابِ الٰہی میں پکڑے گئے۔ عرب کی پچھلی تاریخ کی طرف اشارہ۔

(۸-۱۱) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی کہ کوئی بڑے سے بڑا معجزہ بھی ان جھٹلانے والوں کو قائل نہیں کر سکتا۔ جو معجزہ یہ مانگتے ہیں وہ بھی ان کو دکھا دو گے جب بھی یہ اپنے انکار سے باز نہیں آئیں گے۔ تم سے پہلے جو رسول آئے اس

قماش کے لوگوں نے ان کا بھی مذاق اڑایا بالآخر وہ اس عذاب میں مبتلا ہو کے رہے جس کا انھوں نے مذاق اڑایا۔ ان کو اُن کے ملک کی تاریخ کی طرف توجہ دلاؤ۔

(۱۲-۱۳) آسمان و زمین میں جو کچھ ہے سب خدا ہی کی ملکیت ہے۔ اس نے اپنے اوپر رحمت واجب کر رکھی ہے اس وجہ سے لازم ہے کہ وہ جزا اور سزا کا دن لائے۔

(۱۴-۱۸) شرک سے اظہار برأت۔ خیر و شر سب خدا ہی کے ہاتھ میں ہے۔ سب اُسی کے قبضۂ قدرت میں ہیں۔ وہ حکیم و خبیر ہے۔

(۱۹-۲۴) توحید اور شرک کے باب میں فیصلہ کن شہادت اللہ کی ہے اور اللہ کی شہادت توحید کے حق میں ہے۔ یہ قرآن اسی شہادت کے ساتھ اُترا ہے۔ سچے اہل کتاب بھی اس سے آشنا ہیں، صرف بدبخت ہی ہیں جو اس پر ایمان لانے سے محروم رہیں گے۔ جو لوگ شرک کے مدعی ہیں وہ خدا پر جھوٹ افترا کر رہے ہیں۔ ایسے ظالم فلاح نہیں پائیں گے۔ قیامت کے دن جب ان سے سوال ہوگا کہ تمھارے شرکاء کہاں ہیں تو ان کے ہاتھوں کے طوطے اڑ جائیں گے۔

(۲۵-۳۲) یہ لوگ اگر سنتے بھی ہیں تو سمجھنے اور ماننے کے لیے نہیں بلکہ کٹ حجتی کے لیے سنتے ہیں، قرآن ان کو پچھلے مکذبین کی جو سرگزشتیں سناتا ہے ان سے سبق حاصل کرنے کے بجائے یہ ان کو اگلوں کا فسانہ کہتے ہیں۔ ان کی آنکھیں تو اسی وقت کھلیں گی جب یہ دوزخ کے کنارے کھڑے ہوں گے۔ اس وقت یہ اپنی بدبختی پر ماتم اور حسرت کریں گے کہ کاش پھر دنیا میں جانا ہوتا کہ ایمان لاتے۔ آج ان کے نزدیک زندگی بس اسی دنیا کی زندگی ہے جس دن یہ اپنے رب کے حضور پیش کیے جائیں گے اس دن حسرت سے کہیں گے ہائے ہماری بدبختی ہم نے اپنی زندگی کس طرح برباد کی۔

(۳۳-۳۹) پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی کہ نشانیٔ عذاب کا مطالبہ پورا نہ کیے جانے پر یہ جو تمھارا مذاق اڑا رہے ہیں، یہ چیز تمھارے لیے غم کا باعث نہ بنے۔ یہ تمھارا مذاق نہیں بلکہ خدا کا مذاق اڑا رہے ہیں۔ اس وجہ سے اس معاملے کو خدا پر چھوڑ دو۔ تم سے پہلے جو انبیاء گزرے ہیں ان کو بھی اسی طرح کے حالات سے سابقہ پیش آیا تو انھوں نے صبر کیا۔ اس کے بعد اللہ کی نصرت ظاہر ہوئی۔ یہی سنت اللہ ہے اور سنت اللہ میں تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ تمھیں اس معاملے میں پریشان نہیں ہونا چاہیے۔ ایمان تو وہی لائیں گے جن کے اندر کچھ صلاحیت ہے، جن کے دل بالکل مردہ ہو چکے ہیں وہ بڑی سے بڑی نشانیاں دیکھنے کے بعد بھی ایمان نہیں لائیں گے۔ خدا کے آسمان و زمین نشانیوں سے بھرے پڑے ہیں لیکن جو اندھے ہو چکے ہیں ان کو ان نشانیوں سے کیا فائدہ؟

(۴۰-۵۰) یہ عذاب کی نشانی مانگتے ہیں، ان سے پوچھو کہ اگر خدا کا عذاب آیا تو اس سے بچاؤ کا کیا سامان انھوں نے کر رکھا ہے؟ پچھلی قوموں کا حوالہ کہ انھوں نے بھی اپنے رسولوں سے نشانیاں مانگیں تو اللہ نے ان کو مختلف مصیبتوں میں مبتلا کیا لیکن خدا کی طرف متوجہ ہونے کے بجائے ان کے دل اور سخت ہو گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ خدا نے ان کی جڑ ہی کاٹ دی۔ پیغمبر کی طرف سے یہ اظہار و اعلان کہ میں خدا کے خزانوں کا مالک اور غیب کا عالم ہونے کا مدعی نہیں ہوں میں تو بس وحی الٰہی کا پیرو ہوں۔

(۵۱-۵۵) پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ہدایت کہ جن کے اندر خدا اور آخرت کا خوف موجود ہے وہی اس قرآن

سے فائدہ اُٹھائیں گے۔ سو ان کو اس کے ذریعہ سے جگاؤ۔ رہے وہ جو معجزات کے طالب ہیں تو ان کو نظر انداز کرو۔ جو غریب لوگ اللہ کی خوشنودی کے طالب اور تمھاری باتوں کے سننے والے ہیں ان کو ان متکبرین کے مطالبہ پر اپنے سے دور نہ کرو۔ اگر یہ متکبرین اس وجہ سے تمھارے پاس نہیں آتے کہ تمھاری مجلس میں غربا ہوتے ہیں تو ان کو ان کے حال پر چھوڑو، تم ان کے ایمان و اسلام کے ذمہ دار نہیں ہو۔ ان کے لیے غریبوں کی غریبی اور ان کی اپنی امیری فتنہ بن گئی ہے۔ تم ان غربائے مسلمین کا بہر حال خیر مقدم کرو اور ان کو بشارت دو۔

(۵۶-۶۷) شرک سے اعلانِ بیزاری کی ہدایت اس لیے کہ اس کی کوئی دلیل نہیں۔ پیغمبر ایک واضح شہادت اپنے پاس رکھتا ہے اور یہ مکذبین اس شہادت کو تو جھٹلاتے ہیں اور نشانی عذاب کا مطالبہ کرتے ہیں۔ عذاب کا لانا پیغمبر کے اختیار میں نہیں، خدا کے اختیار میں ہے۔ ہر جان خدا کی مٹھی میں ہے۔ اللہ جب چاہے اور جہاں سے چاہے عذاب بھیج سکتا ہے۔ ہر بات کا ایک وقت مقرر ہے۔ یہ جھٹلانے والے عنقریب جان لیں گے۔

(۶۸-۷۰) پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ہدایت کہ جب دیکھو کہ ان مکذبین کو اعتراض و مخالفت کا بخار چڑھ گیا ہے تو ان سے بحث میں نہ اُلجھو، بلکہ کنارہ کش ہو جاؤ۔ تمھارا کام تذکیر و موعظت ہے۔ جب دیکھو کہ وہ سننا نہیں چاہتے تو ان کو ان کے حال پر چھوڑ دو، یہ خود بھگتیں گے، تم ان کے ایمان و اسلام کے ذمہ دار نہیں ہو۔

(۷۱-۷۳) ان سے کہہ دو کہ حق واضح ہو جانے اور اللہ کی ہدایت آ جانے کے بعد کیا ہماری مت ماری گئی ہے کہ ہم صحرا میں گم کردہ راہ قافلے کی طرح بھٹکتے پھریں؟ ہم تو اب اسی راہ پر چلیں گے جو خدا نے ہمارے لیے کھولی ہے۔

(۷۴-۸۳) توحید کے ثبوت میں حضرت ابراہیم نے جو دلیل اپنی قوم پر قائم کی اس کا بیان۔

(۸۴-۹۰) حضرت ابراہیم سے پہلے اور ان کے بعد ان کی ذریت میں جو انبیاء و رسل اس دینِ توحید کے حامل اُٹھے ان کی طرف ایک سرسری اشارہ اور اس بات کی تاکید کہ اصل ہدایت کی راہ یہی ہے جو ان پیغمبروں نے بتائی ہے تو اس پر مضبوطی سے استوار رہو۔ اگر کفار قریش اس کا انکار کرنا چاہتے ہیں تو ان کی پروا نہ کرو۔ اللہ دوسروں کو اس کی تائید و حمایت میں کھڑا کر دے گا۔

(۹۱-۹۲) یہود کا اٹھایا ہوا ایک اعتراض اور اس کا جواب۔

(۹۳-۹۴) ان بدد ماغوں کی تردید جو دعویٰ کرتے تھے کہ اگر وہ چاہیں تو وہ بھی اسی طرح کا کلام پیش کر سکتے ہیں جس قسم کا کلام محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) خدا کی طرف منسوب کر کے پیش کرتے ہیں، انھیں بھی وحی کا تجربہ ہوتا ہے۔

(۹۵-۹۹) توحید کے آفاقی دلائل۔

(۱۰۰-۱۰۵) شرک کی تردید اور یہ تنبیہ کہ ہدایت تمھارے پاس آ چکی، اب جو گمراہی اختیار کرے گا تو ذمہ داری خود اس پر ہے۔

(۱۰۶-۱۰۸) پیغمبر کو مضبوطی سے وحی الٰہی کے اتباع پر جمے رہنے اور مشرکین سے اعراض کی ہدایت اور مسلمانوں کو یہ نصیحت کہ مشرکین کے بتوں اور معبودوں کی بے ضرورت تحقیر و تذلیل نہ کی جائے کہ وہ مشتعل ہو کر تمھارے خدا کو برا بھلا کہنے لگیں۔

(۱۰۹-۱۱۱) کفار کی اس قسم کی تردید کہ اگر ان کی طلب کے مطابق ان کو معجزہ دکھا دیا جائے تو وہ ضرور ایمان لائیں گے۔

فرمایا کہ اگر ان کو دنیا جہان کے معجزے دکھا دیے جائیں جب بھی جو ایمان لانے والے نہیں ہیں وہ ایمان نہیں لائیں گے۔

(۱۱۲-۱۱۷) اس سنت اللہ کا بیان کہ جب نبی کی دعوت بلند ہوتی ہے تو شیاطین جن و انس کو بھی یہ مہلت دی جاتی ہے کہ وہ اپنے باطل کو ملمع کر کے لوگوں کے سامنے پیش کر لیں تاکہ جن کو ان کی راہ اختیار کرنی ہے وہ ان کی راہ اختیار کریں۔ پیغمبر کو یہ ہدایت کہ تم ان الجھنے والوں کو بتا دو کہ جب میرے پاس خدا کی کتاب آچکی ہے تو میں اس کو چھوڑ کر کسی دوسری چیز کی پیروی کس طرح کر سکتا ہوں۔

(۱۱۸-۱۲۳) مسلمانوں کو یہ ہدایت کہ تم در غلانے والوں کی باتوں سے ہوشیار رہو۔ انھوں نے اپنے مشرکانہ عقاید کے تحت جو چیزیں حرام کر رکھی ہیں ان کے باب میں تم ان کی بدعات کی پروا نہ کرو بلکہ وہ چیزیں کھاؤ جن کی حرمت کی کوئی دلیل نہ ملت ابراہیم میں موجود ہے نہ قرآن نے ان کے حرام ہونے کی خبر دی ہے۔ اب خدا نے تمھیں تاریکی سے روشنی میں لا کھڑا کیا ہے تو تم ان لوگوں کی بدعات اور کج بحثیوں کی پروا نہ کرو جو کفر و شرک کے اندھیرے میں ٹھوکریں کھا رہے ہیں۔

(۱۲۴-۱۲۷) ان مغروروں کی تردید جو قرآن پر ایمان لانے کی شرط یہ ٹھہراتے تھے کہ جب تک ان پر بھی اسی طرح وحی نہ آئے جس طرح پیغمبر پر آتی ہے اس وقت تک وہ اس پر ایمان نہ لائیں گے۔ فرمایا کہ نبوت کے مرتبۂ بلند کا سزاوار ہر شخص نہیں ہوتا۔ اللہ ہی جانتا ہے کہ کون اس کا اہل ہے، کون نہیں۔ جو لوگ کبر نفس میں مبتلا ہو کر دنیا اور آخرت دونوں کی سرفرازیوں کا اجارہ دار صرف اپنے کو سمجھتے ہیں وہ اپنے اس غرور کی سزا پائیں گے۔ رہا ایمان لانے اور نہ لانے کا معاملہ تو یہ اللہ کی توفیق پر منحصر ہے اور اس توفیق کے لیے ایک مخصوص سنت الٰہی ہے۔

(۱۲۸-۱۳۵) آخرت میں جنوں اور انسانوں کے گمراہ لوگ اعتراف کریں گے کہ وہ اتمام حجت کے باوجود محض اپنی شامت اعمال سے اس انجام کو پہنچے۔ قریش کو دھمکی کہ سنبھلنا چاہتے ہو تو اب بھی سنبھل جاؤ ورنہ جس عذاب کی دھمکی تمھیں سنائی جا رہی ہے وہ آ کے رہے گا اور کوئی اس سے بچ نہ سکے گا۔

(۱۳۶-۱۴۴) مشرکین نے اپنے مشرکانہ عقائد کے تحت کھیتی اور چوپایوں میں سے جن چیزوں کو حرام ٹھہرا لیا تھا یا اپنے دیوتاؤں کو راضی کرنے کے لیے انسانی جانوں کی جو قربانیاں پیش کرتے تھے ان کی تردید و مذمت کہ یہ سب باتیں بے سروپا اوہام پر مبنی ہیں، عقل، فطرت اور ملت ابراہیم میں ان کی کوئی اصل نہیں ہے۔

(۱۴۵-۱۵۴) ملت ابراہیم اور ملت موسوی میں جو چیزیں حرام ٹھہرائی گئیں ان کی طرف ایک اشارہ، مشرکین کے اس عذر کی تردید کہ وہ جس راستہ پر ہیں، خدا ہی کے چلانے سے اس پر ہیں، اگر اللہ کو یہ راستہ پسند نہیں ہے تو وہ ان کو صحیح راستہ پر کیوں نہیں چلا دیتا۔

(۱۵۵-۱۶۵) اس قرآن کے ذریعہ سے جو اتمام حجت ہوا ہے اس کا بیان۔ اب اس کے بعد بھی اگر لوگ کسی نشانی کے ظہور کے منتظر ہیں تو وہ انتظار کریں، اس قسم کی نشانی دکھانا پیغمبر کے اختیار میں نہیں ہے۔ پیغمبر کی طرف سے یہ اعلان کہ خدا نے مجھے ملت ابراہیم کی ہدایت بخشی ہے اور میں اس پر چل کھڑا ہوا ہوں۔ اب جس کا جی چاہے اس صراط مستقیم پر آئے اور جس کا جی چاہے بھٹکتا پھرے۔ اللہ کے ہاں ہر ایک اپنے اعمال کا ذمہ دار ہے۔

سُوْرَةُ الْاَنْعَامِ (٦)

مَكِّیَّةٌ ——— اٰیَاتُهَا ١٦٥

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

آیات ١-١١ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَجَعَلَ الظُّلُمٰتِ
وَالنُّوْرَ ثُمَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ یَعْدِلُوْنَ (١) هُوَ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ
مِّنْ طِیْنٍ ثُمَّ قَضٰۤی اَجَلًا ؕ وَاَجَلٌ مُّسَمًّی عِنْدَهٗ ثُمَّ اَنْتُمْ
تَمْتَرُوْنَ (٢) وَهُوَ اللّٰهُ فِی السَّمٰوٰتِ وَفِی الْاَرْضِ ؕ یَعْلَمُ سِرَّكُمْ
وَجَهْرَكُمْ وَیَعْلَمُ مَا تَكْسِبُوْنَ (٣) وَمَا تَاْتِیْهِمْ مِّنْ اٰیَةٍ
مِّنْ اٰیٰتِ رَبِّهِمْ اِلَّا كَانُوْا عَنْهَا مُعْرِضِیْنَ (٤) فَقَدْ كَذَّبُوْا
بِالْحَقِّ لَمَّا جَآءَهُمْ ؕ فَسَوْفَ یَاْتِیْهِمْ اَنْۢبٰٓؤُا مَا كَانُوْا بِهٖ
یَسْتَهْزِءُوْنَ (٥) اَلَمْ یَرَوْا كَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنْ قَرْنٍ مَّكَّنّٰهُمْ
فِی الْاَرْضِ مَا لَمْ نُمَكِّنْ لَّكُمْ وَاَرْسَلْنَا السَّمَآءَ عَلَیْهِمْ مِّدْرَارًا ۪
وَّجَعَلْنَا الْاَنْهٰرَ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهِمْ فَاَهْلَكْنٰهُمْ بِذُنُوْبِهِمْ وَ
اَنْشَاْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ قَرْنًا اٰخَرِیْنَ (٦) وَلَوْ نَزَّلْنَا عَلَیْكَ كِتٰبًا
فِیْ قِرْطَاسٍ فَلَمَسُوْهُ بِاَیْدِیْهِمْ لَقَالَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْۤا اِنْ هٰذَاۤ اِلَّا

سِحْرٌ مُّبِينٌ ﴿٧﴾ وَقَالُوا لَوْلَا أُنزِلَ عَلَيْهِ مَلَكٌ ۖ وَلَوْ أَنزَلْنَا
مَلَكًا لَّقُضِيَ الْأَمْرُ ثُمَّ لَا يُنظَرُونَ ﴿٨﴾ وَلَوْ جَعَلْنَاهُ مَلَكًا لَّجَعَلْنَاهُ
رَجُلًا وَلَلَبَسْنَا عَلَيْهِم مَّا يَلْبِسُونَ ﴿٩﴾ وَلَقَدِ اسْتُهْزِئَ بِرُسُلٍ
مِّن قَبْلِكَ فَحَاقَ بِالَّذِينَ سَخِرُوا مِنْهُم مَّا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِئُونَ ﴿١٠﴾ ع ١
قُلْ سِيرُوا فِي الْأَرْضِ ثُمَّ انظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِينَ ﴿١١﴾

ترجمہ آیات ۱ - ۱۱

شکر کا سزاوار اللہ ہی ہے جس نے پیدا کیا آسمانوں اور زمین کو اور بنایا تاریکیوں اور روشنی کو، پھر تعجب ہے کہ جن لوگوں نے کفر کیا وہ اپنے رب کے ہم سر ٹھہراتے ہیں۔ وہی ہے جس نے تمھیں مٹی سے پیدا کیا، پھر ایک مدت ٹھہرائی اور مدت مقررہ اسی کے علم میں ہے، پھر تعجب ہے کہ تم کج بحثیاں کرتے ہو! اور وہی اللہ آسمانوں میں بھی ہے اور وہی زمین میں بھی۔ وہ تمھارے خفیہ اور علانیہ کو جانتا ہے اور جو کمائی تم کر رہے ہو اسے بھی جانتا ہے۔ اور نہیں آتی ان کے پاس ان کے رب کی نشانیوں میں سے کوئی نشانی مگر یہ اس سے اعراض کرنے والے بنے ہوئے ہیں۔ سو انھوں نے واضح حق کو بھی جھٹلا دیا جب کہ وہ ان کے پاس آیا تو عنقریب اس چیز کی خبریں ان کے پاس آئیں گی جس کا وہ مذاق اڑاتے رہے ہیں۔ کیا انھوں نے نہیں دیکھا کہ ہم نے ان سے پہلے کتنی قوموں کو ہلاک کر دیا جن کو ہم نے ملک میں وہ قوت و سطوت دے رکھی تھی جو تم کو نہیں دی اور ہم نے ان پر خوب مینہ برسائے اور نہریں جاری کیں جو ان کے نیچے بہتی تھیں، پھر ہم نے ان کو ان کے گناہوں کی پاداش میں ہلاک کر دیا اور ان کے بعد ہم نے دوسری قومیں اٹھا کھڑی کیں۔ ۱-۶

اور اگر ہم تم پر کوئی ایسی کتاب اتارتے جو کاغذ میں لکھی ہوئی ہوتی اور یہ اس کو اپنے

ہاتھوں سے چھو بھی لیتے جب بھی یہ کفر کرنے والے یہی کہتے کہ یہ تو بس ایک کھلا ہوا جادو ہے۔ اور یہ کہتے ہیں کہ اس پر علانیہ کوئی فرشتہ کیوں نہیں اترتا اور اگر ہم کوئی فرشتہ اتارتے تو بس معاملے کا فیصلہ ہی ہو جاتا۔ پھر ان کو ذرا مہلت نہ ملتی۔ اور اگر ہم اس کو کوئی فرشتہ بناتے جب بھی آدمی ہی کی شکل میں بناتے تو جو گھپلا وہ پیدا کر رہے ہیں ہم اسی میں ان کو ڈال دیتے۔ اور تم سے پہلے بھی رسولوں کا مذاق اڑایا گیا تو جن لوگوں نے ان میں سے مذاق اڑایا ان کو اس چیز نے آگھیرا جس کا وہ مذاق اڑاتے تھے۔ کہو، ملک میں چلو پھرو اور دیکھو کہ جھٹلانے والوں کا انجام کیسا ہوا۔ ۷-۱۱

۱۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَجَعَلَ الظُّلُمٰتِ وَالنُّوْرَ ثُمَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ یَعْدِلُوْنَ (۱)

توحید کی دلیل عرب کے مسلمات سے

لفظ حمد کی تحقیق تفسیر سورۂ فاتحہ میں گزر چکی ہے اور یہ بات بھی اس کتاب میں بار بار بیان ہو چکی ہے کہ مشرکینِ عرب آسمان و زمین اور نور و ظلمت سب کا خالق اللہ تعالیٰ ہی کو مانتے تھے۔ یہاں قرآن نے ان کے اسی مسلمہ پر توحید کی دلیل قائم کی ہے کہ جب یہ تسلیم ہے کہ آسمانوں اور زمین اور نور و ظلمت کا خالق اللہ ہی ہے تو پھر یہ کیسی عجیب بات ہے کہ یہ کفار دوسروں کو خدا کا ہم سر اور شریک ٹھہراتے ہیں۔ ثُمَّ اظہارِ تعجب کے لیے بھی آتا ہے۔ یہاں اور آگے والی آیت میں بھی، اظہارِ تعجب ہی کے مفہوم میں ہے۔ شرک پر اظہارِ تعجب کا ایک پہلو تو یہی ہے کہ جب ساری چیزوں کا خالق خدا ہی ہے تو پھر شرک کی گنجائش کہاں سے نکلی؟ دوسرا پہلو یہ ہے کہ اس کائنات کی چیزوں میں بظاہر جو تضاد نظر آتا ہے مثلاً زمین اور آسمان، روشنی اور تاریکی، سردی اور گرمی، تو اس تضاد کے اندر اس کائنات کے مجموعی مقصد کے لیے ایسی حیرت انگیز سازگاری بھی ہے کہ کوئی عاقل تصور بھی نہیں کر سکتا کہ ان میں سے ہر ایک کے خالق و مالک الگ الگ ہیں۔ بلکہ ہر صاحبِ نظر یہ ماننے پر مجبور ہے کہ پوری کائنات ایک ہی کارفرما کے ارادے اور مشیت کے تحت حرکت کر رہی ہے۔

هُوَ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ طِیْنٍ ثُمَّ قَضٰۤى اَجَلًا ؕ وَاَجَلٌ مُّسَمًّى عِنْدَهٗ ثُمَّ اَنْتُمْ تَمْتَرُوْنَ (۲) وَهُوَ اللّٰهُ فِی السَّمٰوٰتِ وَفِی الْاَرْضِ ؕ یَعْلَمُ سِرَّكُمْ وَجَهْرَكُمْ وَیَعْلَمُ مَا تَكْسِبُوْنَ (۳)

'خَلَقَكُمْ مِّنْ طِيْنٍ' سے مقصود انسان کی ابتدائی خلقت کی طرف اشارہ ہے جیسا کہ فرمایا وَبَدَاَ خَلْقَ الْاِنْسَانِ مِنْ طِيْنٍ ۔ ۷-السجدہ (اور انسان کی خلقت کا آغاز مٹی سے کیا) تمام ارضی مخلوقات کی زندگی کا آغاز مٹی ہی سے ہُوا ہے۔ اس مضمون کو قرآن نے بار بار مختلف شکلوں سے بیان کیا ہے اور اس سے عام طور پر دو حقیقتوں کی طرف توجہ دلائی ہے، ایک تو انسان کی بے حقیقتی کی طرف کہ مٹی سے پیدا ہونے والی مخلوق کو اپنی ہستی پر زیادہ مغرور نہیں ہونا چاہیے، دوسرے مرنے کے بعد دوبارہ پیدا کیے جانے پر کہ جب انسان کو خدا نے مٹی سے پیدا کیا اور اس پیدا کرنے میں اس کو کوئی دشواری پیش نہیں آئی تو اب دوبارہ اس کے پیدا کرنے سے وہ کیوں عاجز رہے گا۔ یہاں اسی دوسری حقیقت کو واضح کرنے کے لیے اس کا ذکر ہُوا ہے۔ دوسری جگہ فرمایا ہے وَاِنْ تَعْجَبْ فَعَجَبٌ قَوْلُهُمْ ءَاِذَا كُنَّا تُرٰبًا ءَاِنَّا لَفِيْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ ۔ ۵-الرعد (اور اگر تم تعجب کرنا چاہو تو نہایت ہی عجیب ہے ان کی یہ بات کہ جب ہم مٹی ہو جائیں گے تو کیا دوبارہ نئی خلقت میں آئیں گے!) كَمَا بَدَاْنَآ اَوَّلَ خَلْقٍ نُّعِيْدُهٗ ۭ وَعْدًا عَلَيْنَا ۭ اِنَّا كُنَّا فٰعِلِيْنَ ۔ ۱۰۴-انبیا (جس طرح ہم نے پہلی بار مٹی سے بنایا اسی طرح مٹی ہو جانے کے بعد دوبارہ اس کو پیدا کر دیں گے، یہ ہمارے ذمہ وعدہ ہے، یہ ہم کر کے رہیں گے) وَهُوَ الَّذِيْ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ وَهُوَ اَهْوَنُ عَلَيْهِ ۔ ۲۷-روم (اور وہی ہے جو خلق کا آغاز کرتا ہے پھر وہ اس کا اعادہ کرے گا اور یہ اعادہ اس کے لیے سہل ہے)

اُجل کے مختلف مفہوم

ثُمَّ قَضٰٓى اَجَلًا ۔ 'اجل' کے معنی مدت مقررہ کے ہیں۔ 'اجل' یا 'اَجَلٌ مُّسَمًّى' کا لفظ فرد یا اقوام کے تعلق سے مختلف معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ ایک تو اس مدت حیات کے لیے جو ہر فرد کو تقدیر کی طرف سے ملی ہے، دوسرے اس روز بعث کے لیے استعمال ہوا ہے جو خلق کے اٹھائے جانے کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقرر ہے، تیسرے اس مقررہ پیمانہ کے لیے استعمال ہُوا ہے جو کسی قوم کی ہلاکت کے لیے مقرر ہے۔ پہلے معنی کے لیے نظیر آیت زیر بحث میں بھی ہے اور اسی سورہ کی آیت ۶۰ میں بھی۔ فرمایا ہے وَهُوَ الَّذِيْ يَتَوَفّٰىكُمْ بِالَّيْلِ وَيَعْلَمُ مَا جَرَحْتُمْ بِالنَّهَارِ ثُمَّ يَبْعَثُكُمْ فِيْهِ لِيُقْضٰٓى اَجَلٌ مُّسَمًّى ۚ ثُمَّ اِلَيْهِ مَرْجِعُكُمْ ثُمَّ يُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۔ ۶۰ (اور وہی خدا ہے جو تمھیں وفات دیتا ہے شب میں اور وہ جانتا ہوتا ہے جو کچھ تم نے دن میں کیا ہوتا ہے، پھر وہ تم کو دوسرے دن میں اٹھاتا ہے تاکہ تمھاری مقررہ مدت پوری کی جائے، پھر اسی کی طرف تمھارا لوٹنا ہوگا، پھر وہ تم کو آگاہ کرے گا ان سارے کاموں سے جو تم کرتے رہے ہو) دوسرے معنی کے لیے نظیر آیت زیر بحث میں ہے۔ اس میں 'اجل' کا ذکر دو مرتبہ ہے۔ ایک اجل تو ظاہر ہے کہ وہی ہے جو ہر فرد کی مدتِ حیات کے طور پر مقرر ہے، دوسری 'اجل' جس کے ساتھ 'مُسَمًّى' کی صفت لگی ہوئی ہے قرینہ دلیل ہے کہ اس سے وہ مدت مقررہ مراد ہے جو خلق کے اُٹھائے جانے کے لیے مقرر ہے۔ تیسرے معنی کے لیے نظیر آیت وَلِكُلِّ اُمَّةٍ اَجَلٌ ۚ فَاِذَا جَاۗءَ اَجَلُهُمْ لَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ ۔ ۳۴-اعراف، اور اس مضمون کی دوسری آیات میں ہے۔ اس 'اجل' سے، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، وہ مقررہ پیمانہ مراد ہے جو کسی قوم کے

اخلاقی زوال کی اس آخری حد کی خبر دیتا ہے جب قانونِ الٰہی اس کو تباہ کر دیتا ہے۔ یہ پیمانہ افراد کی مدتِ حیات کی طرح نہیں ہے کہ کوئی نیک ہو یا بد جو مدتِ حیات، اس کے لیے مقرر ہے اس کے ختم ہو جانے پر وہ لازماً مر جاتا ہے بلکہ یہ اخلاقی قوانین کے تابع ہے، جب تک کوئی قوم اپنے ایمان و کردار کو محفوظ رکھے گی خدا اس کو قائم رکھے گا، یہاں تک کہ وہ اجل مسمّی آجائے جو اس پوری کائنات کے لیے خدا کی طرف سے مقرر ہے۔ اس پیمانہ کے اخلاقی ہونے کا ایک نتیجہ یہ بھی ہے کہ یہ عین ممکن ہے کہ ایک قوم کا پیمانہ لبریز ہونے کی آخری حد پر پہنچ رہا ہو اور اس کی اجل مسمّی آئی کھڑی ہو لیکن سوئی کے آخری نقطہ پر پہنچنے سے پہلے ہی وہ قوم توبہ اور اصلاح کے ذریعہ سے اپنے زندہ رہنے کا حق پھر بحال کر لے۔ یہاں ہم اشارے پر کفایت کرتے ہیں ——— انشاء اللہ سورۂ نوح کی تفسیر میں اس نکتہ پر تفصیل کے ساتھ بحث کریں گے۔

'امتراء'، 'مری' سے ہے جس کے معنی مٹھنے، مسلنے، نچوڑنے کے ہیں۔ 'امتری اللبن' کے معنی ہوں گے اس نے تھن سے دودھ نچوڑا۔ یہیں سے یہ لفظ اس بحث و جدال کے لیے استعمال ہوا جس میں کوئی کٹ حجتی کرنے والا مناظر اس بات میں سے بھی شک و اعتراض کا کوئی پہلو نکال ہی لے جس میں اعتراض و بحث کی کوئی گنجائش نہ ہو۔

آیت کا مطلب یہ ہے کہ وہی خدا ہے جس نے تمھیں مٹی سے پیدا کیا اور یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس سے تمھیں بھی انکار نہیں۔ پھر ہر ایک کے لیے اس نے زندگی کی ایک مدت ٹھہرا دی۔ یہ نہیں ہے کہ جو پیدا ہوتا ہو وہ غیر فانی ہو کر پیدا ہوتا ہو، پھر اس میں کیا شک کی گنجائش ہے کہ جس خدا نے تمھیں مٹی سے بنایا وہ تمھیں دوبارہ اسی مٹی سے اٹھا کھڑا کرے گا۔ اس کے لیے اس نے ایک مدت مقرر کر رکھی ہے جس کا علم صرف اسی کو ہے۔ یہ ایک واضح حقیقت ہے جس میں کسی بحث و جدال کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے لیکن تم ہر بات میں کٹ حجتی کی کوئی نہ کوئی راہ نکال لیتے ہو۔

'وَهُوَ اللّٰهُ فِي السَّمٰوٰتِ وَفِي الْاَرْضِ الاية' یعنی زمین و آسمان میں الگ الگ الٰہ نہیں ہیں بلکہ وہی اللہ آسمان و زمین دونوں کا مالک ہے اور دونوں میں اسی کا حکم چل رہا ہے۔ دوسری جگہ فرمایا ہے وَهُوَ الَّذِيْ فِي السَّمَآءِ اِلٰهٌ وَّفِي الْاَرْضِ اِلٰهٌ وَهُوَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ۸۴۔ زخرف (وہی ہے جو آسمان کا بھی معبود ہے اور وہی زمین کا بھی معبود ہے اور وہ علیم و حکیم ہے) آسمان و زمین دونوں کا قیام و بقا ہی اس بات کی شہادت دے رہا ہے کہ ان دونوں کے اندر ایک ہی خدا کا ارادہ کار فرما ہے۔ اگر ان کے اندر الگ الگ ارادے کار فرما ہوتے تو جیسا کہ قرآن میں ارشاد ہوا ہے 'دونوں درہم برہم ہو جاتے'۔ یہ مشرکین کے اس خیال کی تردید ہے کہ آسمان و زمین کا خالق تو خدا ہی ہے لیکن چونکہ زمین اس کی مملکت کا دور دراز حصہ ہے اس وجہ سے اس نے اس کا انتظام و انصرام اپنے دوسرے کارندوں کے سپرد کر رکھا ہے۔ فرمایا کہ یہ بات نہیں ہے۔ آسمان و زمین سب براہِ راست اسی کے کنٹرول میں ہیں اور اس کا علم تمھارے ظاہر و باطن اور تمھارے قول و فعل ہر چیز پر محیط ہے اس وجہ سے اس کو اپنی اس

مملکت میں کسی مددگار کی احتیاج بھی نہیں ہے۔

توحید اور معاد کا باہمی تعلق

توحید کا یہ مضمون اوپر قیامت والے مضمون کی تاکید ہے۔ یہ حقیقت قرآن میں بار بار واضح کی گئی ہے کہ قیامت کا ماننا اس لیے ضروری ہے کہ قیامت کو مانے بغیر یہ سارا کارخانہ ایک کھلنڈرے کا کھیل بن کے رہ جاتا ہے اور یہی بات اس صورت میں بھی لازم آتی ہے جب قیامت کے ساتھ شرک اور شفاعت باطل کی گنجائش تسلیم کر لی جائے۔ اس لیے کہ جب شرکا اپنے پرستاروں کو بہرصورت بخشوا لیں گے، جیسا کہ مشرکین کا دعویٰ ہے، خواہ ان کے اعمال کچھ ہی ہوں تو پھر قیامت کا آنا نہ آنا دونوں یکساں ہی رہا۔

تکذیب حق کا انجام اور تاریخ کی شہادت

وَمَا تَأْتِيهِمْ مِنْ آيَةٍ مِنْ آيَاتِ رَبِّهِمْ إِلَّا كَانُوا عَنْهَا مُعْرِضِينَ ۝ فَقَدْ كَذَّبُوا بِالْحَقِّ لَمَّا جَاءَهُمْ فَسَوْفَ يَأْتِيهِمْ أَنْبَاءُ مَا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِئُونَ (۴-۵) یعنی توحید اور قیامت کی ان باتوں کی تکذیب کی کوئی گنجائش تو نہیں ہے لیکن یہ لوگ اللہ کی آیات سے اعراض کر رہے ہیں اور اس طرح انھوں نے اس حق کو جھٹلایا ہے جو اللہ کی طرف سے ان کے پاس آیا ہے، تو عنقریب اس چیز کی خبریں ان کے پاس آئیں گی جس کا وہ مذاق اڑا رہے ہیں۔ یہاں 'حق' سے مراد قرآن مجید ہے۔ قرآن پیغمبر کی تکذیب کی صورت میں جس عذاب سے ڈرا رہا تھا لوگ اس کا مذاق اڑا رہے تھے۔ فرمایا کہ جس عذاب کا مذاق اڑا رہے ہیں اس کے آثار کے ظہور میں زیادہ دیر نہیں ہے۔

أَلَمْ يَرَوْا كَمْ أَهْلَكْنَا مِنْ قَبْلِهِمْ مِنْ قَرْنٍ مَكَّنَّاهُمْ فِي الْأَرْضِ مَا لَمْ نُمَكِّنْ لَكُمْ وَأَرْسَلْنَا السَّمَاءَ عَلَيْهِمْ مِدْرَارًا وَجَعَلْنَا الْأَنْهَارَ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهِمْ فَأَهْلَكْنَاهُمْ بِذُنُوبِهِمْ وَأَنْشَأْنَا مِنْ بَعْدِهِمْ قَرْنًا آخَرِينَ (۶)

یہ تاریخ کی شہادت پیش کی گئی ہے اوپر والے دعوے پر۔ مطلب یہ ہے کہ قریش کو یہ غرہ نہیں ہونا چاہیے کہ ان کو بڑی قوت و شوکت حاصل ہے، ان کو ہلایا نہیں جا سکتا۔ ان سے پہلے کتنی قومیں گزری ہیں جن کو ان سے زیادہ اقتدار حاصل ہوا، ان کو رزق و فضل میں سے بھی ان سے کہیں زیادہ حصہ ملا لیکن جب انھوں نے رسولوں کی تکذیب کی تو خدا نے ان کو ہلاک کر دیا اور ان کے بعد ان کی جگہ دوسری قومیں اٹھا کھڑی کیں۔ یہاں تاریخ کا یہ حوالہ اجمال کے ساتھ آیا ہے، اس کی پوری تفصیل اعراف میں آئے گی جو اس سورہ کے مثنیٰ کی حیثیت رکھتی ہے۔

ہم دوسرے مقام میں واضح کر چکے ہیں کہ 'سما' کا لفظ بادلوں کے لیے بھی آتا ہے۔ 'مدرارا' کے اندر مبالغہ کا مفہوم پایا جاتا ہے اور بارش کی کثرت رزق و فضل کی کثرت کی تعبیر ہے۔ ملاحظہ ہو سورۂ ہود آیت ۵۲ اور سورہ نوح آیت ۱۱۔

وَلَوْ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ كِتَابًا فِي قِرْطَاسٍ فَلَمَسُوهُ بِأَيْدِيهِمْ لَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا إِنْ هَذَا إِلَّا سِحْرٌ مُبِينٌ ۝ وَقَالُوا لَوْلَا أُنْزِلَ عَلَيْهِ مَلَكٌ وَلَوْ أَنْزَلْنَا مَلَكًا لَقُضِيَ الْأَمْرُ ثُمَّ لَا يُنْظَرُونَ ۝ وَلَوْ جَعَلْنَاهُ مَلَكًا

لَجَعَلْنٰهُ رَجُلًا وَّلَلَبَسْنَا عَلَيْهِمْ مَّا يَلْبِسُوْنَ (۷-۹)

خوئے بدرا بہانہ بسیار

اوپر آیت ۴ میں قرآن سے ان کے اعراض کا جو ذکر فرمایا تو یہ ان کے ان مطالبات و اعتراضات کا جواب بھی دے دیا جو وہ اس اعراض کے لیے بطور بہانہ کے پیش کرتے تھے۔ مقصود اس سے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دینا ہے کہ یہ نہ خیال کرو کہ ان کے اعراض کے لیے فی الواقع کوئی عذر ہے، جو دور ہو جائے تو یہ قرآن کو مان لیں گے۔ نہیں، بات وہیں رہے گی جہاں اب ہے۔ یہ کوئی نہ کوئی نیا بہانہ تراش لیں گے اس لیے کہ نہ ماننے کی وجہ یہ نہیں ہے کہ انھیں معجزے نہیں دکھائے گئے بلکہ اس کا اصل سبب یہ ہے کہ اپنی خواہشوں کے خلاف کوئی بات ماننے کے لیے یہ تیار نہیں ہیں۔

وَلَوْ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ كِتٰبًا فِيْ قِرْطَاسٍ الایۃ۔ یہ اس مطالبے کا جواب ہے جو اہل کتاب کی زبانی سورۂ نساء آیت ۱۵۴ میں نقل ہوا ہے۔ وہاں اس کا وہ جواب دیا ہے جو اہل کتاب کے لیے موزوں تھا۔ یہاں فرمایا کہ ان کے مطالبہ کے مطابق اگر فی الواقع ان پر لکھی لکھائی مابین الدفتین کتاب بھی اتار دی جاتی جب بھی یہ ایمان نہ لاتے بلکہ کہتے کہ یہ تو کھلا ہوا جادو ہے۔

معتبر ایمان کی شرط

وَقَالُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ مَلَكٌ الآیۃ یہ ان کا ایک دوسرا مطالبہ اور اس کا جواب ہے۔ یہ مطالبہ بھی قرآن میں دوسری جگہ نقل ہوا ہے۔ یہ مطالبہ یہ تھا کہ اگر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پر فرشتہ آتا ہے، جیسا کہ ان کا دعویٰ ہے تو وہ فرشتہ یوں کیوں آتا ہے کہ صرف انھی کو نظر آتا ہے، کھلم کھلا ان کی نبوت کی منادی کرتا ہوا کیوں نظر نہیں آتا کہ سب دیکھیں اور سب سنیں۔ اس کا جواب یہ دیا کہ جب بات یہاں تک پہنچ جائے گی کہ فرشتے علانیہ اترنے لگیں تو پھر اللہ کا عذاب آدھمکے گا۔ پھر ان کو مہلت نہیں دی جائے گی۔ یہ اس سنت اللہ کی طرف اشارہ ہے جو قرآن میں جگہ جگہ بیان ہوئی ہے کہ ایمان وہ معتبر ہے جو غیب میں رہتے، آفاق و انفس اور عقل و فطرت کے ان دلائل کی بنیاد پر لایا جائے، جن کی انبیاء دعوت دیتے ہیں نہ کہ وہ جو کشف حجاب اور حقائق کا بچشم سر مشاہدہ کر لینے کے بعد لایا جائے۔

فرشتوں کو رسول بنا کر نہ بھیجنے کی مصالحت

وَلَوْ جَعَلْنٰهُ مَلَكًا لَّجَعَلْنٰهُ رَجُلًا الآیۃ یہ ایک تیسرے مطالبے کا جواب ہے اور یہ بھی قرآن میں دوسری جگہ نقل ہوا ہے۔ مثلاً وَمَا مَنَعَ النَّاسَ اَنْ يُّؤْمِنُوْٓا اِذْ جَآءَهُمُ الْهُدٰٓى اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اَبَعَثَ اللّٰهُ بَشَرًا رَّسُوْلًا ۹۴-۱۷ (اور ہدایت الٰہی کے آجانے کے بعد لوگوں کو ایمان سے نہیں روکا مگر اس چیز نے کہ انھوں نے اعتراض کیا کہ کیا اللہ نے ایک بشر کو رسول بنا کر بھیجا) فَقَالُوْٓا اَبَشَرٌ يَّهْدُوْنَنَا فَكَفَرُوْا وَتَوَلَّوْا وَّاسْتَغْنَى اللّٰهُ ۶-تغابن (پس وہ بولے کہ کیا انسان ہمیں ہدایت دیں گے، پس انھوں نے انکار کر دیا اور پیٹھ پھیر لی اور اللہ بھی ان سے بے نیاز ہو گیا) اس کا جواب یہ دیا کہ اگر رسول بالفرض فرشتہ ہی بھیجا جاتا جب بھی لازماً وہ آدمی ہی کی شکل و صورت میں ہوتا تو پھر وہی گھپلا پیش آجاتا جو اب پیش آیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کسی فرشتے کو رسول بنا کر نہ بھیجنا اس بنا پر نہیں ہے کہ خدا کے لیے یہ ناممکن تھا بلکہ اس بنا پر ہے کہ انسان فرشتوں کو فرشتوں کی شکل میں نہیں بلکہ

انسانوں ہی کی شکل میں دیکھ سکتے اور اسی صورت میں ان سے فائدہ اُٹھا سکتے ہیں تو جب، وہ انسان ہی کے روپ میں آتا تو یہ پھر وہی اعتراض اٹھاتے جواب اُٹھا رہے ہیں۔ مَا یَلْبِسُوْنَ سے یہاں یہ اشارہ نکلتا ہے کہ یہ بات نہیں ہے کہ فی الواقع یہ شبہ پیدا ہوتا ہے بلکہ یہ لوگ یہ شبہ پیدا کر رہے ہیں تاکہ اس طرح اپنے سادہ لوح پیرووں کو گھپلے میں ڈالیں۔ لَبَسْنَا میں فعل کو اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف جو منسوب فرمایا ہے تو یہ نسبت اسی طرح کی ہے جس طرح کی نسبت فَلَمَّا زَاغُوْٓا اَزَاغَ اللّٰهُ میں ہے۔

وَلَقَدِ اسْتُهْزِئَ بِرُسُلٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَحَاقَ بِالَّذِيْنَ سَخِرُوْا مِنْهُمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ۝ قُلْ سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ ثُمَّ انْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ (۱۰-۱۱)

حَاقَ يَحِيْقُ حِيْقًا بِهٖ کے معنی ہیں احاطہ کر لینا، گھیر لینا اور چھا جانا۔

اوپر آیت ۵ میں قریش کو یہ دھمکی جو دی ہے کہ وہ ایک امر حق کا مذاق اڑا رہے ہیں جو شدنی اور اٹل ہے، وہ عنقریب اس عذاب کے آثار دیکھ لیں گے جس کی ہنسی اڑا رہے ہیں۔ اب یہ اس امر واقعی کی ان شہادتوں اور مثالوں کی طرف اشارہ فرمایا جو خود ان کی تاریخ اور ان کے ملک کے آثار میں موجود ہیں کہ تم سے پہلے جو رسول آئے انھوں نے بھی اپنی اپنی قوموں کو عذاب الٰہی سے ڈرایا تو ان کا بھی اسی طرح مذاق اڑایا گیا بالآخر اس عذاب نے ان کو اپنے گھیرے میں لے لیا اور وہ تباہ ہو گئیں۔

قُلْ سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ الاية یہ اشارہ ہے خود ملک عرب کی طرف کہ اگر اس نگاہ سے اپنے ملک کے حالات و آثار کا مشاہدہ کرو تو تمھیں اس میں رسولوں کی تکذیب کرنے والی قوموں کی تباہی کے بہت سے آثار ملیں گے۔ یہاں صرف اجمالی اشارہ فرمایا ہے۔ بعد والی سورہ میں اس اجمال کی تفصیل آئے گی۔ وہاں قوم نوح، عاد، ثمود، مدین، قوم لوط وغیرہ کی سرگزشتیں سنائی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ان قوموں نے بھی اپنے اپنے رسولوں کے انذار کا مذاق اڑایا اور اس عذاب کو انھوں نے محض خالی خولی دھمکی سمجھا جس کی رسول نے خبر دی۔ بالآخر وہ واقعہ کی شکل میں نمودار ہو گیا اور مذاق اڑانے والوں کا بیڑا غرق ہو گیا۔

۲۔ آگے کا مضمون ـــــ آیات ۱۲-۳۲

آگے توحید، معاد اور رسالت کے وہی مطالب جو اوپر گزرے اپنے بعض نئے پہلوؤں اور نئے اسلوب سے آ رہے ہیں۔ ارشاد ہے۔

آیات ۱۲-۳۲ قُلْ لِّمَنْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ قُلْ لِّلّٰهِ ۭ كَتَبَ عَلٰي نَفْسِهِ
الرَّحْمَةَ ۭ لَيَجْمَعَنَّكُمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَا رَيْبَ فِيْهِ ۭ اَلَّذِيْنَ
خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ⑫ وَلَهٗ مَا سَكَنَ فِي الَّيْلِ

وَالنَّهَارِ ؕ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿١٣﴾ قُلْ اَغَيْرَ اللّٰهِ اَتَّخِذُ وَلِيًّا
فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَهُوَ يُطْعِمُ وَلَا يُطْعَمُ ؕ قُلْ اِنِّيْٓ
اُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ اَوَّلَ مَنْ اَسْلَمَ وَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿١٤﴾ قُلْ
اِنِّيْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَبِّيْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ﴿١٥﴾ مَنْ يُّصْرَفْ
عَنْهُ يَوْمَئِذٍ فَقَدْ رَحِمَهٗ ؕ وَذٰلِكَ الْفَوْزُ الْمُبِيْنُ ﴿١٦﴾ وَاِنْ يَّمْسَسْكَ
اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهٗٓ اِلَّا هُوَ ؕ وَاِنْ يَّمْسَسْكَ بِخَيْرٍ فَهُوَ عَلٰى
كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿١٧﴾ وَهُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهٖ ؕ وَهُوَ الْحَكِيْمُ
الْخَبِيْرُ ﴿١٨﴾ قُلْ اَيُّ شَيْءٍ اَكْبَرُ شَهَادَةً ؕ قُلِ اللّٰهُ ۟ شَهِيْدٌۢ
بَيْنِيْ وَبَيْنَكُمْ ۟ وَاُوْحِيَ اِلَيَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَمَنْۢ
بَلَغَ ؕ اَئِنَّكُمْ لَتَشْهَدُوْنَ اَنَّ مَعَ اللّٰهِ اٰلِهَةً اُخْرٰى ؕ قُلْ لَّآ اَشْهَدُ ۚ
قُلْ اِنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ وَّاِنَّنِيْ بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ ﴿١٩﴾ وقف لازم
اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ ۘ باختلاف وقف لازم
اَلَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿٢٠﴾ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ ع ٢ ٨
افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِهٖ ؕ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿٢١﴾
وَيَوْمَ نَحْشُرُهُمْ جَمِيْعًا ثُمَّ نَقُوْلُ لِلَّذِيْنَ اَشْرَكُوْٓا اَيْنَ شُرَكَآؤُكُمُ
الَّذِيْنَ كُنْتُمْ تَزْعُمُوْنَ ﴿٢٢﴾ ثُمَّ لَمْ تَكُنْ فِتْنَتُهُمْ اِلَّآ اَنْ قَالُوْا وَ
اللّٰهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِيْنَ ﴿٢٣﴾ اُنْظُرْ كَيْفَ كَذَبُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَ
ضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ﴿٢٤﴾ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّسْتَمِعُ اِلَيْكَ ۚ

وَجَعَلْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ يَّفْقَهُوْهُ وَفِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرًا ؕ وَ
اِنْ يَّرَوْا كُلَّ اٰيَةٍ لَّا يُؤْمِنُوْا بِهَا ؕ حَتّٰٓى اِذَا جَآءُوْكَ يُجَادِلُوْنَكَ
يَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿٢٥﴾ وَهُمْ
يَنْهَوْنَ عَنْهُ وَيَنْـَٔوْنَ عَنْهُ ۚ وَاِنْ يُّهْلِكُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا
يَشْعُرُوْنَ ﴿٢٦﴾ وَلَوْ تَرٰٓى اِذْ وُقِفُوْا عَلَى النَّارِ فَقَالُوْا يٰلَيْتَنَا
نُرَدُّ وَلَا نُكَذِّبَ بِاٰيٰتِ رَبِّنَا وَنَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿٢٧﴾ بَلْ
بَدَا لَهُمْ مَّا كَانُوْا يُخْفُوْنَ مِنْ قَبْلُ ؕ وَلَوْ رُدُّوْا لَعَادُوْا لِمَا
نُهُوْا عَنْهُ وَاِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ﴿٢٨﴾ وَقَالُوْٓا اِنْ هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا
وَمَا نَحْنُ بِمَبْعُوْثِيْنَ ﴿٢٩﴾ وَلَوْ تَرٰٓى اِذْ وُقِفُوْا عَلٰى رَبِّهِمْ ؕ قَالَ
اَلَيْسَ هٰذَا بِالْحَقِّ ؕ قَالُوْا بَلٰى وَرَبِّنَا ؕ قَالَ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ
بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ ﴿٣٠﴾ ع قَدْ خَسِرَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِلِقَآءِ اللّٰهِ ؕ ٣ ع ١٠ ٩
حَتّٰٓى اِذَا جَآءَتْهُمُ السَّاعَةُ بَغْتَةً قَالُوْا يٰحَسْرَتَنَا عَلٰى مَا فَرَّطْنَا
فِيْهَا ۙ وَهُمْ يَحْمِلُوْنَ اَوْزَارَهُمْ عَلٰى ظُهُوْرِهِمْ ؕ اَلَا سَآءَ مَا
يَزِرُوْنَ ﴿٣١﴾ وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ ؕ وَلَلدَّارُ
الْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿٣٢﴾

ترجمۂ آیات ۱۲-۳۲

ان سے پوچھو، آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے وہ کس کا ہے؟ کہہ دو اللہ ہی کا ہے۔ اس نے اپنے اوپر رحمت واجب کر رکھی ہے۔ وہ تم کو جمع کر کے ضرور لے جائے گا قیامت کے دن کی طرف جس میں ذرا شبہ نہیں۔ جنھوں نے اپنے آپ کو گھاٹے میں ڈالا

وہی ہیں جو اس پر ایمان نہیں لاتے اور اسی کے قبضۂ قدرت میں ہے جو چیز شب میں ساکن ہوتی ہے اور جو دن میں متحرک ہوتی ہے اور وہ سمیع و علیم ہے۔ ۱۲-۱۳

کہو کیا میں اللہ کے سوا، جو آسمانوں اور زمین کا خالق ہے، کسی اور کو اپنا کارساز بناؤں اور وہ کھلاتا ہے کھاتا نہیں، کہہ دو مجھے تو حکم ملا ہے کہ میں سب سے پہلے اسلام لانے والا بنوں اور تم ہرگز مشرکوں میں سے نہ بنو۔ کہہ دو کہ اگر میں نے اپنے رب کے حکم کی نافرمانی کی تو میں ایک ہولناک دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں۔ جو شخص اس دن اس سے دور رکھا گیا درحقیقت وہی ہے جس پر خدا نے رحم فرمایا اور یہی کھلی کامیابی ہے۔ ۱۴-۱۶

اور اگر اللہ تجھ کو کسی دکھ میں مبتلا کرے تو اس کے سوا کوئی نہیں جو اس کا دور کرنے والا بن سکے اور اگر کسی خیر سے بہرہ مند کرے تو وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ اور وہ اپنے بندوں پر پوری طرح حاوی ہے اور وہ حکیم و خبیر ہے۔ پوچھو شہادت کے لیے سب سے بڑا کون ہے؟ کہو، اللہ، وہ میرے اور تمھارے درمیان گواہ ہے اور میری طرف یہ قرآن وحی کیا گیا ہے کہ میں بھی اس کے ذریعہ سے تم کو ڈراؤں اور وہ بھی جن کو یہ پہنچے۔ کیا تم اس بات کے گواہ بنتے ہو کہ خدا کے ساتھ کچھ اور معبود بھی ہیں؟ کہہ دو، میں اس کی گواہی نہیں دیتا۔ کہہ دو وہ تو بس ایک ہی معبود ہے اور میں ان سے بری ہوں جن کو تم شریک ٹھہراتے ہو۔ ۱۷-۱۹

جن کو ہم نے کتاب عطا کی وہ اس کو پہچانتے ہیں جیسا اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں۔ جنھوں نے اپنے آپ کو گھاٹے میں ڈالا وہی ہیں جو اس پر ایمان نہیں لاتے اور اس سے بڑھ کر ظالم کون ہے جس نے اللہ پر جھوٹ باندھا یا اس کی آیات کی تکذیب کی۔ بیشک یہ ظالم فلاح پانے والے نہیں۔ یاد کرو اس دن کو جس دن ہم ان سب کو اکٹھا کریں گے پھر

پوچھیں گے ان شریک ٹھہرانے والوں سے کہ تمھارے وہ شریک کہاں ہیں جن کو تم ہمارا شریک گمان کرتے تھے ؟ پھر ان کے فریب کا پردہ چاک ہو جائے گا مگر یہ کہ وہ کہیں گے کہ اللہ اپنے رب کی قسم! ہم مشرک نہیں تھے ۔ دیکھو، یہ کس طرح اپنے آپ پر جھوٹ بولے اور ان کا سارا افترا ہوا ہو گیا۔ ۲۰ - ۲۴

اور ان میں ایسے بھی ہیں جو تمھاری بات پر کان لگاتے ہیں لیکن ہم نے ان کے دلوں پر پردے ڈال دیے ہیں کہ ان کو نہ سمجھیں اور ان کے کانوں میں بہرا پن پیدا کر دیا ہے کہ اس کو نہ سن سکیں اور اگر وہ ہر قسم کی نشانیاں دیکھ لیں گے تو بھی ان پر ایمان نہیں لائیں گے، یہاں تک کہ جب یہ تمھارے پاس حجت کرتے آئیں گے تو یہ کافر کہیں گے کہ یہ تو بس اگلوں کا فسانہ ہے اور یہ اس سے دوسروں کو بھی روکتے ہیں اور خود بھی گریز کرتے ہیں اور یہ درحقیقت اپنے ہی کو تباہ کر رہے ہیں لیکن احساس نہیں کر رہے ہیں ۔ اور اگر تم اس وقت کو دیکھ پاتے جب یہ دوزخ کے کنارے پر کھڑے کیے جائیں گے، پس کہیں گے کہ کاش ہم پھر واپس کیے جائیں کہ مانیں اور اپنے رب کی آیات کی تکذیب نہ کریں اور ایمان والوں میں سے بنیں ۔ بلکہ یہ تو ان پر وہی حقیقت ظاہر ہوئی ہے جو اس سے پہلے اپنے دل میں چھپاتے تھے اور اگر یہ لوٹائے جائیں تو وہی کریں گے جس سے روکے گئے یہ بالکل جھوٹے ہیں۔ ۲۵ - ۲۸

کہتے ہیں کہ زندگی تو بس یہی دُنیا کی زندگی ہے، اور مرنے کے بعد ہم اُٹھائے نہیں جانے کے ۔ اور اگر تم دیکھ پاتے اس وقت کو جب یہ اپنے رب کے حضور کھڑے کیے جائیں گے، وہ ان سے پوچھے گا، کیا یہ امر واقعہ نہیں ہے ؟ وہ جواب دیں گے، ہاں، ہمارے رب کی قسم، یہ امر واقعہ ہے! فرمائے گا پس چکھو عذاب اپنے کفر کی پاداش میں ۔ گھاٹے میں رہے وہ لوگ

جنھوں نے اللہ سے ملاقات کو جھٹلایا۔ یہاں تک کہ جب وہ گھڑی اچانک آ پہنچے گی وہ کہیں گے کہ ہائے افسوس ہماری اس کوتاہی پر جو اس باب میں ہم سے ہوئی! اور وہ اپنے بوجھ اپنی پیٹھوں پر اٹھائے ہوئے ہوں گے۔ جان رکھو کہ نہایت ہی برا ہوگا وہ بوجھ جو یہ اٹھائیں گے اور یہ دنیا کی زندگی تو بس کھیل تماشا ہے۔ البتہ دارِ آخرت ان لوگوں کے لیے بہتر ہے جو تقویٰ رکھتے ہیں۔ تو کیا تم سمجھتے نہیں! ۲۹-۳۲

۳- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

قُلْ لِّمَنْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ قُلْ لِّلّٰهِ ؕ كَتَبَ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ ؕ لَيَجْمَعَنَّكُمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَا رَيْبَ فِيْهِ ؕ اَلَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝ وَلَهٗ مَا سَكَنَ فِي الَّيْلِ وَالنَّهَارِ ؕ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ (۱۲-۱۳)

سوال و جواب کا ایک خاص اسلوب

قُلْ لِّمَنْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ، قُلْ لِّلّٰهِ، قرآن میں جہاں جہاں سوال کر کے مخاطب کے جواب کا انتظار کیے بغیر خود اس کا جواب دیا ہے، غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان مواقع میں اصل جواب سے مخاطب کے لیے انکار کی گنجائش نہیں ہے، اگر اس کا کوئی عقیدہ یا عمل اس کے خلاف ہے تو وہ خود اس کے اپنے مسلّمہ کے خلاف ہے۔ جواب میں سبقت سے اس امر کا بھی اظہار ہو جاتا ہے کہ بہرحال اصل حقیقت کا اظہار کر دیا جائے قطع نظر اس سے کہ مخاطب اس کے جواب میں کیا ہٹ دھرمی اختیار کرتا ہے۔ یہاں یہ بات ذہن میں رہے کہ اہلِ عرب مشرک ہونے کے باوجود آسمان و زمین کا خالق و مالک خدا ہی کو مانتے تھے۔ اس کی وضاحت دلائل کے ساتھ ہم دوسرے مقام میں کر چکے ہیں۔

قیامت خدا کی صفتِ رحمت کا لازمی تقاضا ہے

كَتَبَ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ، یہ اللہ تعالیٰ کے صفت رحمت سے کمال درجہ متصف ہونے کی تعبیر بھی ہے اور اس امر کا اظہار بھی کہ ہر وہ بات جو اس صفت کا مقتضیٰ ہے اس کا ظہور میں آنا قطعی اور اٹل ہے، کوئی چیز اس کی راہ میں مزاحم نہیں ہو سکے گی۔

لَيَجْمَعَنَّكُمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَا رَيْبَ فِيْهِ، میں عربیت کا جو اسلوب ہے اس پر سورۂ نساء کی آیت ۸۷ کے تحت بحث گزر چکی ہے۔ یہاں جو بات نگاہ میں رکھنے کی ہے وہ یہ ہے کہ قیامت کا آنا خدا کی صفت رحمت کا لازمی تقاضا ہے۔ اگر قیامت نہ آئے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس کائنات کا خالق رحمان و رحیم نہیں ہے۔ اس کے نزدیک نعوذ باللہ عدل و ظلم، نیکی اور بدی، خیر اور شر دونوں یکساں ہیں، یہ ایک کھلنڈرے کا کھیل اور ایک اندھیر نگری ہے۔ یہ باتیں چونکہ بالبداہت باطل ہیں، رحمان و رحیم خدا کی شان کے بالکل منافی ہے کہ وہ کوئی بے غایت و بے مقصد کام کرے، اس وجہ سے لازمی ہے کہ ایک ایسا دن وہ لائے جس میں اس کی رحمتِ کامل کا ظہور ہو، اپنے نیک بندوں کو وہ اپنی بے پایاں رحمتوں سے نوازے اور جو بدکار و نابکار ہیں وہ اپنے کیفر کردار کو پہنچیں۔

اس سے یہ بات آپ سے آپ نکلی کہ قیامت کا اصل مقصود مجرموں کو سزا دینا نہیں بلکہ نیکوکاروں کو جزا دینا ہے۔ مجرموں کی سزا درحقیقت نیکوکاروں کی جزا کا ایک لازمی نتیجہ ہے۔ آگے آیت ۵۳ کے تحت اس کی مزید وضاحت آئے گی۔

اصل خسران

'اَلَّذِیْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فَهُمْ لَا یُؤْمِنُوْنَ' کے مضمون کی وضاحت آگے آیت ۳۱ میں فرمادی ہے۔ 'قَدْ خَسِرَ الَّذِیْنَ كَذَّبُوْا بِلِقَآءِ اللّٰهِ حَتّٰٓى اِذَا جَآءَتْهُمُ السَّاعَةُ بَغْتَةً قَالُوْا یٰحَسْرَتَنَا عَلٰى مَا فَرَّطْنَا فِیْهَا وَهُمْ یَحْمِلُوْنَ اَوْزَارَهُمْ عَلٰى ظُهُوْرِهِمْ اَلَا سَآءَ مَا یَزِرُوْنَ (گھاٹے میں پڑے وہ لوگ جنھوں نے اللہ کی ملاقات کو جھٹلایا۔ یہاں تک کہ جب وہ گھڑی اچانک آدھمکے گی تو کہیں گے ہائے افسوس ہماری اس کوتاہی پر جو ہم سے اس بارے میں ہوئی اور وہ اس دن اپنے بوجھ اپنی پیٹھوں پر اٹھائے ہوئے ہوں گے اور آگاہ، نہایت برا بوجھ ہوگا جو وہ اٹھائے ہوئے ہوں گے)

حذف کا ایک اسلوب

'وَلَهٗ مَا سَكَنَ فِی الَّیْلِ وَالنَّهَارِ' یہاں لیل و نہار دونوں کے ذکر کا تقاضا یہ ہے کہ 'سکن' کے بالمقابل کوئی ایسا فعل محذوف مانا جائے جو لفظ 'نہار' کے ساتھ مناسبت رکھنے والا ہو۔ چنانچہ ہم نے 'تحرک' محذوف مانا ہے اور ترجمہ میں اس کو کھول دیا ہے۔ اس اسلوب کی وضاحت دوسرے مقامات میں ہو چکی ہے اور آگے اسی سورہ میں اس کی نہایت عمدہ مثالیں آرہی ہیں۔

آیات کا مطلب یہ ہوا کہ اگر یہ اپنی موجودہ دنیوی کامیابیوں کے غرے میں آخرت اور جزا و سزا کو جھٹلا رہے اور تمھارا اور قرآن کا مذاق اڑا رہے ہیں تو ان سے پوچھو کہ یہ آسمان و زمین کس کے ہیں؟ ظاہر ہے کہ خدا ہی کے ہیں اور یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس سے انھیں بھی مجال انکار نہیں۔ پھر انھیں بتاؤ کہ خدا نے اپنے اوپر رحمت لازم کر لی ہے جس کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ تمھیں پیدا کر کے اور پرورش کے تمام اسباب فراہم کر کے یونہی شتر بے مہار بنا کے نہ چھوڑ دے بلکہ ضروری ہے کہ وہ تم سب کو کشاں کشاں روز قیامت کی طرف لے جائے جس کے آنے میں کوئی شبہ نہیں ہے تو آج جو لوگ اکڑتے اور اس کا مذاق اڑاتے اور اپنی دنیوی خود فراموشیوں میں مگن ہیں اس دن اپنی بدبختی پر اپنے سر پیٹیں گے کہ ہائے ہم نے چند روزہ عیش دنیا کی خاطر اس زندگی کو فراموش رکھا اور اپنے لیے ابدی نامرادی کا سامان کیا۔ پھر فرمایا کہ یہ لوگ یاد رکھیں کہ شب کی تاریکیوں میں جو چیز ساکن ہوتی ہے اور دن کی روشنی میں جو چیز بھی متحرک ہوتی ہے سب خدا ہی کے اختیار، اسی کے قبضۂ قدرت اور اسی کے کنٹرول میں ہے۔ مجال نہیں ہے کہ کوئی چیز اس کی نگاہوں سے اوجھل ہو سکے اور اس کے اذن کے بغیر اپنی جگہ سے سرک سکے۔ رات کی تاریکی اور دن کی روشنی دونوں اس کے لیے یکساں ہے اور وہ ہر جگہ سے سب کو اکٹھا کرے گا اور جس طرح اس کی قدرت سب کو محیط ہے اسی طرح اس کا علم بھی ہر چیز پر حاوی ہے اس لیے کہ وہ سمیع و علیم ہے۔ آگے یہی مضمون بڑی تفصیل کے ساتھ آیات ۵۹-۶۲ میں آرہا ہے۔

'قُلْ اَغَیْرَ اللّٰهِ اَتَّخِذُ وَلِیًّا فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَهُوَ یُطْعِمُ وَلَا یُطْعَمُ قُلْ اِنِّیْٓ اُمِرْتُ

اَنْ اَكُوْنَ اَوَّلَ مَنْ اَسْلَمَ وَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝ قُلْ اِنِّيْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَبِّيْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ۝ مَنْ يُّصْرَفْ عَنْهُ يَوْمَىِٕذٍ فَقَدْ رَحِمَهٗ ۭ وَذٰلِكَ الْفَوْزُ الْمُبِيْنُ (۱۴-۱۶)

قُلْ اَغَيْرَ اللّٰهِ اَتَّخِذُ وَلِيًّا فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ، یہ اس مسلمہ حقیقت کا، جو اوپر مذکور ہوئی، دوسرا لازمی نتیجہ بیان کیا جا رہا ہے کہ جب سب کچھ خدا ہی کا ہے، آسمان و زمین سب کا خالق وہی ہے تو تم خواہ کتنا ہی زور لگاؤ، لیکن میرے لیے یہ کس طرح روا ہے کہ خدائے فاطر السموات والارض کے سوا کسی اور کو اپنا مولیٰ و مرجع بناؤں۔

بتوں پر ایک لطیف تعریض

وَهُوَ يُطْعِمُ وَلَا يُطْعَمُ، یہ خدا کی ربوبیت اور پروردگاری کی طرف اشارہ بھی ہے اور مشرکین کے بتوں پر ایک نہایت لطیف تعریض بھی۔ مطلب یہ ہے کہ مولیٰ و مرجع بنائے جانے کا سزاوار تو وہ ہے جو آسمان و زمین کا عدم سے وجود میں لانے والا بھی ہے اور جس کے فضل و کرم سے سب کو روزی بھی مل رہی ہے نہ کہ تمھارے وہ اصنام خیالی جن کے متعلق تمھیں خود یہ تسلیم ہے کہ وہ خالق و موجد کسی چیز کے بھی نہیں، رہی ان کی پروردگاری تو اس کا بھانڈا پھوڑ دینے کے لیے یہی بات کافی ہے کہ ان کے آگے حلوے مانڈے تم پیش کرتے ہو تب وہ راضی و آسودہ ہوتے ہیں۔ یہاں یہ امر پیش نظر رہے کہ مشرکین اپنے بتوں کے آگے جو کچھ پیش کرتے ہیں اس تصور کے ساتھ پیش کرتے ہیں کہ یہ ان کی پسندیدہ اور مرغوب غذائیں ہیں جن کو وہ نوش کرتے اور جن کی خوشبو سے محظوظ ہوتے ہیں۔ برعکس اس کے ایک خدا پرست خدا کے نام پر جو کچھ پیش کرتا ہے اس کا کوئی حصہ، جیسا کہ قرآن میں تصریح ہے، خدا کو نہیں پہنچتا بلکہ سب کا سب خدا کے خدا بندوں کو پہنچتا ہے۔

نبی کا عزم دوسروں سے بے نیاز ہوتا ہے

قُلْ اِنِّيْٓ اُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ اَوَّلَ مَنْ اَسْلَمَ، یعنی اگر تم مدعی ہو کہ خدا نے تمھارے ان مزعومہ بتوں کو اپنی خدائی میں شریک بنایا ہے اور تمھیں ان کی عبادت کا حکم دیا ہے تو تم جانو، مجھے تو جو حکم ملا ہے وہ یہ ہے کہ میں سب سے پہلا اسلام لانے والا اور اپنے آپ کو بالکلیہ اپنے رب کے حوالے کر دینے والا بنوں۔ سو میں تو اسی حکم کی تعمیل کرنے والا ہوں، تم میں سے کوئی میرا ساتھ دے یا نہ دے۔ اس اسلوب بیان سے، جیسا کہ ہم دوسری جگہ تصریح کر چکے ہیں، جہاں یہ بات نکلتی ہے کہ نبی جس بات کی تعلیم دنیا کو دیتا ہے اس پر پہلا عمل کرنے والا وہ خود بنتا ہے، وہیں یہ بات بھی نکلتی ہے کہ اس امر سے اس کی اس یکسوئی اور اس کے عزم میں کوئی فرق نہیں پیدا ہوتا کہ جن کو اس نے پکارا ان میں سے کسی نے اس کا ساتھ دیا یا نہیں دیا۔

وَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ، کا عطف اَنْ اَكُوْنَ اَوَّلَ مَنْ اَسْلَمَ، پر نہیں ہے بلکہ یہ مستقل بات ہے یعنی تم ان کو بتا دو کہ مجھے یہ حکم ملا ہے اور تم مشرکین میں سے نہ بنو۔ اس طرح کی نہی میں اگرچہ ظاہر خطاب آنحضرت صلعم سے ہوتا ہے لیکن اس میں زجر کا جو پہلو نکلتا ہے اس کا رخ ان لوگوں کی طرف ہوتا ہے جن

کا رویہ زیر بحث ہوتا ہے۔

قُلْ اِنِّیْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَیْتُ رَبِّیْ الایۃ یعنی جب مجھے حکم یہ ملا ہے کہ میں سب سے پہلا اسلام لانے والا بنوں تو میرے لیے یہ کس طرح ممکن ہے کہ میں اپنے رب کے اس حکم کی نافرمانی کروں؛ اگر میں نافرمانی کروں تو میں اس ہولناک دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں جس سے ہر نافرمانی کرنے والے کو سابقہ پیش آنا ہے۔

ڈرنے کی اصل چیز اور چاہنے کی اصل چیز

مَنْ یُّصْرَفْ عَنْهُ یَوْمَىِٕذٍ فَقَدْ رَحِمَهٗ، یعنی ڈرنے کی اصل چیز یہ خوفناک دن اور اس کا عذاب ہی ہے، جو اس سے محفوظ رہا، درحقیقت وہی ہے جس پر خدا کا رحم ہوا اور چاہنے کی اصل چیز اس دن کی رحمت ہی ہے اس لیے کہ جو اس رحمت کا سزاوار قرار پایا درحقیقت وہی ہے جس نے اصل کامیابی حاصل کی۔ اس میں اس بات کی طرف لطیف اشارہ بھی ہے کہ جو لوگ اس دنیا کی کامیابیوں ہی کو بڑی چیز سمجھتے ہیں اور ان کے پیچھے آخرت کی خوفناکیوں کو بھول بیٹھے ہیں انھیں اپنی بدبختی اور محرومی کا اندازہ کل ہوگا۔

وَاِنْ یَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهٗٓ اِلَّا هُوَ ۭ وَاِنْ یَّمْسَسْكَ بِخَیْرٍ فَهُوَ عَلٰي كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ۝ وَهُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهٖ ۭ وَهُوَ الْحَكِیْمُ الْخَبِیْرُ ۝ ۱۷-۱۸

نفع و ضرر صرف خدا کے اختیار میں ہے۔

وَاِنْ یَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ میں خطاب اگرچہ لفظاً بصیغہ واحد ہے لیکن مراد عام ہے اور یہ بات اوپر والی بات ہی کی توضیح مزید کی حیثیت رکھتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ نفع و ضرر دونوں خدا ہی کے اختیار میں ہیں۔ اگر وہ کسی کو کسی دکھ میں مبتلا کرے تو کوئی نہیں ہے جو اس کو دور کر سکے۔ اسی طرح اگر وہ کسی کو کسی خیر سے بہرہ مند کرے تو جس خیر سے چاہے بہرہ مند کر دے، کسی کی طاقت نہیں ہے کہ اس کے ارادے میں مزاحم ہو سکے۔ پھر کسی اور کو مولیٰ و مرجع بنانے اور کسی اور سے دعا و استرحام کی ضرورت کیا باقی رہی؟

لفظ قہر کا مفہوم

وَهُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهٖ، قہر کا لفظ عربی میں اس معنی میں بالکل نہیں آتا جس معنی میں اردو میں آتا ہے بلکہ اس کے معنی اختیار اور قابو، حکومت اور تسلط میں رکھنے کے آتے ہیں۔ انگریزی میں لفظ (control) کا جو مفہوم ہے وہی مفہوم عربی میں اس لفظ کا ہے۔ اسی سے لفظ قہار مبالغہ کا صیغہ ہے جو اسمائے حسنیٰ میں سے ہے جس کے معنی (controller) کے ہیں۔ یعنی تمام جہان اور اس کے تمام بندے ہر آن اس کی مٹھی اور اس کے قابو میں ہیں۔ وہ ان کو قابو میں رکھنے کے لیے نہ کسی مددگار کا محتاج ہے اور نہ اس کا اندیشہ ہے کہ جب وہ ان کو پکڑنا چاہے یا اکٹھا کرنا چاہے تو کوئی اس کی گرفت سے باہر نکل سکے۔ آگے اس مضمون کی وضاحت بھی ہو گئی ہے۔ وَهُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهٖ وَیُرْسِلُ عَلَیْكُمْ حَفَظَةً ۭ حَتّٰٓى اِذَا جَاۗءَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ تَوَفَّتْهُ رُسُلُنَا وَهُمْ لَا یُفَرِّطُوْنَ ۝ ۶۱ (اور وہ اپنے تمام بندوں پر اپنا قابو جمائے ہوئے ہے اور وہ تم پر اپنے نگران بھیجتا رہتا ہے یہاں تک کہ جب تم میں سے کسی کی موت آتی ہے تو اس کو ہمارے فرستادے ہی قبض کرتے ہیں اور وہ اس کام میں کوئی کوتاہی نہیں کرتے)

صفات حکیم و خبیر کے لوازم

وَهُوَ الْحَكِیْمُ الْخَبِیْرُ، خدا کا حکیم و خبیر ہونا ہم دوسرے مقامات میں واضح کر چکے ہیں کہ کئی باتوں کو تستلزم

ہے۔ مثلاً یہ کہ وہ ایک روز جزا و سزا کو لائے اس لیے کہ اس کے بغیر یہ دنیا بالکل بے مقصد ہو کے رہ جاتی ہے۔ اس کے ہاں کسی ایسی شفاعت کی گنجائش نہ ہو جو حق کو باطل اور باطل کو حق بنا سکے اس لیے کہ یہ اس کی حکمت کے بھی منافی ہے اور اس کے خبیر ہونے کے بھی۔

قُلْ اَیُّ شَیْءٍ اَکْبَرُ شَهَادَةً ؕ قُلِ اللّٰهُ ۙ شَهِیْدٌۢ بَیْنِیْ وَبَیْنَكُمْ ؕ وَاُوْحِیَ اِلَیَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَمَنْۢ بَلَغَ ؕ اَىِٕنَّكُمْ لَتَشْهَدُوْنَ اَنَّ مَعَ اللّٰهِ اٰلِهَةً اُخْرٰی ؕ قُلْ لَّاۤ اَشْهَدُ ۚ قُلْ اِنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ وَّاِنَّنِیْ بَرِیْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ (۱۹)

'وَمَنْ بَلَغَ' کا عطف

'لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَمَنْ بَلَغَ' عام طور پر مفسرین نے وَمَنْ بَلَغَ کو ضمیر منصوب پر معطوف مانا ہے یعنی یہ قرآن اس لیے مجھ پر وحی کیا گیا ہے کہ میں اس کے ذریعے سے تم کو اور ان سب کو بیدار و ہوشیار کروں جن تک یہ پہنچے۔ لیکن ہمارا خیال یہ ہے کہ یہ ضمیر متکلم پر معطوف ہے یعنی میں اس کے ذریعے سے تم کو خبردار کروں اور جن کو یہ پہنچے وہ بھی اپنی اپنی جگہ پر دوسروں کو اس کے ذریعے سے خبردار کریں۔ یہ گویا اس ذمہ داری کی یاددہانی ہے جس کا ذکر دوسرے مقام میں یوں ہوا ہے فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّیَتَفَقَّهُوْا فِی الدِّیْنِ وَلِیُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ اِذَا رَجَعُوْۤا اِلَیْهِمْ۔ ۱۲۲ توبہ۔ (پس ایسا کیوں نہ ہوا کہ ان کے ہر گروہ میں سے ایک جماعت دین کا علم حاصل کرنے کے لیے اٹھتی اور تاکہ وہ اپنی قوم کو خبردار کرتی جبکہ ان کی طرف واپس آتی) یہی حقیقت احادیث میں بھی واضح کی گئی ہے۔ چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے تمام صحابہ پر انذار و تبلیغ کی ذمہ داری ڈالی اور فرمایا لیبلغ الشاھد الغائب پس چاہیے کہ جو لوگ موجود ہیں وہ ان لوگوں کو پہنچا دیں جو موجود نہیں ہیں۔ لِتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَی النَّاسِ وَیَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَیْكُمْ شَهِیْدًا میں اس امت کا جو فریضہ منصبی بیان ہوا ہے اور جس کی وضاحت ہم اس کے مقام میں کر چکے ہیں، اس سے بھی اسی مفہوم کی تائید نکلتی ہے جس کی طرف ہم نے اشارہ کیا ہے۔

توحید اور شرک کے معاملے میں فیصلہ کن گواہی خدا ہی کی ہے

آیت کا مطلب یہ ہوا کہ خدا کا کوئی شریک ہے یا نہیں، اس معاملے میں فیصلہ کن گواہی خود خدا ہی کی ہو سکتی ہے جو ہی بتا سکتا ہے کہ اس نے اپنی خدائی میں کسی کو شریک بنایا ہے یا نہیں اور بنایا ہے تو وہ کون کون ہیں اور وہ کس نوعیت کے شریک ہیں۔ اگر اس نے کسی کا شریک ہونا تسلیم نہیں کیا ہے تو تم کو یا کسی کو کیا حق ہے کہ کسی کو اس کی خدائی میں حصہ دار بناتے۔ اب آؤ، میں اس نزاع کے فیصلے کے لیے اپنے اور تمہارے درمیان خدا ہی کو گواہ مانتا ہوں۔ اس نے میرے اوپر یہ قرآن اسی گواہی کے لیے نازل کیا ہے کہ میں تم کو خبردار کر دوں کہ کوئی اس کا شریک نہیں ہے اور جن جن کو یہ پہنچے وہ بھی دوسروں کو خبردار کریں کہ وہ وحدہٗ لاشریک ہے۔ کوئی اس کا شریک و سہیم نہیں ہے۔ اب اس کے بعد بھی اگر تم مدعی ہو کہ دوسرے معبود خدا کے شریک ہیں تو میں اس بے دلیل گواہی کے لیے تیار نہیں۔ مجھے خدا کا حکم یہی ہے کہ میں اعلان کر دوں کہ وہ ایک ہی معبود ہے اور میں ان تمام چیزوں سے اپنی برأت کا اعلان کرتا ہوں جن کو تم خدا کا شریک

گردانتے ہو۔

اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ ۘ اَلَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِهٖ ؕ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ (۲۰-۲۱)

'اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ' اس ٹکڑے پر تفصیلی بحث بقرہ کی تفسیر میں آیت ۱۴۶ کے تحت گزر چکی ہے۔ وہاں ہم نے بتایا ہے کہ اس سے مراد صالحین اہل کتاب ہیں۔ قرآن میں اچھے اہل کتاب کا ذکر بالعموم بصیغۂ معروف ہی ہوا ہے۔ 'يَعْرِفُوْنَهٗ' میں ضمیر منصوب کا مرجع قرآن ہے جس کا ذکر اوپر 'وَاُوْحِيَ اِلَيَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ' میں گزر چکا ہے۔ اس سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی مراد لیا گیا ہے لیکن چونکہ یہاں سیاق کلام نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب کا ہے اس وجہ سے آپ کے لیے ضمیر غائب موزوں نہیں ہے ویسے باعتبار مدعا کوئی فرق واقع نہیں ہوگا اس لیے کہ نبی اور قرآن دونوں لازم و ملزوم ہیں اور ایسے لازم و ملزوم کہ قرآن میں، جیسا کہ ہم دوسرے مقام میں واضح کریں گے، ایک دوسرے سے بدل پڑے ہوئے ہیں۔ بقرہ میں ہم 'اَبْنَآءَهُمْ' کی تشبیہ پر بھی بحث کر چکے ہیں کہ جس طرح ایک مہجور باپ کو اپنے موعود و منتظر بیٹے کا انتظار ہوتا ہے اور جب وہ آتا ہے تو دور سے اس کے پیراہن کی خوشبو اس کے لیے نوید مسرت لاتی ہے اسی طرح صالحین اہل کتاب کو قرآن اور پیغمبر کا انتظار تھا اور اسی جذبے کے ساتھ جیسا کہ 'وَاِذَا سَمِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَى الرَّسُوْلِ' الآیۃ کے تحت گزر چکا ہے، انھوں نے اس کا خیر مقدم کیا۔

صالحین اہل کتاب کی گواہی

اب یہ قرآن کی گواہی کو مزید موثق کرنے کے لیے فرمایا کہ یہ کوئی غیر معروف گواہی نہیں ہے بلکہ جانی پہچانی ہوئی گواہی ہے۔ اس کا ذکر پچھلے آسمانی صحیفوں میں بھی موجود ہے۔ تم سے پہلے جن کو کتاب عطا ہوئی وہ اس کو پہچانتے ہیں اور جو ان میں اہل ایمان ہیں وہ اس کے منتظر و مشتاق رہے ہیں۔ اس پر ایمان لانے سے محروم تو صرف وہ رہیں گے جنھوں نے اپنے آپ کو گھاٹے میں ڈالا۔ فرمایا جب خدا کی گواہی یہ ہے تو ان سے بڑھ کر بدقسمت ظالم اور نامراد کون ہو سکتا ہے جو اس گواہی کے خلاف خدا پر یہ جھوٹ باندھیں کہ اس نے فلاں اور فلاں کو اپنا شریک بنایا ہے یا اس کی آیات کی تکذیب کریں جب کہ وہ توحید کی واضح تعلیم کے ساتھ ان کے پاس آگئی۔ ایسے ظالم کبھی فلاح پانے والے نہیں بن سکتے۔

یہ سورہ اگرچہ مکی ہے لیکن یہ اس دور کی سورہ ہے جب مدینہ کے اہل کتاب اس دعوت سے غیر متعلق نہیں رہے تھے بلکہ ان کے اشرار اس کی مخالفت کو شہ دے رہے تھے اور جو اچھے لوگ تھے وہ اس کو سابق صحیفوں کی پیشین گوئیوں کی تصدیق سمجھتے تھے۔ اس وجہ سے قرآن کا یہ اشارہ یہاں بڑا معنی خیز ہے۔ اس سے اخیار کی حوصلہ افزائی بھی ہوئی اور ساتھ ہی ان لوگوں پر ایک چوٹ بھی لگا دی گئی جو جان کر انجان بن رہے تھے۔ اس مضمون کی مزید تفصیل اسی سورہ میں آگے آیت ۱۱۴ کے تحت آئے گی۔

وَيَوْمَ نَحْشُرُهُمْ جَمِيْعًا ثُمَّ نَقُوْلُ لِلَّذِيْنَ اَشْرَكُوْٓا اَيْنَ شُرَكَآؤُكُمُ الَّذِيْنَ كُنْتُمْ

تَزْعُمُوْنَ ۝ ثُمَّ لَمْ تَكُنْ فِتْنَتُهُمْ اِلَّآ اَنْ قَالُوْا وَاللّٰهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِيْنَ ۝ اُنْظُرْ كَيْفَ كَذَبُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ (۲۲-۲۴)

'جمیعاً' کی تاکید کا فائدہ

'وَيَوْمَ نَحْشُرُهُمْ جَمِيْعًا' میں 'جَمِيْعًا' کی تاکید نے ان تمام گروہوں کو اپنے اندر سمیٹ لیا ہے جن کا ذکر اوپر کی آیات میں ہوا۔ یعنی ان کو بھی جنھوں نے خدا پر جھوٹ گھڑ کے اس کے لیے شرکا ایجاد کیے ان کو بھی جنھوں نے مرنے کے بعد اٹھائے جانے اور جزا و سزا کا انکار کیا اور ان کو بھی جنھوں نے اللہ کی آیات کی تکذیب کی۔ اگرچہ یہ تمام جرائم ان تمام مشرکین کے مشترک جرائم تھے تاہم ان کے ذوقی رجحانات کچھ الگ الگ بھی تھے اس وجہ سے آگے کی آیات میں ان کا الگ الگ بھی ذکر ہوا اور ان سب پر ان کے جرائم کی مخصوص نوعیت کے اعتبار سے ضرب لگائی گئی ہے۔

'فتنہ' کا مفہوم

'ثُمَّ لَمْ تَكُنْ فِتْنَتُهُمْ' لفظ 'فتنہ' کی تحقیق دوسرے مقام میں گزر چکی ہے اگر اس کو اس معنی میں لیا جائے جس معنی میں مال و اولاد، دنیا اور زخارف دنیا کو قرآن میں فتنہ کہا گیا ہے تب تو یہ اپنے مفعول کی طرف مضاف ہوگا اور مطلب یہ ہوگا کہ جس فتنۂ شرک اور جن جھوٹی اور موہوم آرزوؤں میں آج یہ مبتلا ہیں اس کے پردے اٹھ جائیں گے اور ان کو نظر آ جائے گا کہ جن سہاروں پر وہ جی رہے ہیں وہ محض فریب تھے۔ اس وقت ان کو اس کے سوا کوئی چارۂ کار نظر نہیں آئے گا کہ جس طرح آج خدا پر جھوٹ باندھ رہے ہیں اسی طرح اپنے اوپر جھوٹ بولیں۔ اور اگر اس لفظ کو ظلم و تشدد سے دین سے پھیرنے کے معنی میں لیا جائے تو یہ اپنے فاعل کی طرف مضاف ہوگا اور مطلب یہ ہوگا کہ آج جس فتنہ میں یہ کمزور مسلمانوں کو بجرم انکارِ شرک، مبتلا کر رہے ہیں وہ ختم ہو جائے گا، اور وہ خود ایسی آفتوں میں مبتلا ہو جائیں گے کہ آج جس شرک کی حمایت میں وہ مسلمانوں کو مظالم کا ہدف بنائے ہوئے ہیں خدا کی پکڑ میں آتے ہی اس سے برأت کا اعلان کریں گے اور جھوٹ بولیں گے۔ ان دونوں میں سے جو مفہوم بھی لیا جائے دونوں ہی صورتوں میں انداز کلام طنزیہ ہوگا اور استثنا منقطع۔ میرا غالب رجحان پہلے مفہوم کی طرف ہے اور ترجمہ میں اسی کا میں نے لحاظ رکھا ہے۔

مشرکین کا جھوٹ دنیا اور آخرت میں

'اُنْظُرْ كَيْفَ كَذَبُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ' میں 'اُنْظُرْ' تصویر حال کے لیے ہے تاکہ مستقبل کا ایک ماجرا چشم تصور کے سامنے آ جائے 'كَذَبُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ' کے معنی ہیں انھوں نے اپنے اوپر جھوٹی گواہی دی، یعنی دنیا میں جس شرک کی حمایت میں لڑتے مرتے رہے آخرت میں پہلے ہی قدم پر، قسم کھا کر اس کا انکار کریں گے۔ اس میں یہ لطیف تعریض بھی ہے کہ دنیا میں یہ خدا کے خلاف جھوٹی گواہی دیتے رہے، جیسا کہ آیت ۱۹ میں مذکور ہے، اور آخرت میں اپنے اوپر جھوٹی گواہی دیں گے 'ضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ' کا ٹھیک ٹھیک مطلب یہ ہوگا کہ دنیا میں خدا پر جھوٹ باندھ کر جن کو شرکا و شفعا کا درجہ دیا گیا تھا اور جن سے تمام امیدیں باندھی گئی تھیں وہ سب ہوا ہو گئے۔ ان میں سے کوئی کام نہ آیا۔

ایک سوال کا جواب

اجزا کی تشریح سے آیات کا مدعا خود بخود واضح ہوگیا ہے، مزید تفصیل کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ البتہ ایک سوال ممکن ہے بعض لوگوں کے ذہن میں پیدا ہو۔ وہ یہ کہ قرآن کے بعض مقامات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ قیامت کے روز مشرکین اپنے شرک کا اقرار کریں گے بلکہ اپنے شرکا کو پکاریں گے بھی، اور آیت زیر بحث میں یہ تصریح ہے کہ وہ قسم کھا کے شرک سے اپنی برأت کا اعلان کریں گے۔ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ یہ احوال روز قیامت کے مختلف مراحل کے بیان ہوئے ہیں۔ اس روز مشرکین کو جس حیرانی و پریشانی سے سابقہ پیش آئے گا وہ ایسی ہوگی کہ اس میں ان کو نجات کی کوئی راہ سجھائی نہیں دے گی اس وجہ سے جس مرحلے میں جو بات بنتی نظر آئے گی وہ بنانے کی کوشش کریں گے لیکن۔ ع

کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّسْتَمِعُ اِلَيْكَ ۚ وَجَعَلْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ يَّفْقَهُوْهُ وَفِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرًا ۚ وَاِنْ يَّرَوْا كُلَّ اٰيَةٍ لَّا يُؤْمِنُوْا بِهَا ۚ حَتّٰٓى اِذَا جَآءُوْكَ يُجَادِلُوْنَكَ يَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ۝ وَهُمْ يَنْهَوْنَ عَنْهُ وَيَنْــَٔوْنَ عَنْهُ ۚ وَاِنْ يُّهْلِكُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ۝ وَلَوْ تَرٰٓى اِذْ وُقِفُوْا عَلَى النَّارِ فَقَالُوْا يٰلَيْتَنَا نُرَدُّ وَلَا نُكَذِّبَ بِاٰيٰتِ رَبِّنَا وَنَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ بَلْ بَدَا لَهُمْ مَّا كَانُوْا يُخْفُوْنَ مِنْ قَبْلُ ۭ وَلَوْ رُدُّوْا لَعَادُوْا لِمَا نُهُوْا عَنْهُ وَاِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ (۲۵-۲۸)

ایک سنت الٰہی کا بیان

وَجَعَلْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ يَّفْقَهُوْهُ وَفِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرًا ۔ 'اکنّۃ'، 'کنّ' اور 'کنان'، کی جمع ہے اس کے معنی پردہ اور ڈھکنے کے ہیں۔ 'وقر' بوجھ، ثقل اور گرانی کو کہتے ہیں۔ یہاں اس سے وہ گرانی مراد ہے جو کانوں کو بہرہ کر دے۔ یہ جس حجاب اور جس بہرے پن کا ذکر ہے ظاہر ہے کہ وہ معنوی اور روحانی حجاب اور گرانی ہے جو دلوں اور کانوں کو سننے اور سمجھنے کی اس صلاحیت سے محروم کر دے جو انسانیت کا اصلی خاصہ ہے، جس سے محروم ہو کر انسان چوپایہ بلکہ چوپائے سے بھی بدتر ہو جاتا ہے۔ انسان پر یہ محرومی اس کی اپنی شامت اعمال کے نتیجہ میں مسلط ہوتی ہے جس کا ایک مخصوص ضابطہ ہے۔ اس ضابطہ یا بالفاظ دیگر اس سنت اللہ کی پوری تفصیل ہم بقرہ کی تفسیر میں بیان کر چکے ہیں۔ چونکہ یہ بات اللہ تعالیٰ کی ٹھہرائی ہوئی ایک خاص سنت کے تحت واقع ہوتی ہے اس وجہ سے اللہ تعالیٰ اس کو اپنی طرف منسوب فرماتا ہے بقرہ میں ختم قلوب کی بحث پر ایک نظر ڈال لیجیے۔ اس آیت میں 'اَنْ يَّفْقَهُوْهُ' کا مقابل فعل جو لفظ 'اٰذَان' کے ساتھ مناسبت رکھنے والا ہو، محذوف ہے۔ ترجمہ میں ہم نے اس کو کھول دیا ہے۔

ایک حقیقت نفس الامری

وَاِنْ يَّرَوْا كُلَّ اٰيَةٍ لَّا يُؤْمِنُوْا بِهَا ، یہ محض مبالغہ کا ایک اسلوب بیان نہیں بلکہ حقیقت نفس الامری کا بیان ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ان کے ایمان نہ لانے کا سبب یہ نہیں ہے کہ ان کے سامنے عجائب اور کرشمے ظاہر نہیں ہوئے۔ آخر یہ ساری کائنات، آسمان و زمین، سورج، چاند، دریا، پہاڑ، ابر، ہوا، رات، دن کیا ہیں؟ کیا یہ کرشمے اور عجائب نہیں ہیں؟ ساری کائنات کرشموں اور عجائب سے بھری پڑی ہے لیکن

جن کے پاس دیکھنے والی آنکھیں ہی نہ ہوں، ان کا کیا علاج؟ جس طرح ان سارے عجائب اور کرشموں سے ان کی آنکھیں بند ہیں اگر اور کرشمے بھی ان کو دکھا دیے جائیں جب بھی یہ کوئی نہ کوئی بات بنا ہی لیں گے اور اپنی ہٹ پر جمے ہی رہیں گے۔ ان کا علاج تو یہ ہے کہ یہ اپنی آنکھوں کی پٹیاں کھولیں اور گوش دل سے پیغمبر کی باتیں اور قرآن کی دعوت سنیں۔ یہ وہ کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں تو معجزوں اور کرشموں سے ان کو کیا نفع پہنچے گا۔

گر نہ بیند بروز شپرہ چشم　　چشمۂ آفتاب راچہ گناہ

اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ، اساطیر، سطر، کے مادے سے 'اسطورۃ' اور 'اسطیرۃ' کی جمع ہے۔ اس کے معنی ہیں بے سروپا داستان، بے اصل قصہ، فسانہ۔

قوموں کے عروج و زوال سے متعلق عربوں کا نظریہ اور اس کی تردید

قرآن نے اپنی دعوت کے سلسلہ میں بعض قوموں کی تاریخ جو پیش کی ہے وہ اس پہلو سے پیش کی ہے جو تاریخ کا اصلی مفید پہلو ہے۔ اس سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ قوموں کا ابھرنا اور فنا ہونا اتفاقی واقعات کے طور پر ظہور میں نہیں آتا بلکہ اس میں اصلی دخل اخلاقی عوامل کو ہوتا ہے۔ جب کوئی قوم زندگی کے اخلاقی عناصر سے خالی ہو جاتی ہے تو قدرت کا قانون اس کو فنا کر دیتا ہے اور کوئی دوسری قوم اس کی جگہ اٹھا کھڑی کرتا ہے جو کہ کردار و اخلاق میں اس سے بہتر ہوتی ہے اور پھر اس کی آزمائش کرتا ہے کہ وہ اقتدار پا کر کیا رویہ اختیار کرتی ہے۔ اگر اس کا رویہ بھی بگڑ جاتا ہے تو پھر اس کو بھی فنا کر دیتا ہے اور اس کی جگہ کسی دوسری قوم کو لاتا ہے۔ عروج و زوال کے اس اصول کو بنیاد قرار دے کر قرآن نے عربوں کے سامنے خود ان کے ملک اور ان کے گرد و پیش کی تاریخ رکھی کہ عاد، ثمود، مدین، سبا، قوم لوط اور قوم فرعون وغیرہ کے فنا ہونے کے واقعات اتفاقی واقعات نہیں ہیں بلکہ یہ عروج و زوال کے اس خدائی ضابطے کے تحت ظہور میں آئے ہیں جو قوموں کی زندگی اور موت کے لیے خدا نے مقرر فرمائے ہیں۔ یہ قومیں اخلاقی و روحانی بیماریوں میں مبتلا ہوئیں تو اللہ نے ان کی اصلاح اور ان کے علاج کے لیے روحانی و اخلاقی طبیب یعنی انبیا بھیجے۔ ان انبیا نے سر توڑ کوشش کی کہ اپنی قوم کی بیماریاں دور کریں لیکن ان کی قوموں نے ان کی باتوں پر کان نہ دھرے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو فنا کر دیا۔ یہ تاریخ سنا کر قرآن نے عربوں کو متنبہ کیا کہ اس وقت تمہارے سامنے بھی زندگی اور موت کا یہی مرحلہ ہے۔ تمہارے اندر بھی خدا کا رسول آگیا ہے اور اگر تم نے اس کی بات نہ سنی تو تم بھی اسی طرح فنا کر دیے جاؤ گے جس طرح تمہاری پیشرو قومیں فنا کر دی گئیں۔ اہل عرب کے پندار پر قرآن کے اس انذار سے سخت چوٹ پڑتی تھی۔ اول تو ان پر یہی بات شاق گزرتی تھی کہ وہ کسی اخلاقی و روحانی بیماری میں مبتلا ہیں جس کے نتیجے میں ان پر عذاب الٰہی آنے والا ہے، دوسری یہ کہ وہ اس بات کو بالکل بعید از عقل سمجھتے تھے کہ قومی عروج و زوال میں اخلاقی عوامل کو کوئی دخل ہوتا ہے۔ ان کا نظریہ یہ تھا کہ قومیں بھی افراد و اشیا کی طرح جنتی اور مرتی ہیں، جس طرح ایک

فرد یا ایک درخت پیدا ہوتا ہے، جوان ہوتا ہے، بوڑھا ہوتا ہے پھر مرجاتا ہے یا سوکھ جاتا ہے اسی طرح قومیں بھی پیدا ہوتی، جوان ہوتی اور فنا ہو جاتی ہیں۔ اس چیز کو کردار و ایمان سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اہل عرب کا یہ قول جو قرآن میں نقل ہوا ہے کہ 'وَمَا يُهْلِكُنَا إِلَّا الدَّهْرُ' (ہمیں نہیں تباہ کرتی مگر گردشِ روزگار) وہ بھی قرآن اور پیغمبر کے اسی انذار کے جواب میں کہتے تھے کہ یہ غلط ہے کہ قومیں اخلاق و ایمان کی بنا پر تباہ ہوتی ہیں، ایمان و اخلاق کو اس مسئلے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ سب گردشِ روزگار کے کرشمے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جب ان کا نظریہ یہ تھا تو قرآن کے اس تاریخی نقطۂ نظر پر ان کو غصہ آنا ہی تھا اور ان کا یہ غصہ اور بھی بڑھ جاتا تھا جب وہ یہ دیکھتے کہ بہت سے لوگ اس تاریخی حقیقت سے اثر پذیر ہو کر یہ اندیشہ بھی کرنے لگے ہیں کہ اگر انھوں نے پیغمبر اور قرآن کی بات نہ مانی تو وہ عذاب کی گرفت میں آجائیں گے۔ اس بوکھلاہٹ میں وہ یہ کہتے کہ 'إِنْ هَٰذَا إِلَّا أَسَاطِيرُ الْأَوَّلِينَ' یہ قرآن ہے کیا، بس اس میں پچھلی قوموں کے کچھ بے سر و پا افسانے ہیں جن کو نعوذ باللہ ایک سر پھرا سناتا پھر رہا ہے۔ اس پر نحل کی آیت ۲۴ کے تحت مزید بحث آئے گی۔

حذف کا ایک اسلوب

'فَقَالُوا يَا لَيْتَنَا نُرَدُّ وَلَا نُكَذِّبَ بِآيَاتِ رَبِّنَا' یہاں تمنی کا جواب 'فنصدق' یا اس کا ہم معنی کوئی لفظ محذوف ہے اور 'وَلَا نُكَذِّبَ' اسی محذوف پر معطوف ہے اس وجہ سے مضارع خفیف کی شکل میں آیا ہے۔ اس قسم کے حذف کی مثالیں اس سے پہلے بھی گزر چکی ہیں اور آگے بھی آئیں گی۔ مثالیں نقل کرنے کی ضرورت نہیں ہے، چونکہ مذکورہ بالا تمنا کے جواب میں 'نصدق' یا اس کے ہم معنی کسی لفظ کا آنا بالکل واضح تھا اس وجہ سے اس کو حذف کر دیا اور 'ولا نکذب' میں جو حرف عطف ہے اس کے ذریعہ سے محذوف کا پتا دے دیا۔ 'ولا نکذب' کے اظہار میں جو بلاغت ہے وہ یہ ہے کہ اس سے ان کی حسرت کا بھی اظہار ہو رہا ہے اور اعترافِ جرم کا بھی۔ یعنی آج تو یہ اکڑ رہے ہیں اور قرآن کو ایک داستانِ پارینہ قرار دے رہے ہیں لیکن کل حسرت کریں گے کہ کاش ہم پھر دنیا میں جائیں کہ اپنے رب کی آیات کی تصدیق کریں اور ان کی تکذیب نہ کریں۔

اجزائے کلام کی وضاحت کے بعد ایک اجمالی نظر ان آیات پر پھر ڈال لیجیے۔

قرآن کی تکذیب کرنے والے سرہنگوں کا انجام

اوپر آیات ۲۱-۲۴ میں شرک کے سرغنوں کا انجام واضح کیا گیا تھا، زیر بحث آیات میں قرآن کی تکذیب کرنے والے سرہنگوں کا انجام بیان ہو رہا ہے۔ فرمایا کہ ان کے کچھ اشرار تمھاری باتیں اور تمھارا پیش کردہ کلام سنتے تو ہیں لیکن سمجھنے اور قبول کرنے کے لیے نہیں بلکہ بحث و جدال کے لیے کہ کوئی ایسی بات ہاتھ آئے جس کو بہانہ بنا کر تم سے کٹ حجتی کر سکیں۔ ان کے دلوں اور ان کے کانوں پر ان کی بداعمالیوں کے سبب سے مہر ہو چکی ہے اس وجہ سے اب یہ اس کو قبول نہیں کر سکتے۔ یہ نہ خیال کرو کہ ان کی طلب کے مطابق اگر ان کو معجزہ دکھا دیا جائے تو اس کو مان لیں گے اور پھر اس قرآن پر ایمان لائیں گے۔ نہیں، اگر یہ دنیا جہان کے

معجزے بھی دیکھ لیں گے جب بھی یہ اسی طرح کٹ حجتی کریں گے اس لیے کہ ان کے انکار اور ان کی تکذیب کی اصل علت جب بھی باقی رہے گی۔ ان کے اندر بات کے سننے اور سمجھنے کا کوئی ارادہ ہی موجود نہیں ہے چنانچہ سب کچھ سن کر تمھارے پاس جھگڑنے کے لیے آستینیں چڑھائے ہوئے آتے ہیں اور کہتے ہیں اس قرآن میں رکھا ہی کیا ہے، اگلوں کی داستانیں اور پچھلوں کے فسانے!! فرمایا کہ اس طرح یہ دوسروں کو بھی اس سے روک رہے ہیں اور خود بھی اس سے متکبرانہ اعراض کر رہے ہیں لیکن اطمینان رکھو، نہ یہ خدا کا کچھ بگاڑ رہے ہیں نہ تمھارا، بلکہ یہ اپنے آپ ہی کو ہلاکت کے گڑھے میں جھونک رہے ہیں لیکن ابھی چونکہ وہ انجام ان کے سامنے نہیں آیا ہے جس سے ان کو خبردار کیا جا رہا ہے اس وجہ سے ان کو اس کا احساس نہیں ہے۔ اگر تم اس وقت کو دیکھ پاتے جب یہ اپنے انجام سے دوچار ہوں گے تو دیکھتے کہ جب یہ دوزخ کے کنارے پر کھڑے کیے جائیں گے تو کہیں گے، اے کاش ہم پھر دنیا میں لوٹائے جائیں کہ قرآن کی تصدیق کریں اور اپنے رب کی آیتوں کی تکذیب نہ کریں اور اہل ایمان میں سے بنیں۔ فرمایا کہ وہ اپنے اس اعتراف میں بھی جھوٹے ہیں۔ اگر وہ پھر لوٹائے جائیں تو وہی کریں گے جس سے وہ روکے گئے ہیں اس لیے کہ ان کی تکذیب کی علت یہ نہیں تھی کہ اصل حقیقت ان پر واضح نہیں تھی۔ وہ جانتے تھے کہ پیغمبر سچا ہے، قرآن حق ہے، جزا و سزا شدنی ہے لیکن حُبِّ دنیا، غرور اور حسد کے حجابات نے ان کی آنکھیں کھلنے نہ دیں۔ اب اگر دنیا میں جائیں گے تو جس طرح دل کی شہادت کے خلاف پہلے حق کو جھٹلاتے رہے ہیں اسی طرح پھر اس کو جھٹلائیں گے اور اس مشاہدے کو بھی زیادہ سے زیادہ ایک ڈراؤنا خواب قرار دے لیں گے۔

وَقَالُوْٓا اِنْ هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا وَمَا نَحْنُ بِمَبْعُوْثِيْنَ ۝ وَلَوْ تَرٰٓى اِذْ وُقِفُوْا عَلٰي رَبِّهِمْ ۭ قَالَ اَلَيْسَ هٰذَا بِالْحَقِّ ۭ قَالُوْا بَلٰي وَرَبِّنَا ۭ قَالَ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ ۝ قَدْ خَسِرَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِلِقَاۗءِ اللّٰهِ ۭ حَتّٰٓى اِذَا جَاۗءَتْهُمُ السَّاعَةُ بَغْتَةً قَالُوْا يٰحَسْرَتَنَا عَلٰي مَا فَرَّطْنَا فِيْهَا ۙ وَهُمْ يَحْمِلُوْنَ اَوْزَارَهُمْ عَلٰي ظُهُوْرِهِمْ ۭ اَلَا سَاۗءَ مَا يَزِرُوْنَ ۝ وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ ۭ وَلَلدَّارُ الْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ (۲۹-۳۲)

قیامت کو جھٹلانے والوں کا انجام

ان آیات میں کوئی ادبی یا نحوی اشکال نہیں ہے۔ مکذبین قرآن کے لیے اب یہ مکذبین قیامت کا انجام بیان کیا جا رہا ہے جو اس دنیا کی زندگی ہی کو زندگی سمجھتے تھے اور مرنے کے بعد دوبارہ اٹھائے جانے کے یا تو قائل ہی نہ تھے یا اس کو بہت ہی بعید از قیاس و امکان چیز سمجھتے تھے۔ فرمایا کہ اگر تم اس وقت کو دیکھ پاتے تو دیکھتے کہ ایک دن یہ سب اپنے رب کے حضور لا کھڑے کیے جائیں گے اور ان سے سوال ہوگا کہ کیوں یہ دوبارہ اٹھا کھڑا کرنا اور قیامت کا آنا ایک امر واقعہ ثابت ہوا یا نہیں؟ اس وقت وہ کہیں گے ہاں ہمارے رب کی قسم! یہ تو ایک امر واقعہ ہے۔ حکم ہوگا کہ پھر اب اس دن کے انکار کی پاداش میں چکھو مزا عذاب کا۔ اس کے بعد مکذبین کو تنبیہ کے ساتھ اہل ایمان کو تسلی دیتے ہوئے فرمایا کہ جن شامت زدوں نے

اللہ کی ملاقات کو جھٹلایا وہ سخت گھاٹے میں پڑے، جب قیامت کی گھڑی اچانک آدھمکے گی تو یہ حسرت سے اپنے سر پیٹیں گے اور کہیں گے ہم نے دنیا کی زندگی پر ریجھ کر اس دن کی تیاریوں میں جو کوتاہی کی اس پر افسوس! فرمایا کہ اس دن ان کی تصویر یہ ہوگی کہ سب اپنے اپنے گناہوں کے بوجھ اپنی اپنی پیٹھوں پر اٹھائے ہوں گے، نہ ان کے ساتھ ان کے اعوان و انصار ہوں گے نہ شرکا و شفعاء نفسی نفسی کا عالم۔ لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی (کوئی جان بھی کسی دوسری جان کا بوجھ اٹھانے والی نہ بنے گی) پھر آگاہی دیتے ہوئے فرمایا کہ کیا ہی برا ہوگا وہ بوجھ جس کو یہ اٹھائے ہوئے ہوں گے اس لیے کہ یہ بوجھ ان کے سروں سے پھر کبھی اترنے والا نہیں۔ اس کے بعد آخرت سے ڈرتے ہوئے زندگی بسر کرنے والوں کے لیے تسلی کا پہلو اور زیادہ واضح ہوگیا ہے۔ فرمایا کہ یہ دنیا کی زندگی جس نے انھیں آخرت سے غافل کر دیا ہے کیا ہے؟ محض بے نتیجہ لہو و لعب، چند روزہ دل کا بہلاوا! اصل شے تو دار آخرت اور اس کی زندگی ہے جو آخرت سے ڈرنے والوں کے لیے اس دنیا کی زندگی سے کہیں بہتر ہے۔ پس کیا تم سمجھتے نہیں۔

۴۰۔ آگے کا مضمون ——— آیات ۳۳-۵۰

پیغمبر صلعم کو تسلی

اوپر کا مجموعہ آیات، جیسا کہ آپ نے دیکھا، تسلی کے مضمون پر ختم ہوا ہے۔ اب وہی تسلی کا مضمون آگے بڑھ رہا ہے۔ البتہ اس تسلی میں کچھ تیزی بھی آگئی ہے، اگرچہ یہ تیزی، جہاں تک پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کا تعلق ہے، اپنے اندر نہایت دلنواز ٹھنڈک رکھتی ہے اس لیے کہ اس میں عتاب و غضب کا جو پہلو ہے اس کا رخ تمام تر ان ہٹ دھرم منکرین کی طرف ہے جو درپے تھے کہ پیغمبر کوئی معجزہ دکھائیں تب وہ مانیں گے کہ یہ پیغمبر ہیں اور جو کچھ وہ پیش کر رہے ہیں یہ خدا کا کلام و پیغام ہے۔ قدرتی طور پر پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم پر اور عام مسلمانوں پر بھی ان کے اس مطالبے کا اثر پڑتا تھا۔ خاص طور پر پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم جو سراپا رافت و رحمت تھے اور اپنی قوم کے ایمان کے لیے اپنے اندر نہایت گہری تڑپ رکھتے تھے۔ اس مطالبے سے متاثر ہو کر اس بات کے خواہش مند ہو جاتے تھے کہ ان کی طلب کے مطابق کوئی معجزہ ظاہر ہو جائے، شاید یہ اس طرح ایمان لائیں۔ اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے تو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ تسلی دی کہ ان کا یہ مطالبہ تمھارے لیے وجہ پریشانی نہ بنے۔ یہ تمھاری تکذیب نہیں بلکہ آیات الٰہی کی تکذیب ہو رہی ہے تو جب خدا سب کچھ دیکھ اور سن رہا ہے اور ان کا مطالبہ پورا کرنے کی قدرت کے باوجود، پورا نہیں کر رہا ہے تو تم کیوں پریشان ہو۔ تم سے پہلے جو انبیا آئے ان کی بھی اسی طرح تکذیب ہوئی، انھوں نے برداشت کیا اسی طرح تم بھی برداشت کرو۔ سنت الٰہی یہی ہے۔

اس کے بعد نہایت تیکھے اور تند انداز میں فرمایا کہ اگر اللہ بجبر و زور ان کو ایمان کی راہ پر لانا چاہتا تو سب

کو اس کے آن میں مومن و مسلم بنا دیتا لیکن اس نے ایسا نہیں کیا بلکہ اس نے یہی پسند فرمایا کہ لوگ اپنی عقل و فہم سے کام لیں اور اپنے اختیار و ارادہ سے ایمان کی راہ اختیار کریں تو تم ان کے ایمان کی خواہش سے مغلوب ہو کر کیوں اس بات کے لیے بے قرار ہوتے ہو کہ لازماً کوئی ایسا معجزہ ظاہر ہو ہی جائے جو ان کو قائل کر کے خدا کے آگے جھکا ہی دے۔ خدا تو یہ بات نہیں چاہتا۔ تم اگر چاہتے ہو تو آسمان و زمین جہاں سے ہو سکے اس طرح کا معجزہ لا کر دکھا دو۔

اس کے بعد بتایا کہ کن صفات کے لوگ ایمان لائیں گے، کن صفات کے لوگ معجزے ہی مانگتے رہیں گے۔ پھر ان کے مطالبہ کے مطابق معجزہ نہ بھیجنے کی حکمت کی طرف اشارہ فرمایا اور اس کائنات میں قدرت کے جو بے شمار معجزات ہیں اور اللہ نے اپنی کتاب میں جو دلائل و براہین بیان فرمائے ہیں ان کی طرف توجہ دلائی اور فرمایا کہ جو لوگ ان چیزوں سے آنکھیں بند کیے ہوئے ہیں وہ گونگے بہرے اور اندھے ہیں۔ ان کی آنکھیں کوئی چیز بھی نہیں کھول سکتی۔

اس کے بعد فرمایا کہ اگر یہ لوگ کوئی نشانیٔ عذاب مانگتے ہیں تو ان سے پوچھو کہ اگر کوئی عذاب آیا یا قیامت ہی آ گئی تو اس سے بچاؤ کا کیا سامان انھوں نے کر رکھا ہے؟ اس وقت تو خدا خدا ہی پکاریں گے۔ اس سلسلے میں انبیا اور ان کی قوموں کی تاریخ کی طرف اشارہ فرمایا کہ ان قوموں کو ہم نے اپنی اس طرح کی نشانیاں دکھائیں لیکن انھوں نے ان سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ تباہ کر دی گئیں۔ اسی طرح اگر یہ کسی ظاہری یا باطنی پکڑ میں آ گئے تو اس سے ان کو خدا کے سوا کون بچانے والا بنے گا؟

آخر میں انبیاء کا فریضۂ منصبی بتا دیا کہ ان کا کام انذار و تبشیر ہے نہ کہ معجزے اور عذاب کی نشانیاں دکھانا اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے اعلان کرا دیا کہ نہ میں خدا کے خزانوں کا مالک ہوں، نہ غیب جانتا ہوں، نہ فرشتہ ہونے کا مدعی ہوں، بس اس وحی کی پیروی کرتا ہوں جو خدا کی طرف سے مجھ پر آتی ہے۔ جس کا جی چاہے اس کو مانے۔ یہ حقیقت اپنی جگہ پر بہرحال ثابت ہے کہ خدا کے ہاں اندھے اور ڈھٹیارے دونوں ایک درجہ میں نہیں ہوں گے ـــ اس روشنی میں آگے کی آیات تلاوت فرمائیے۔

آیات ۳۳-۵۰

قَدْ نَعْلَمُ اِنَّهٗ لَيَحْزُنُكَ الَّذِيْ يَقُوْلُوْنَ فَاِنَّهُمْ لَا يُكَذِّبُوْنَكَ وَلٰكِنَّ الظّٰلِمِيْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ ﴿۳۳﴾ وَلَقَدْ كُذِّبَتْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ فَصَبَرُوْا عَلٰى مَا كُذِّبُوْا وَاُوْذُوْا حَتّٰٓى اَتٰىهُمْ نَصْرُنَا ۚ وَلَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ ۚ وَلَقَدْ جَآءَكَ مِنْ نَّبَاِ

الْمُرْسَلِيْنَ ﴿٣٤﴾ وَإِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَيْكَ إِعْرَاضُهُمْ فَإِنِ اسْتَطَعْتَ
أَنْ تَبْتَغِيَ نَفَقًا فِي الْأَرْضِ أَوْ سُلَّمًا فِي السَّمَآءِ فَتَأْتِيَهُمْ بِاٰيَةٍ ط
وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَمَعَهُمْ عَلَى الْهُدٰى فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ ﴿٣٥﴾ النصف
إِنَّمَا يَسْتَجِيْبُ الَّذِيْنَ يَسْمَعُوْنَ ط وَالْمَوْتٰى يَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ ثُمَّ وقف غفران
إِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ ﴿٣٦﴾ وَقَالُوْا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ وقف منزل
رَّبِّهٖ ط قُلْ إِنَّ اللّٰهَ قَادِرٌ عَلٰى أَنْ يُّنَزِّلَ اٰيَةً وَّلٰكِنَّ أَكْثَرَهُمْ عند البعض على يسمعون
لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿٣٧﴾ وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا طٰٓئِرٍ يَّطِيْرُ
بِجَنَاحَيْهِ إِلَّآ أُمَمٌ أَمْثَالُكُمْ ط مَا فَرَّطْنَا فِي الْكِتٰبِ مِنْ شَيْءٍ
ثُمَّ إِلٰى رَبِّهِمْ يُحْشَرُوْنَ ﴿٣٨﴾ وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا صُمٌّ وَّ
بُكْمٌ فِي الظُّلُمٰتِ ط مَنْ يَّشَإِ اللّٰهُ يُضْلِلْهُ ط وَمَنْ يَّشَأْ يَجْعَلْهُ
عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿٣٩﴾ قُلْ أَرَءَيْتَكُمْ إِنْ أَتٰىكُمْ عَذَابُ اللّٰهِ
أَوْ أَتَتْكُمُ السَّاعَةُ أَغَيْرَ اللّٰهِ تَدْعُوْنَ ج إِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿٤٠﴾
بَلْ إِيَّاهُ تَدْعُوْنَ فَيَكْشِفُ مَا تَدْعُوْنَ إِلَيْهِ إِنْ شَآءَ وَتَنْسَوْنَ
مَا تُشْرِكُوْنَ ﴿٤١﴾ وَلَقَدْ أَرْسَلْنَآ إِلٰٓى أُمَمٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَأَخَذْنٰهُمْ ع ٤ ١١ ١٠
بِالْبَأْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ لَعَلَّهُمْ يَتَضَرَّعُوْنَ ﴿٤٢﴾ فَلَوْلَآ إِذْ جَآءَهُمْ
بَأْسُنَا تَضَرَّعُوْا وَلٰكِنْ قَسَتْ قُلُوْبُهُمْ وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ
مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿٤٣﴾ فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ
أَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ ط حَتّٰٓى إِذَا فَرِحُوْا بِمَآ أُوْتُوْٓا أَخَذْنٰهُمْ بَغْتَةً

فَاِذَا هُمْ مُّبْلِسُوْنَ ﴿۴۴﴾ فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ؕ وَالْحَمْدُ
لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۴۵﴾ قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ اَخَذَ اللّٰهُ سَمْعَكُمْ وَ
اَبْصَارَكُمْ وَخَتَمَ عَلٰى قُلُوْبِكُمْ مَّنْ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ يَاْتِيْكُمْ بِهٖ ؕ
اُنْظُرْ كَيْفَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ ثُمَّ هُمْ يَصْدِفُوْنَ ﴿۴۶﴾ قُلْ اَرَءَيْتَكُمْ
اِنْ اَتٰىكُمْ عَذَابُ اللّٰهِ بَغْتَةً اَوْ جَهْرَةً هَلْ يُهْلَكُ اِلَّا الْقَوْمُ
الظّٰلِمُوْنَ ﴿۴۷﴾ وَمَا نُرْسِلُ الْمُرْسَلِيْنَ اِلَّا مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ ۚ
فَمَنْ اٰمَنَ وَاَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۴۸﴾
وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا يَمَسُّهُمُ الْعَذَابُ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ﴿۴۹﴾
قُلْ لَّاۤ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِيْ خَزَآئِنُ اللّٰهِ وَلَاۤ اَعْلَمُ الْغَيْبَ وَلَاۤ اَقُوْلُ
لَكُمْ اِنِّيْ مَلَكٌ ۚ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰۤى اِلَيَّ ؕ قُلْ هَلْ يَسْتَوِي
الْاَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ ؕ اَفَلَا تَتَفَكَّرُوْنَ ﴿۵۰﴾ ع

ع ۵ ۹ ۱۱

ترجمۂ آیات ۴۴-۵۰

ہم آگاہ رہے ہیں کہ جو کچھ یہ کہتے ہیں اس سے تم کو غم ہوتا ہے تو صبر کرو، یہ تو تمھیں نہیں جھٹلا رہے ہیں بلکہ یہ ظالم تو اللہ کی آیات کا انکار کر رہے ہیں۔ اور تم سے پہلے بھی رسولوں کو جھٹلایا گیا تو انھوں نے جھٹلائے جانے اور ایذا دیے جانے پر صبر کیا۔ یہاں تک کہ ان کے پاس ہماری مدد آگئی۔ اللہ کی باتوں کو کوئی بدلنے والا نہیں اور پیغمبروں کی کچھ سرگزشتیں تو تمھیں پہنچ ہی چکی ہیں۔ ۳۴-۳۴

اور اگر ان کا اعراض تم پر گراں گزر رہا ہے تو اگر تم زمین میں کوئی سرنگ یا آسمان میں کوئی زینہ ڈھونڈ سکو کہ ان کے پاس کوئی نشانی لا دو تو کر دیکھو۔ اگر اللہ چاہتا تو

ان سب کو ہدایت پر جمع کر دیتا تو تم جذبات سے مغلوب ہو جانے والوں میں سے نہ بنو۔ بات تو وہی مانیں گے جو سنتے سمجھتے ہیں، رہے یہ مُردے تو اللہ ان کو اٹھائے گا پھر یہ اسی کی طرف لوٹائے جائیں گے۔ ۳۵-۳۶

اور یہ کہتے ہیں، اس پر اس کے رب کی طرف سے کوئی نشانی کیوں نہیں اتاری گئی۔ ان سے کہہ دو کہ اللہ اس بات پر قادر ہے کہ کوئی نشانی اتار دے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔ اور کوئی جانور نہیں جو زمین پر چلتا ہو اور کوئی پرندہ نہیں جو فضا میں اپنے دونوں بازوؤں سے اڑتا ہو مگر یہ سب تمھاری ہی طرح اُمتیں ہیں۔ اور ہم نے اپنی کتاب میں بھی کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے۔ پھر یہ سب اپنے پروردگار کے حضور اکٹھے کیے جائیں گے اور جنھوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا یہ بہرے اور گونگے تاریکیوں میں پڑے ہُوئے ہیں۔ اللہ جسے چاہتا ہے گمراہ کر دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے اسے سیدھی راہ پر لگا دیتا ہے۔ ۳۷-۳۹

کہہ دو، بتاؤ، اگر تم پر اللہ کا عذاب آجائے یا قیامت آدھمکے تو کیا تم اللہ کے سوا کسی اور کو پکارو گے، اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو؟ بلکہ اسی کو پکارو گے تو وہ دُور کر دیتا ہے اس مصیبت کو جس کے لیے تم اس کو پکارتے ہو اگر چاہتا ہے اور جن کو تم شریک ٹھہراتے ہو ان کو بھول جاتے ہو۔ ۴۰-۴۱

اور ہم نے تم سے پہلے بھی بہت سی اُمتوں کے پاس اپنے رسول بھیجے پس ان کو مالی اور جسمانی تکالیف میں مبتلا کیا تاکہ وہ خدا کے آگے جھکیں تو کیوں جب ہماری پکڑ آئی وہ خدا کی طرف نہ جُھکے بلکہ ان کے دِل سخت ہو گئے اور شیطان نے ان کی نگاہوں

میں اسی عمل کو گھبا دیا جو وہ کرتے رہے تھے تو جب انھوں نے فراموش کر دیا اس چیز کو جس سے ان کو یاد دہانی کی گئی تو ہم نے ان پر ہر چیز کے دروازے کھول دیے یہاں تک کہ جب وہ اس چیز پر اترانے لگے جو انھیں دی گئی تو ہم نے ان کو دفعتہً پکڑ لیا، وہ بالکل ہک دک رہ گئے۔ پس ان لوگوں کی جڑ کاٹ دی گئی جنھوں نے ظلم کا ارتکاب کیا۔ اور شکر کا سزاوار حقیقی اللہ ہے تمام عالم کا رب! ۴۵

کہو، بتاؤ، اگر اللہ تمھارے سمع و بصر کو سلب کر لے اور تمھارے دلوں پر مہر کر دے تو اللہ کے سوا کون معبود ہے جو اس کو واپس لا دے، دیکھو، کس طرح ہم اپنی آیتیں مختلف پہلوؤں سے پیش کرتے ہیں، پھر بھی وہ اعراض کر رہے ہیں۔ پوچھو، بتاؤ کہ اگر اللہ کا عذاب تم پر بے خبری میں اچانک آ دھمکے یا ڈنکے کی چوٹ آئے تو ظالموں کے سوا اور کون ہلاک ہوگا؟ اور ہم رسولوں کو تو صرف خوش خبری دینے والے اور خبردار کرنے والے ہی بنا کر بھیجتے ہیں تو جو ایمان لائے اور جنھوں نے اصلاح کر لی تو ان کو نہ کوئی خوف ہوگا، نہ کوئی غم ہوگا۔ اور جنھوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا ان کی نافرمانی کی پاداش میں ان کو عذاب پکڑے گا۔ ۴۶-۴۹

کہہ دو، میں تمھارے سامنے یہ دعویٰ نہیں کرتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں۔ اور نہ میں غیب جانتا اور نہ یہ دعویٰ کرتا کہ میں کوئی فرشتہ ہوں۔ میں تو صرف اس وحی کی پیروی کرتا ہوں جو مجھ پر آتی ہے۔ کہہ دو، کیا اندھے اور بینا دونوں یکساں ہو جائیں گے؟ کیا تم غور نہیں کرتے؟ ۵۰

۵- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

قَدْ نَعْلَمُ اِنَّهٗ لَيَحْزُنُكَ الَّذِيْ يَقُوْلُوْنَ فَاِنَّهُمْ لَا يُكَذِّبُوْنَكَ وَلٰكِنَّ الظّٰلِمِيْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ ۝ وَلَقَدْ كُذِّبَتْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ فَصَبَرُوْا عَلٰى مَا كُذِّبُوْا وَاُوْذُوْا حَتّٰۤى اَتٰىهُمْ نَصْرُنَا وَلَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ وَلَقَدْ جَآءَكَ مِنْ نَّبَاِی الْمُرْسَلِيْنَ (۳۳-۳۴)

زبان کا ایک اسلوب / **کفار کے مطالبات سے بے اعتنائی کی حکمت**

قَدْ نَعْلَمُ اِنَّهٗ لَيَحْزُنُكَ الَّذِيْ يَقُوْلُوْنَ، بقرہ کی تفسیر میں ہم واضح کر چکے ہیں کہ جب مضارع پر اس طرح قد آتا ہے تو وہ پتہ دیتا ہے کہ یہاں فعل ناقص محذوف ہے۔ گویا قَدْ نَعْلَمُ اصل میں قَدْ کُنَّا نَعْلَمُ ہے جس سے مضمون میں یہ اضافہ ہو جائے گا کہ یہ بات برابر خدا کے علم میں رہی ہے اور ہے۔ وہ اس سے کبھی بے خبر نہیں ہُوا کہ جو کچھ یہ ہٹ دھرم منکرین و مکذبین کہتے ہیں اس سے تمھیں غم پہنچتا ہے۔ "جو کچھ کہتے ہیں" سے مراد اسی طرح کی باتیں ہیں جن کی طرف آیت ۸ میں اشارہ گزر چکا ہے یا آگے آیات ۳۷، ۵۰ میں آ رہا ہے کہ اگر یہ خدا کے فرستادہ ہیں تو یہ کوئی معجزہ کیوں نہیں دکھاتے، ان پر ان کی صداقت کی منادی کے لیے کوئی فرشتہ کیوں نہیں اترتا، یہ آسمان سے براہِ راست کوئی کتاب ما بین الدفتین اترتی کیوں نہیں دکھاتے، یہ کسی خزانے کے مالک کیوں نہ ہوئے، جس عذاب کے ڈراوے سنا رہے ہیں اس کا کوئی نمونہ کیوں نہیں دکھاتے۔ وغیرہ وغیرہ۔ فرمایا کہ یہ سب باتیں ہم جانتے، دیکھتے، سنتے رہے ہیں تو پھر علم اور قدرت کے باوجود اگر ہم نے ان کا کوئی نوٹس نہیں لیا تو اطمینان رکھو ہم نے اسی میں حکمت اور بہتری سمجھی۔

نبیؐ کے لیے تسلی کا ایک دلنواز پیرایہ

'فَاِنَّهُمْ لَا يُكَذِّبُوْنَكَ وَلٰكِنَّ الظّٰلِمِيْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ' یہ تسکین و تسلی کا نہایت دلنواز جملہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب ہم نے علم اور قدرت کے باوجود ان کی ان خرافات کا کوئی نوٹس نہیں لیا تو تم بھی صبر کرو، یہ تمھاری تکذیب تو نہیں ہو رہی ہے بلکہ یہ ظالم تو اللہ کی آیات کا انکار کر رہے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اس تمام خاکبازی اور اس تمام استہزا کے ہدف تنہا تمھی تو نہیں ہو، اصل ہدف تو ہم اور ہماری کتاب ہے، پھر تم اپنے دل کو آزردہ کیوں کرو، معاملے کو ہم پر چھوڑ دو۔ ساتھ ہی ان کے لیے 'ظالمین' کا لفظ استعمال کر کے یہ اشارہ بھی فرما دیا کہ اس سے نقصان کسے پہنچ رہا ہے؟ خود انھی کو۔ یہ بدقسمت اور نامراد لوگ خود اپنی ہی جانوں پر ظلم ڈھا رہے ہیں۔ نہ تمھارا کچھ بگاڑ رہے ہیں، نہ خدا کا۔

نصرتِ الٰہی کے ظہور کے لیے سنتِ الٰہی

'وَلَقَدْ كُذِّبَتْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ' یہ اسی تسکین و تسلی کے مضمون کی تائید و تقویت کے لیے اس سنت اللہ کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیاء اور ان کی امتوں کے امتحان کے لیے پسند فرمائی ہے۔ وہ یہ کہ انبیا اور ان کے ساتھیوں کو اللہ تعالیٰ کی براہِ راست مدد سے ہمکنار ہونے کے لیے ابتلاء و امتحان کے ایک طویل اور صبر آزما مرحلے سے گزرنا پڑتا ہے۔ اس کے بغیر خدا کی نصرت ظاہر نہیں

ہوتی ۔ اس دوران میں ان انبیاء کی قوموں کی طرف سے برابر ان کی تکذیب ہوتی ہے ۔ ان کو ہر قسم کی ایذائیں دی جاتی ہیں اور ہر پہلو سے ان کو زچ کرنے کی کوشش کی جاتی ہے ۔ اس طرح جو کچھ حق کے مخالفین کے اندر ہوتا ہے وہ بھی اُبھر کر باہر آجاتا ہے اور جو جوہر نبی اور اس کے ساتھیوں کے اندر ہوتا ہے وہ بھی نکھر کے سامنے آجاتا ہے ۔ یہ وقت ہوتا ہے کہ منکرین حق پر خدا کی حجت تمام ہو جاتی ہے اور نبی اور ان کے ساتھی سزاوار ہوتے ہیں کہ ان کے لیے اللہ کی مدد ظاہر ہو ۔ یہ اللہ کی مقرر کی ہوئی سنت ہے اور اللہ کی سنت کو کوئی تبدیل نہیں کر سکتا ۔ تمام رسولوں کی سرگزشتیں اس سنت اللہ پر شاہد ہیں اور تمھیں ان سرگزشتوں کا کچھ حصہ سنایا بھی جا چکا ہے جس سے تم پر اس حقیقت کو واضح کرنا مقصود ہے کہ جس طرح کے حالات سے انھیں گزرنا پڑا ہے اسی طرح کے حالات سے تمھیں بھی گزرنا ہے ۔

وَاِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَيْكَ اِعْرَاضُهُمْ فَاِنِ اسْتَطَعْتَ اَنْ تَبْتَغِيَ نَفَقًا فِي الْاَرْضِ اَوْ سُلَّمًا فِي السَّمَآءِ فَتَاْتِيَهُمْ بِاٰيَةٍ ۭ وَلَوْ شَاۗءَ اللّٰهُ لَجَمَعَهُمْ عَلَي الْهُدٰى فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ ۝ اِنَّمَا يَسْتَجِيْبُ الَّذِيْنَ يَسْمَعُوْنَ ۭ وَالْمَوْتٰى يَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ ثُمَّ اِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ (۳۵-۳۶)

'وَاِنْ كَانَ ..... فَتَاْتِيَهُمْ بِاٰيَةٍ' ۔ اس جملہ میں جواب شرط محذوف ہے اور فصیح عربی میں جواب شرط کا حذف ایک معروف بات ہے ۔ قرآن میں اس کی نظیریں بہت ہیں ۔ ترجمہ میں ہم نے اس کو کھول دیا ہے ۔

نبی ہر پہلو سے کسوٹی ہوتا ہے

جہل کے لفظ پر ہم دوسرے مقام میں تفصیل کے ساتھ بحث کر کے بتا چکے ہیں کہ عربی میں یہ لفظ علم اور حلم دونوں کے ضد کی حیثیت سے آتا ہے بلکہ اس کا غالب استعمال 'حلم' کے ضد کی حیثیت ہی سے ہے اسی وجہ سے اس کے معنی ہوتے ہیں جذبات سے مغلوب ہو جانا ۔ حضرات انبیاء علیہم السلام اپنی طہارت فطرت کے سبب سے جذبات نفس اور خواہشات نفس سے تو کبھی مغلوب نہیں ہوتے لیکن جذبات خیر میں سے کسی جذبہ کا غلبہ ان پر بھی کبھی کبھی اتنا ہو جاتا ہے جو حد مطلوب سے زیادہ ہوتا ہے ۔ اگرچہ یہ بجائے خود نہایت اعلیٰ بات ہے لیکن حضرات انبیا چونکہ معیار اور کسوٹی ہوتے ہیں اس وجہ سے اللہ تعالیٰ اس پہلو میں بھی ان کو حد مطلوب سے آگے نہیں بڑھنے دیتا ۔ اس کو مثال سے یوں سمجھیے کہ نبی کے اندر اس بات کی شدید آرزو ہوتی ہے کہ اس کی قوم ایمان لائے تاکہ وہ عذاب الٰہی سے بچ جائے ۔ یہ جذبہ نبی کی رافت و رحمت کی دلیل اور اس کی غیرت حق کی شہادت ہے لیکن یہ جذبہ بھی مطلوب اسی حد تک ہے جس حد تک اللہ تعالیٰ کی اس سنت سے ہم آہنگ ہے جو لوگوں کے کفر و ایمان کے معاملے میں اللہ تعالیٰ نے پسند فرمائی ہے اور جس کی طرف آیت ۳۴ میں اشارہ گزرا ۔ اگر اس حد سے اس کے آگے بڑھنے کے آثار ظاہر ہوتے ہیں تو اللہ تعالیٰ اپنے پیغمبر کو اس سے روک دیتا ہے ۔

اِنَّمَا يَسْتَجِيْبُ الَّذِيْنَ يَسْمَعُوْنَ وَالْمَوْتٰى ..... ، يَسْمَعُوْنَ ، یہاں اپنے حقیقی معنی میں ہے یعنی جو سنتے

اور سمجھتے ہیں۔ جو سنتے ہیں اور سمجھتے نہیں ان کا سننا اور نہ سننا دونوں برابر ہے۔ 'موتیٰ' سے مراد یہاں عقل اور دل کے مردے ہیں اس لیے کہ زندگی درحقیقت عقل اور دل ہی کی زندگی ہے۔ ع مردہ دل خاک جیا کرتے ہیں۔

نبیؐ کے لیے محبت آمیز عتاب

ان آیات میں بظاہر نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر عتاب ہے لیکن یہ عتاب بڑا محبت آمیز عتاب ہے اور اگر اس میں کوئی تلخی اور ترشی ہے تو اس کا رُخ تمام تر ان ضدیوں اور ہٹ دھرموں کی طرف ہے جن کے ایمان کی آرزو پیغمبرؐ کے اندر اتنی شدید تھی کہ آپ ان میں سے کسی کو بھی ایمان سے محروم دیکھنے پر راضی نہ تھے اور چاہتے تھے کہ ان کو ان کی طلب کے مطابق کوئی نہ کوئی معجزہ دکھا ہی دیا جائے کہ ان کے پاس کوئی عذر باقی نہ رہے۔ فرمایا کہ اگر ان کا ایمان نہ لانا تم پر اتنا ہی شاق گزر رہا ہے تو تم زمین کے اندر کوئی سرنگ یا آسمان میں کوئی سیڑھی تلاش کر کے ان کی طلب کے مطابق کوئی معجزہ لا سکو تو لا دو۔ ہم تو معجزوں کے بل پر دلوں کے اندر ایمان اتارنے کے حق میں نہیں ہیں۔ ہم نے تو ایمان کے لیے جو راہ پسند کی ہے وہ یہ ہے کہ لوگ اپنے کان، آنکھ اور عقل و ادراک کو استعمال کریں، آفاق و انفس کے دلائل پر غور کریں، پیغمبر کی باتیں سنیں، سوچیں اور سمجھیں اور اپنے اختیار و ارادہ سے ایمان کی راہ اختیار کریں۔ اگر جبر اور زور سے لوگوں کو ہدایت پر جمع کر دینا ہوتا تو ہمارے لیے یہ کیا مشکل کام تھا۔ ہم چشم زدن میں سب کو ایمان و ہدایت کی راہ پر چلا دیتے۔ تو تم ان کے ایمان کی آرزو میں اتنے جذبات سے مغلوب نہ ہو جاؤ کہ اس باب میں جو اللہ کی حکمت اور سنت ہے وہ نگاہوں سے اوجھل ہو جائے۔

اس کے بعد فرمایا کہ تمہاری دعوت تو وہی قبول کریں گے جو سننے سمجھنے والے ہیں اور جن کے دل زندہ ہیں، جو گونگے بہرے ہیں اور جن کے دل مردہ ہو چکے ہیں ان کو بس اللہ کے حوالے کرو، جب یہ قیامت کو اٹھیں گے تو ان پر سارے حقائق کھل جائیں گے۔ ان کے پیچھے تم اپنے کو مبتلائے غم نہ کرو۔

وَقَالُوا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ قُلْ اِنَّ اللّٰهَ قَادِرٌ عَلٰٓى اَنْ يُّنَزِّلَ اٰيَةً وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِى الْاَرْضِ وَلَا طٰٓئِرٍ يَّطِيْرُ بِجَنَاحَيْهِ اِلَّآ اُمَمٌ اَمْثَالُكُمْ ؕ مَا فَرَّطْنَا فِى الْكِتٰبِ مِنْ شَىْءٍ ثُمَّ اِلٰى رَبِّهِمْ يُحْشَرُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا صُمٌّ وَّبُكْمٌ فِى الظُّلُمٰتِ ؕ مَنْ يَّشَاِ اللّٰهُ يُضْلِلْهُ ؕ وَمَنْ يَّشَاْ يَجْعَلْهُ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ (۳۷-۳۹)

نشانیٔ عذاب کا مطالبہ اور اس کا جواب

وَقَالُوا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ، اس سے مراد لیں تو ان نشانیوں میں سے کوئی نشانی بھی ہو سکتی ہے جن کا کفار کی طرف سے مطالبہ تھا لیکن قرینہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں ان لوگوں کو جواب دیا جا رہا ہے جو کسی ایسی نشانیٔ عذاب کا مطالبہ کر رہے تھے جو یہ ثابت کر دے کہ اگر انھوں نے پیغمبر کی تکذیب کی تو ان پر عذاب آ جائے گا۔ آگے کی آیات سے بالتدریج یہ قرینہ خود بخود ابھر کر

سامنے آجائے گا اس وجہ سے دلائل کے ذکر کی ضرورت نہیں ہے۔ اس سورہ میں بھی اور قرآن کے دوسرے مقامات میں بھی کفار کا یہ مطالبہ اپنے اپنے زمانے کے پیغمبروں سے نقل ہوا ہے کہ اگر تم اپنے اس دعوے میں سچے ہو کہ ہم نے تمھاری تکذیب کی تو ہم پر عذاب آجائے گا تو اس عذاب کا کوئی نمونہ ہمیں دکھا دو جس کی دھمکی سنا رہے ہو، بس اسی سے ہمارے اور تمھارے جھگڑے کا فیصلہ ہو جائے گا۔

قُلْ اِنَّ اللّٰهَ قَادِرٌ عَلٰٓى اَنْ يُّنَزِّلَ اٰيَةً وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ۔ فرمایا کہ خدا تو اس طرح کا کوئی نشان دکھا دینے پر ہر وقت قادر ہے لیکن ان میں سے اکثر لوگ جانتے نہیں: اکثر لوگ جانتے نہیں" بظاہر نہایت مجمل جواب ہے لیکن اس اجمال کے اندر بڑی تفصیل پوشیدہ ہے۔ اس سے ایک تو یہ بات نکلتی ہے کہ یہ نادان اور مغرور لوگ اس طرح کی نشانی کے ظہور کے نتائج سے آگاہ نہیں۔ ان کے نزدیک یہ محض ایک کھیل تماشہ ہے حالانکہ یہ نشانی اگر ظاہر ہو گئی تو سب کی کمر توڑ کر رکھ دے گی۔ دوسری یہ کہ یہ خدا کی اس حکمت اور سنت سے واقف نہیں ہیں جو انبیا اور ان کے مکذبین کے معاملے میں اللہ تعالیٰ نے پسند فرمائی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا طریقہ یہ نہیں ہے کہ وہ اپنے رسولوں کی تکذیب کرنے والوں کو فوراً پکڑ لے بلکہ وہ ان کو ایک خاص مدت تک مہلت دیتا ہے جس میں ان پر ہر پہلو سے خدا کی حجت پوری کر دی جاتی ہے۔ جب یہ حجت پوری ہو چکتی ہے تب خدا ان کو پکڑتا ہے اور جب پکڑتا ہے تو پھر ان کو کوئی چھڑا نہیں سکتا۔ تیسری یہ کہ وہ سمجھ رہے ہیں کہ پیغمبر کی دھمکی جھوٹی ہے یا خدا کے ہاتھ ہی بے بس ہیں حالانکہ خدا سرکشوں کو جو ڈھیل پر ڈھیل دیتا ہے تو اس وجہ سے کہ اس کی تدبیر بڑی محکم ہوتی ہے۔ وہ رسی کتنی ہی دراز کر دے لیکن اس کا کوئی امکان نہیں ہوتا کہ کوئی اس کے قابو سے باہر نکل سکے۔ چوتھی یہ کہ یہ بدبخت لوگ اس رحمت سے ناآشنا ہیں جو اس مہلت کے اندر مضمر ہے بشرطیکہ اس سے فائدہ اٹھائیں۔ اللہ تعالیٰ رحمت میں سبقت کرتا ہے، غضب میں سبقت نہیں کرتا۔ وہ اپنے بندوں پر بڑا مہربان ہے۔ وہ توبہ اور اصلاح کے دروازے اس وقت تک کھلے رکھتا ہے جب تک بندے اپنی ضد اور ہٹ دھرمی سے خود ان کو اپنے اوپر بند نہ کر لیں۔

حذف کے بعض اسلوب

وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِى الْاَرْضِ وَلَا طٰٓئِرٍ يَّطِيْرُ بِجَنَاحَيْهِ اِلَّآ اُمَمٌ اَمْثَالُكُمْ اس ٹکڑے میں حذف کا وہی اصول ملحوظ ہے جو سورۂ نساء کی آیت ۱۲۴ میں ہے۔ یعنی جملے میں مقابل کے بعض الفاظ حذف ہو گئے ہیں اس لیے کہ مذکور محذوف پر خود دلیل بن گیا ہے۔ مثلاً جملہ کے پہلے حصہ میں فِى الْاَرْضِ کا لفظ ہے تو دوسرے حصے میں فِى السَّمَآءِ کا لفظ حذف ہو گیا ہے۔ اسی طرح دوسرے حصے میں يَطِيْرُ بِجَنَاحَيْهِ کے الفاظ ہیں تو پہلے حصے میں تَدُبُّ عَلٰى رِجْلَيْهَا یا عَلٰٓى اَرْجُلِهَا کے الفاظ حذف ہو گئے ہیں۔ فصیح عربی میں اس طرح کا حذف معروف ہے لیکن اردو میں یہ اسلوب نہیں ہے۔ ہمارے نزدیک اس طرح کے مواقع میں محذوف کو کھول دینا زیادہ بہتر ہے ورنہ یا تو پوری بات ادا نہیں ہو پاتی یا جملہ کا

دروبست ٹھیک نہیں ہوتا چنانچہ ہم نے ترجمہ میں اس کو کھول دیا ہے۔

آفاق کی نشانیوں کی طرف اشارہ

اِلَّآ اُمَمٌ اَمْثَالُكُمْ کے الفاظ تو بظاہر نہایت مجمل ہیں لیکن غور کیجیے تو ان میں بڑی تفصیل پوشیدہ ہے۔ نشانیاں مانگنے والوں کو یہ آفاق کی نشانیوں کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ تم کوئی ایک نشانی مانگتے ہو، خدا کی تو یہ پوری کائنات نشانیوں سے بھری پڑی ہے، زمین پر چلنے والا ہر جاندار اور فضا میں اڑنے والا ہر پرندہ خدا کی ایک نشانی ہے۔ غور کرو تو تم دیکھ سکتے ہو کہ جس طرح تمھارے انفرادی اور اجتماعی وجود کے اندر خدا کی قدرت، حکمت، ربوبیت کی بے شمار نشانیاں ہیں جو تم پر توحید، جزا و سزا اور پیغمبر کی دعوت کی صداقت کی گواہی دے رہی ہیں اسی طرح اس کائنات کی دوسری مخلوقات کے اندر بھی خالق کی قدرت حکمت اور ربوبیت کے دلائل موجود ہیں، جس طرح تم ایک نوع ہو اسی طرح یہ بھی الگ الگ نوعیں ہیں، جس طرح تم ایک فطرت رکھتے ہو، اسی طرح یہ بھی اپنی ایک مخصوص جبلت رکھتے ہیں، جس طرح تم شعور، ادراک اور جذبات رکھتے ہو اسی طرح اپنے جبلی تقاضوں اور اپنے منشائے تخلیق کے اعتبار سے یہ بھی اپنے اندر شعور، ادراک اور جذبات رکھتے ہیں، جس طرح تمھارے اجتماعی شعور نے تمھیں اس بات پر آمادہ کیا ہے کہ تم اپنے آپ کو ایک سیاسی نظام کے اندر باندھ کر رکھو اسی طرح ان کی ہر نوع کے اندر بھی اپنی اجتماعی ہستی کا ایک شعور ہے جو انھیں آمادہ کرتا ہے کہ یہ ایک وحدت کے اجزا کی طرح اپنے اجتماعی وجود کے بقا و تحفظ کا سامان کریں اور اپنے نوعی مقصد تخلیق کی تکمیل میں ان کا ہر فرد اپنا حصہ ادا کرے۔ سورۂ نحل میں قرآن نے اسی حقیقت کے ثبوت میں، جس کی طرف یہاں اشارہ ہے، شہد کی مکھی کا ذکر فرمایا ہے اور اس کے نوعی نظام میں خالق کی قدرت، حکمت اور ربوبیت کے جو آثار نمایاں ہیں ان کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ آج سائنس نے حیوانات کی مختلف انواع کے جبلی خصائص و عجائب سے جو پردے اٹھائے ہیں یوں تو ان میں سے ہر انکشاف انسان کو حیران کر دینے کے لیے کافی ہے لیکن نہایت حقیر اور چھوٹی چیزوں میں سے شہد کی مکھی اور چیونٹی ہی کو لیجیے اور ان کا مشاہدہ کیجیے تو آپ کی عقل دنگ رہ جائے گی۔ ان کے اندر اولاد کی پرورش کا کیسا انتظام ہے، خطرات سے بچاؤ کے لیے کیسی بیداری ہے، مستقبل کے حالات سے عہدہ برآ ہونے کے لیے کیسی پیش بینی ہے، جماعتی فرائض کا کیسا شدید احساس ہے، کیسی اعلیٰ تقسیم کار ہے، کس درجہ مضبوط نظام امر و طاعت ہے، ضروریات کی فراہمی کے لیے کیسی انتھک سرگرمی ہے، رہائش اور اپنے ذخائر کی حفاظت کے لیے تعمیر کا کیسا کمال فن ہے، تلاش و جستجو کا کیسا عمیق جذبہ اور حصولِ مطلوب کے لیے کیسی زیرکی و ہوشیاری اور پھر کتنی جان بازی و قربانی ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ کیا یہ سب کچھ آپ سے آپ وجود میں آگیا ہے اور اپنے ہی بل پر چل رہا ہے یا اس کے پیچھے کوئی خالق و مدبر ہے؟ اگر اس کے پیچھے کوئی خالق و مدبر ہے تو کیا وہ سب کچھ بنا کر ایک گوشہ میں بے تعلق ہو کر بیٹھ گیا ہے یا براہِ راست اس پوری کائنات کی حفاظت فرما رہا ہے، کیا یہ

سب کچھ کسی اندھی بہری قوتِ قاہرہ کا ظہور ہے یا کسی قادر و قیوم، علیم و حکیم اور رحمان و رحیم ہستی کی قدرت و رحمت کا فیضان ہے؟ کیا یہ مختلف ارادوں، متضاد قوتوں اور بے شمار دیویوں، دیوتاؤں کی ایک رزم گاہ ہے یا ایک ہی خدائے وحدہٗ لاشریک کی قدرت و حکمت اور اس کی رحمت و ربوبیت کی ایک جلوہ گاہ ہے؟ کیا یہ سارا کارخانہ بالکل بے مقصد، بے غایت اور بے انجام نظر آتا ہے یا اس کی ایک ایک چیز پکار پکار کر شہادت دے رہی ہے کہ اس کے پیچھے ایک عظیم غایت ہے جس کا ظہور قطعی اور یقینی ہے؟ کیا اس کے ظاہر و باطن سے یہ شہادت مل رہی ہے کہ انسان اس کے اندر شتر بے مہار بنا کر چھوڑ دیا گیا ہے کہ کھائے پیے، عیش کرے اور ایک دن ختم ہو جائے یا اس سے یہ شہادت مل رہی ہے کہ جس قادر نے یہ دنیا بنائی ہے، جس حکیم نے اس کے ایک ایک ذرّے میں اپنی حکمت کی شان دکھائی ہے، جس رحیم نے اپنی ربوبیت و رحمت کے یہ خوانِ نعمت بچھائے ہیں وہ ایک دن سب کو ضرور اکٹھا کرے گا اور ہر ایک کی نیکی بدی کو ضرور تولے گا اور پھر اس کے مطابق اس کے ساتھ معاملہ کرے گا

انسان کی فطرت اگر مسخ اور اس کی عقل اگر مفلوج نہ ہو گئی ہو تو وہ اس اعتراف پر مجبور ہے کہ ان سب باتوں میں سے دوسری ہی بات صحیح ہے۔ اگر یہی بات صحیح ہے اور بدیہی طور پر یہی صحیح ہے تو قرآن اسی کو ماننے کی دعوت دے رہا ہے۔ پھر اس کو ماننے کے لیے کسی معجزے کی کیا ضرورت ہے؟ اس حقیقت کی شہادت تو اس کائنات کا ذرّہ ذرّہ دے رہا ہے۔ زمین پر چلنے والا ہر جاندار اور فضا میں اڑنے والا ہر پرندہ اس کا گواہ ہے۔ اگر انسان اپنے وجود کے اندر کی شہادتوں سے آنکھیں بند کیے ہوئے ہے تو باہر کی ان نشانیوں ہی کو آنکھیں کھول کر دیکھ لے جو نیچے بھی موجود ہیں اور اوپر بھی۔

قرآن دلائل کا خزانہ ہے

'مَا فَرَّطْنَا فِي الْكِتٰبِ مِنْ شَيْءٍ ثُمَّ اِلٰى رَبِّهِمْ يُحْشَرُوْنَ' میں عام طور پر لوگوں نے 'کتاب' سے وہ خدائی رجسٹر مراد لیا ہے جس میں سب کچھ مندرج ہے۔ اگرچہ یہ مفہوم لینے کی بھی گنجائش ہے لیکن سیاق و سباق کی روشنی میں ہمارا ذہن بار بار اس طرف جاتا ہے کہ یہاں 'الکتاب' سے مراد قرآن مجید ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جس طرح یہ کائنات ان نشانیوں سے مملو ہے جو پیغمبر کی دعوت کی حقانیت کی شاہد ہیں اسی طرح ہم نے قرآن میں بھی اپنے دلائل و براہین بیان کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے۔ ایک ایک دعوے کو ایسے ناقابلِ انکار دلائل سے ثابت کیا ہے اور اتنے مختلف اسلوبوں اور پہلوؤں سے حجت قائم کی ہے کہ صرف عقل و دل کے اندھے اور بہرے ہی ان کے سمجھنے سے قاصر رہ سکتے ہیں۔ اس کے ساتھ 'ثُمَّ اِلٰى رَبِّهِمْ يُحْشَرُوْنَ' کے الفاظ میں یہ لطیف تعریض ہے کہ جہاں تک نشانیوں اور دلائل کا تعلق ہے ان سے تو یہ صحیفۂ کائنات بھی مملو ہے اور یہ صحیفۂ قرآن بھی معمور ہے لیکن جو کسی بات کو سمجھنا ہی نہ چاہیں ان کا کیا علاج؟ یہ تو اب اپنے رب کے سامنے جب حاضر کیے جائیں گے تب ہی آنکھیں کھولیں گے اور مانیں گے۔

قرآن کو جھٹلانے والوں کی مثال

'وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا صُمٌّ وَّبُكْمٌ فِي الظُّلُمٰتِ'، 'بِاٰيٰتِنَا' میں 'آیات' سے مراد

قرآن مجید کی آیات ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جو لوگ قرآن کو جھٹلا رہے ہیں ان کی مثال ایسے گونگے اور بہرے لوگوں کی ہے جو گونگے بہرے ہونے کے ساتھ تاریکی میں گھرے ہوئے بھی ہیں، نہ سن سکتے ہیں نہ کسی کو پکار سکتے نہ کسی پکارنے والے کی بات کا جواب دے سکتے نہ کسی کے اشارے کو دیکھ سکتے، نہ کسی نشانی سے رہنمائی حاصل کر سکتے۔ ایسے اندھے بہرے لوگوں کا کیا علاج؟

ہدایت ان کو ملتی ہے جو اپنی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھاتے ہیں

'مَنْ يَّشَاِ اللّٰهُ يُضْلِلْهُ الاية' میں جیسا کہ ہم مختلف مواقع میں واضح کر چکے ہیں، اس سنت اللہ کی طرف اشارہ ہے جس کے تحت کسی کو ہدایت کی توفیق ملتی ہے اور کوئی گمراہی کا سزاوار قرار پاتا ہے۔ اوپر کی آیات سے یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ جو لوگ اپنی آنکھیں اور اپنے کان نہیں کھولتے خدا ان کے اندر زبردستی اپنی ہدایت نہیں اتارتا۔ خدا کی توفیق صرف ان کو سہارا دیتی ہے جو راہِ حق پر چلنے کا خود ارادہ کرتے ہیں اور خدا کی بخشی ہوئی صلاحیتوں سے کام لیتے ہیں۔

اجزا کی اس تشریح سے آیات کا مفہوم اور نظم خود بخود واضح ہو گیا ہے۔ سورہ نحل میں یہ مضمون مختلف پہلوؤں سے زیر بحث آئے گا۔ اس وجہ سے ہم یہاں اتنے ہی پر اکتفا کرتے ہیں۔

قُلْ اَرَءَيْتَكُمْ اِنْ اَتٰىكُمْ عَذَابُ اللّٰهِ اَوْ اَتَتْكُمُ السَّاعَةُ اَغَيْرَ اللّٰهِ تَدْعُوْنَ ۚ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝ بَلْ اِيَّاهُ تَدْعُوْنَ فَيَكْشِفُ مَا تَدْعُوْنَ اِلَيْهِ اِنْ شَآءَ وَتَنْسَوْنَ مَا تُشْرِكُوْنَ (۴۰-۴۱)

اَرَءَيْتَكُمْ اور اَرَءَيْتَكُمْ کا محل استعمال اور مفہوم ایک ہی ہے۔ چنانچہ آگے آیت ۴۶ میں بالکل اسی محل میں اَرَءَيْتُمْ آیا ہے۔

توحید کی ایک انفسی دلیل

یہ مطالبۂ نشانیٔ عذاب کا جواب بھی ہے اور انسانی فطرت کے ایک خاص پہلو سے توحید کی ایک ناقابلِ تردید انفسی دلیل بھی۔ مطلب یہ ہے کہ ان سے کہو کہ اس طنطنہ کے ساتھ جو عذاب کا مطالبہ کر رہے ہو تو اس کے مقابلہ یا اس سے بچاؤ کا کیا سامان کر رکھا ہے؟ کون سی ناقابلِ تسخیر دفاعی لائن تم نے بنا لی ہے کہ اس زعم کے ساتھ خدا کو چیلنج کر رہے ہو؟ فرض کرو، جس عذاب کا مطالبہ کر رہے ہو خدا وہی بھیج دیتا ہے یا جس قیامت سے تمھیں خبردار کیا جا رہا ہے وہی آ دھمکتی ہے تو کون ہے جس کو اپنی مدد کے لیے پکارو گے؟ کیا خدا کے سوا کوئی اور ہے جس کو پکارو گے اگر تم اپنے اس دعوے میں سچے ہو کہ اس کے کچھ دوسرے شریک بھی ہیں؟ فرمایا کہ تمھارا یہ دعویٰ بالکل بے بنیاد ہے۔ اگر ایسا وقت آ گیا تو تم خدا کے سوا سب کو بھول جاؤ گے اور صرف اسی کو پکارو گے اور وہی ہے جو اس مصیبت کو اگر چاہے گا تو دور کرے گا۔

اوپر والی آیات میں جیسا کہ ہم نے بیان کیا، توحید کے آفاقی دلائل کی طرف اشارہ تھا، یہاں توحید کی اس انفسی دلیل کی طرف اشارہ ہے جو قرآن میں مختلف اسلوبوں سے بیان ہوئی ہے۔ اس دلیل کا بنیادی نقطہ یہ ہے کہ انسان کی اصل فطرت میں چونکہ ایک ہی خدا کی شہادت موجود ہے، دوسرے اصنام و الٰہ، جن کو وہ مانتا ہے، ان کی کوئی شہادت اس کی فطرت کے باطن میں موجود نہیں ہوتی بلکہ وہ محض خیالی

ہوتے ہیں، اس وجہ سے جب اس کی زندگی میں کوئی ایسا مرحلہ آجاتا ہے جو اصل آزمائش کا ہوتا ہے تو انسان اپنے ان تمام فرضی سہاروں کو بھول جاتا ہے، صرف اسی خدا کو پکارتا ہے جس کی شہادت وہ اپنی فطرت میں پاتا ہے۔ قرآن نے اس حقیقت کو نہایت دل آویز تمثیلوں اور نہایت حقیقت افروز دلائل سے واضح کیا ہے۔ آگے یہ ساری چیزیں زیر بحث آئیں گی اس وجہ سے یہاں ہم صرف اشارے پر کفایت کرتے ہیں۔[1]

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَآ اِلٰٓى اُمَمٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَاَخَذْنٰهُمْ بِالْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ لَعَلَّهُمْ يَتَضَرَّعُوْنَ ۝ فَلَوْلَآ اِذْ جَآءَهُمْ بَاْسُنَا تَضَرَّعُوْا وَلٰكِنْ قَسَتْ قُلُوْبُهُمْ وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ اَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ ۭ حَتّٰٓى اِذَا فَرِحُوْا بِمَآ اُوْتُوْٓا اَخَذْنٰهُمْ بَغْتَةً فَاِذَا هُمْ مُّبْلِسُوْنَ ۝ فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ۭ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (۴۲-۴۵)

کسی قوم پر عذاب بھیجنے کے معاملہ میں سنت الٰہی

'وَلَقَدْ اَرْسَلْنَآ اِلٰٓى اُمَمٍ الایۃ'، 'تضرع' کے معنی تذلل کے ہیں یعنی خضوع و خشوع اور احساس عجز و فروتنی کے ساتھ کسی کی طرف جھکنا۔ یہاں یہ لفظ دل کی خشیت اور احساس عبدیت و انابت کے ساتھ خدا کی طرف جھکنے کے لیے آیا ہے۔ اس کا مقابل لفظ 'قساوت' استعمال ہوا ہے جو دل کی سختی، بے خوفی اور رعونت کی تعبیر کے لیے قرآن کا معروف لفظ ہے۔

اب یہ ایک سنت اللہ بیان ہوئی ہے جس سے ایک طرف تو یہ واضح کرنا مقصود ہے کہ کسی قوم پر جس میں اللہ تعالیٰ اپنا رسول بھیجتا ہے، عذاب بھیجنے کے معاملے میں وہ کیا طریقہ اختیار فرماتا ہے، دوسرے اس تاریخی شہادت کو سامنے لانا ہے کہ جس قوم نے بھی ایمان لانے کی شرط نشانیٔ عذاب کو ٹھہرایا اس کو ایمان کی سعادت حاصل نہیں ہوئی بلکہ بالآخر عذاب ہی کے ذریعہ سے اس کی جڑ کاٹ دی گئی۔ فرمایا کہ تم سے پہلے (خطاب نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے) ہم نے بہت سی قوموں کے پاس اپنے رسول بھیجے تو ان کو مختلف قسم کی مالی و جسمانی مصیبتوں میں مبتلا کیا تاکہ ان کے دلوں میں خدا کا خوف پیدا ہو اور وہ سوچیں کہ اگر انھوں نے نبی کی بات نہ مانی تو بالآخر خدا کی فیصلہ کن پکڑ آجائے گی اور وہ تباہ کر دیے جائیں گے لیکن دیکھ لو تاریخ شاہد ہے، کہ بجائے اس کے کہ ان خدائی تنبیہات سے ان کے دل کچھ نرم پڑتے وہ اور زیادہ سخت ہو گئے اور جن بداعمالیوں میں وہ مبتلا تھے شیطان نے ان کو ان کی نگاہوں میں اس طرح کھبا دیا کہ وہ ان سے باز آنے کے بجائے ان میں کچھ اور دلیر ہو گئے۔

'فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖ الایۃ'، 'مَا ذُكِّرُوْا بِهٖ' کے معنی ہوں گے جس چیز کے ذریعے سے ان کو یاددہانی کی گئی۔ یہاں اس سے اشارہ اسی باساء و ضراء یعنی مالی و جسمانی مصائب کی طرف ہے جن میں اللہ تعالیٰ نے ان کو اس لیے مبتلا کیا کہ وہ چیتیں کہ اگر انھوں نے پیغمبر کی بات نہ مانی تو ان تنبیہات کے بعد

---

[1] تفصیل کے طالب ہماری کتاب 'حقیقتِ شرک و توحید'۔ حصۂ توحید میں 'توحید کے انفسی دلائل' کا باب پڑھیں۔

اب آگے فیصلہ کن عذاب ہی کا مرحلہ ہے لیکن ان سے یہ سبق لینے کے بجائے انھوں نے اُن کے گزر جانے کے بعد ان کو نظر انداز کر دیا کہ قوموں کی زندگی میں اس طرح کے حوادث تو پیش آیا ہی کرتے ہیں، قحط، سیلاب، طوفان، وبا اور امراض سے کس قوم کو سابقہ نہیں پیش آیا ہے قَدْ مَسَّ آبَاءَنَا الضَّرَّاءُ وَالسَّرَّاءُ اس طرح کے نرم و گرم حالات تو ہمارے اگلوں کو بھی پیش آ چکے ہیں۔ پھر یہ کیوں فرض کیا جائے کہ یہ کسی شخص کی تکذیب کا نتیجہ ہے۔

فَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ أَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ حَتَّىٰ إِذَا فَرِحُوا بِمَا أُوتُوا أَخَذْنَاهُمْ بَغْتَةً اب یہ مذکورہ بالا سنۃ اللہ کا آگے کا مرحلہ بیان ہو رہا ہے جس کو قرآن کے دوسرے مقامات میں 'امہال' یعنی ڈھیل دینے سے تعبیر فرمایا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب پیغمبر کی تکذیب کرنے والے خدا کی تنبیہات کو نظر انداز کر دیتے ہیں تو خدا ان کی رسی دراز کر دیتا ہے، ان کی تمام مطلوبات کے دروازے ان پر کھول دیے جاتے ہیں، یہاں تک کہ وہ اپنی کامیابیوں پر مگن ہونے، اترانے اور اکڑنے لگتے ہیں۔ یہ وقت ان کے پیمانہ کے لبریز ہو جانے کا ہوتا ہے۔ اس وقت خدا دفعتہً ان کو پکڑتا ہے پھر وہ بالکل مایوس اور ششدر ہو کے رہ جاتے ہیں۔ 'ابلس' کے لفظ پر دوسرے مقام میں بحث ہو چکی ہے۔

کسی قوم کی جڑ کٹنے کے معنی

فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِينَ ظَلَمُوا وَالْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ، 'دابر' کے معنی اصل اور جڑ کے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جب مکذبین رسول اپنی بدمستی کی اس حد کو پہنچ جاتے ہیں تب ایسے ظالموں کی خدا جڑ کاٹ کے رکھ دیتا ہے۔ اس میں اس بات کی طرف نہایت لطیف اشارہ ہے کہ اس سے پہلے اس طرح کے مجرموں پر ابتلا کے جو جھونکے آتے ہیں ان سے ان کے شجر ہستی کے صرف برگ و بار متاثر ہوتے ہیں اور وہ بھی وقتی طور پر، ان کی جڑ محفوظ رہتی ہے لیکن جب یہ وقت آ جاتا ہے تو خدا ان پر عذاب بھیجتا ہے جو ان کے وجود قومی ہی کو جڑ پیڑ سے اکھاڑ کے پھینک دیتا ہے اس لیے کہ جو درخت زہریلا ہو چکا اور اب صرف زہریلے ہی پھل دے رہا ہے اس کا باقی رہنا اس دنیا کی مصلحت کے خلاف ہے جو اس کے رحمان و رحیم خالق و مالک نے اپنی رحمت اور اپنے عدل کے ظہور کے لیے بِالْحَقِّ پیدا کی ہے۔ وہ عالم کا رب ہے۔ رب کس طرح گوارا کر سکتا ہے کہ وہ اپنے چمن میں ایک ایسے درخت کو جگہ گھیرے رکھنے کے لیے چھوڑ دے جس کی زہریلی ہوا اور جس کے مسموم برگ و بار پورے چمن کو غارت کر کے رکھ دیں۔ پس حمد و شکر کا سزاوار ہے وہ رب العالمین جو ایسی نابکار قوموں کی جڑ کاٹ کے رکھ دیتا ہے۔

اجزا کی تشریح کے ذیل میں آیات کا نظم اور مدعا واضح ہو گیا ہے البتہ جس سنت اللہ کا یہاں حوالہ ہے اس کی تاریخی شہادت کی طرف یہاں صرف اشارہ ہے، اس کی تفصیل نہیں آئی ہے۔ یہ تفصیل آگے والی سورہ ——— اعراف ——— میں آئے گی جو اس سورہ کے، جیسا کہ ہم نے ذکر کیا، مثنیٰ کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس میں عرب کی پچھلی معذب قوموں کی تاریخ بیان ہوئی ہے جس سے یہ حقیقت پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ ان قوموں نے بھی

اپنے اپنے رسولوں سے عذاب کی نشانیوں کا مطالبہ کیا، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں کو نرم کرنے اور ان کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے ان کو مختلف مالی و جسمانی آزمائشوں میں مبتلا کیا لیکن انھوں نے ان سے سبق لینے کے بجائے ان کو اتفاقی حوادث پر محمول کر کے بالکل نظر انداز کر دیا۔ ان کی اس سرکشی کے بعد خدا نے ان کو پوری ڈھیل دے دی۔ ہر راہ میں ان کو کامیابی ہی کامیابی نظر آنے لگی۔ شیطان نے ان کو پٹی پڑھائی کہ جس راہ پر چل رہے ہو یہی کامیابی کی راہ ہے، شاباش، آگے بڑھے چلو۔ بالآخر جب ان کو ہر طرف ہرا ہی ہرا نظر آنے لگا اور کامیابیوں کے نشہ نے ان کو بدمست کر دیا تو دفعۃً خدا کے عذاب نے ان کو آ دبوچا اور ان کا سارا نشہ ہرن ہوگیا —— مطلب یہ ہے کہ یہی مرحلہ تمھارے جھٹلانے والوں اور تم سے عذاب کی نشانی مانگنے والوں کو بھی درپیش ہے۔ اگر انھوں نے حالات سے سبق نہ لیا تو وہی تاریخ یہ بھی دہرائیں گے تم مطمئن رہو۔

قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ اَخَذَ اللّٰهُ سَمْعَكُمْ وَاَبْصَارَكُمْ وَخَتَمَ عَلٰى قُلُوْبِكُمْ مَّنْ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ يَاْتِيْكُمْ بِهٖ ۭ اُنْظُرْ كَيْفَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ ثُمَّ هُمْ يَصْدِفُوْنَ ۝ قُلْ اَرَءَيْتَكُمْ اِنْ اَتٰىكُمْ عَذَابُ اللّٰهِ بَغْتَةً اَوْ جَهْرَةً هَلْ يُهْلَكُ اِلَّا الْقَوْمُ الظّٰلِمُوْنَ (۴۶-۴۷)

قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ اَخَذَ اللّٰهُ الاٰية، صَدَفَ يصدف، صدفاً کے معنی کسی چیز سے اعراض و انحراف اختیار کرنے اور اس سے رک رہنے کے ہیں۔

مطالبۂ عذاب کا جواب ایک اور پہلو سے

یہ اسی مطالبۂ عذاب کا جواب ایک دوسرے پہلو سے ہے۔ اوپر فرمایا تھا کہ اگر خدا تم پر کوئی ارضی یا سماوی آفت بھیج دے تو کوئی اس کا ہاتھ پکڑنے والا نہیں۔ اب ارشاد ہوا کہ اگر خدا تمھیں کسی عقلی، باطنی اور روحانی عذاب میں گرفتار کرے تو بھی تمھیں کوئی بچانے والا نہیں۔ ابھی تو تمھارے سننے، دیکھنے اور سمجھنے کی قوتیں زندہ ہیں لیکن تم ان سے کام نہیں لے رہے ہو۔ اگر خدا تمھارے سمع و بصر کو سلب کر لے اور تمھارے دل پر ٹھپہ لگا دے تو بتاؤ اللہ کے سوا کون ہے جو تمھاری ان صلاحیتوں اور قوتوں کو پھر بحال کر سکے؟ پھر فرمایا، یہ تو ایک نشانی مانگ رہے ہیں۔ دیکھو ہم اپنی آیتیں کتنے گوناگوں پہلوؤں سے پیش کر رہے ہیں لیکن یہ سننے اور سمجھنے کے بجائے بدستور اعراض ہی کیے جا رہے ہیں۔

قُلْ اَرَءَيْتَكُمْ اِنْ اَتٰىكُمْ عَذَابُ اللّٰهِ بَغْتَةً اَوْ جَهْرَةً الاٰية، بَغْتَةً کے معنی کسی چیز کے اچانک، دفعۃً، بغیر کسی نوٹس کے، بالکل بے خبری میں آ جانے کے ہیں۔ جَهْرَةً کے معنی ہیں، کھلم کھلا، ڈنکے کی چوٹ، دن دہاڑے۔ مطلب یہ ہے کہ نشانیٔ عذاب کا مطالبہ تو یہ کر رہے ہیں، ان سے پوچھو کہ خدا کا عذاب چپکے سے یا کھلم کھلا دن دہاڑے آئے، اول تو اس کو روکے گا کون، پھر ان سے یہ پوچھو کہ یہ بجلی گری تو کن پر گرے گی، انھی ظالموں پر تو گرے گی جو اپنی شامت سے اس کو دعوت دے رہے ہیں اور جو اپنی بد اعمالیوں سے اس کے سزاوار ہیں یا کسی اور پر؟

فیصلہ کن عذاب کے باب میں سنتِ الٰہی

یہاں یہ بات ملحوظ رکھنے کی ہے کہ اس سے مراد وہ عذاب ہے جو انبیاء کی تکذیب کرنے والی قوموں پر اتمامِ حجت کے بعد آتا ہے۔ اس عذاب کے معاملے میں سنت اللہ یہ ہے کہ نبی کے جھٹلانے والے ہلاک کر دیے جاتے ہیں اور اہلِ ایمان بچا لیے جاتے ہیں۔ رہی وہ آزمائشیں اور تکلیفیں جو تنبیہ و تذکیر کے لیے آتی ہیں، جن کا ذکر اوپر بَاْسَاء اور ضَرَّاء کے الفاظ سے گزرا ہے تو وہ اس امتیاز کے ساتھ نہیں آتیں بلکہ ان میں سب حصہ پاتے ہیں۔ البتہ اہلِ ایمان ان سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور اہلِ کفر بدستور اپنی شرارت پر جمے ہی رہ جاتے ہیں بلکہ، جیسا کہ اوپر گزرا، اس سے کچھ اور ڈھیٹ ہو جاتے ہیں۔

وَمَا نُرْسِلُ الْمُرْسَلِيْنَ اِلَّا مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ ۚ فَمَنْ اٰمَنَ وَاَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا يَمَسُّهُمُ الْعَذَابُ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ (۴۸ - ۴۹)

رسولوں کی بعثت کی اصل غایت

اب یہ اسی مطالبہ کے تعلق سے رسولوں کی بعثت کا اصل مقصد واضح فرما دیا کہ وہ عذاب کی نشانیاں دکھانے یا عذاب لانے یا خوارق و عجائب کی نمائش کرنے کے لیے نہیں بھیجے جاتے بلکہ وہ خدا کی رحمت کی خوش خبری دینے والے اور بصورتِ تکذیب و نافرمانی اس کے عذاب سے خبردار کر دینے والے بنا کر بھیجے جاتے ہیں۔ خوش خبری کی وضاحت یوں فرما دی کہ فَمَنْ اٰمَنَ وَاَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (جو ایمان لائے اور جنھوں نے اپنے رویہ کی اصلاح کر لی نہ ان کے لیے مستقبل میں کوئی اندیشہ ہے اور نہ ماضی کا کوئی غم) اور انذار کی تفصیل یوں فرمائی کہ وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا يَمَسُّهُمُ الْعَذَابُ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ (اور جو ہماری آیات کو جھٹلائیں گے ان کو ان کی نافرمانی کی پاداش میں خدا کا عذاب پکڑے گا) اس سے ایک حقیقت تو یہ واضح ہوئی کہ اللہ کے رسول خدا کی رحمت کے مظہر ہوتے ہیں، عذاب ان کی بعثت کے مقاصد میں سے نہیں بلکہ ان کی تکذیب کے لوازم و نتائج میں سے ہے۔ دوسری یہ کہ رسولوں سے لوگوں کو چاہنی وہ چیز چاہیے جس کے لیے وہ آتے ہیں یعنی ایمان اور عمل صالح کی ہدایت نہ کہ وہ چیز جس سے وہ لوگوں کو بچانے کے لیے بھیجے جاتے ہیں، تیسری یہ کہ یہ خوارق و عجائب نہ رسولوں کے خصائص میں سے ہیں اور نہ ان کی تعلیم و دعوت کے لوازم میں سے بلکہ ان کا ظہور اگر ہوتا ہے تو محض اتمامِ حجت کے طور پر ہوتا ہے، اگر اللہ تعالیٰ چاہتا ہے۔ چوتھی یہ کہ اس میں رسول کے لیے پیامِ تسکین ہے کہ وہ اپنا تعلق اپنے اصل مقصد بعثت — بشارت اور انذار — سے رکھے، جو باتیں اس کے فرائض سے غیر متعلق ہیں ان کو خدا پر چھوڑے، بلاوجہ ان کے لیے پریشان نہ ہو۔

قُلْ لَّآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِيْ خَزَآئِنُ اللّٰهِ وَلَآ اَعْلَمُ الْغَيْبَ وَلَآ اَقُوْلُ لَكُمْ اِنِّيْ مَلَكٌ ۚ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ ۭ قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الْاَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ ۭ اَفَلَا تَتَفَكَّرُوْنَ (۵۰)

فیصلہ کن اعلان

اب یہ پیغمبر کی زبان سے اس باب میں ایک آخری اور فیصلہ کن اعلان کرا دیا کہ مجھ سے بحث کرنی ہے تو اس چیز پر کرو جو میں تمھارے سامنے پیش کر رہا ہوں اور جس کا داعی ہوں۔ ان چیزوں پر کیوں جھگڑتے

ہو جن کا میں نے سرے سے کوئی دعویٰ ہی نہیں کیا؛ اگر میرے پاس خزانے نہیں ہیں تو میں نے کب کہا کہ میرے پاس خزانے ہیں؛ اگر میں یہ نہیں بتا سکتا کہ تم پر عذاب کب آئے گا یا قیامت کب آئے گی تو میں نے کب دعویٰ کیا کہ میں غیب جانتا ہوں؛ اگر میں فرشتہ نہیں ہوں تو میری زبان سے کب نکلا کہ میں فرشتہ ہوں؛ میں تو اس وحی کی پیروی کر رہا ہوں جو مجھ پر آئی ہے اور اسی کی دعوت تمھیں دے رہا ہوں۔ آخر میں ارشاد ہوا کہ ان سے پوچھو کہ اگر یہ ذرا بھی سوچنے سمجھنے والے ہیں تو یہ بتائیں کہ کیا خدا کے ہاں اندھے اور بینا یعنی آنکھیں کھول کر چلنے والے اور اپنی خواہشوں کے پیچھے اندھے ہو کر چلنے والے یکساں ہو جائیں گے؛ کیا اپنی عقل و بصیرت سے کام لینے والے اور اپنی عقلوں پر پٹی باندھ کر زندگی گزارنے والے برابر ہو جائیں گے؛ کیا نیکو کار اور بدکار دونوں کا انجام ایک ہی ہوگا؛ اگر اس کا جواب نفی میں ہے اور بالبداہت نفی میں ہے تو یہی سورج سے زیادہ بدیہی حقیقت وہ وحی تمھارے سامنے پیش کر رہی ہے جس کی میں تمھیں دعوت دے رہا ہوں تو اس پر تمھارا یہ معارضہ کیا معنی رکھتا ہے کہ میں تمھیں کوئی نشانیٔ عذاب کیوں نہیں دکھاتا؛ میں آج تمھیں عذاب کی کوئی نشانی نہیں دکھاتا تو کیا اس سے جزا اور سزا کا وہ قانون باطل ہو گیا جس کی میں منادی کر رہا ہوں۔ خدا کے بندو، تم اس پر غور نہیں کرتے؟

۶۔ آگے کا مضمون ——— آیات ۵۱-۵۵

آگے فرمایا کہ جو لوگ نشانیوں اور عذاب کے طالب و منتظر ہیں، ان کو تو تم (خطاب پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے) ان کے حال پر چھوڑ دو۔ البتہ جن لوگوں کے اندر خوفِ خدا اور خوفِ آخرت ہے ان کو اسی کتاب کے ذریعہ سے ڈراؤ جو تم پر وحی کی جا رہی ہے۔

پھر فرمایا کہ تمھاری شفقت و تربیت اور تمھاری توجہ و عنایت کے اصلی مستحق تو یہ غربائے مسلمین ہیں جو خدا کی رضا کے طالب ہیں اور جن کو دین کی طلب نے تمھارے اردگرد جمع کر دیا ہے۔ رہے یہ مغرور و متمرد لوگ جو تم سے نشانیاں اور معجزے مانگتے اور اکڑتے پھر رہے ہیں تو تم نہ ان کی پروا کرو، نہ ان کے پیچھے اصلی حقداروں کے حقوق میں غفلت کرو اور نہ ان کے کہے پر تم غریب مسلمانوں کو اپنے سے دور کرو۔ یہ لوگ اس بات میں اپنی ہتک سمجھتے ہیں کہ ان غریبوں کے پہلو بہ پہلو تمھاری مجلس میں بیٹھیں یا تمھاری بات سنیں۔ ان کی خواہش ہے کہ اگر تم ان کو اپنے سے قریب کرنا چاہتے ہو تو پہلے ان لوگوں کو اپنے سے دور کرو جو ان کے ہم سر نہیں ہیں اور جن کے پاس آنے میں ان کی ہتک ہے۔ تم ان کی اس رعونت کی ذرا حوصلہ افزائی نہ کرو۔ اگر وہ اپنے اس غرور کے سبب سے ایمان سے محروم رہے تو اس کی ذمہ داری تم پر نہیں۔ ان کی پرسش خدا کے ہاں تم سے نہیں ہوتی ہے۔ اسی طرح جو مسئولیت تم پر ہے اس کا کوئی حصہ قیامت کے دن یہ اٹھانے والے نہیں بنیں گے کہ ان کے مطالبے پر تم اہلِ ایمان

کو اپنے سے دور کر کے اپنے سر ایک ظلم عظیم کی ذمہ داری لو۔

پھر فرمایا کہ ان مغروروں کے لیے ان کا مال وجاہ اور ان کا حسب ونسب ایک حجاب بن گیا ہے۔ یہ سمجھتے ہیں کہ جب دنیا کی ساری سرفرازیاں ہمارا حصہ ہیں تو اگر یہ نیا دین اپنے اندر کوئی خیر کا پہلو رکھتا ہوتا تو کیا اس کے لیے خدا کو یہی لوگ ملے جن کو دو وقت کی روٹی اور تن ڈھانکنے کو صحیح سالم کپڑے بھی نصیب نہیں۔ ان ظالموں کو یہ پتہ نہیں کہ اس دنیا کے خزف ریزے تو خدا اہلوں اور نا اہلوں دونوں ہی کو دے دیتا ہے لیکن دین کی دولت گرانمایہ صرف اس کے شکر گزار بندوں ہی کو نصیب ہوتی ہے۔

اس کے بعد ان غربائے مسلمین کی دلداری فرمائی تاکہ ان مغروروں کے اس طعن سے اگر ان کی کچھ دل شکنی ہوئی ہو تو اس کا اندمال ہو جائے۔ اس دلداری کے لیے خود خدائے رب العزت کی طرف سے جو سلام وپیام ان غریبوں کے نام آیا ہے اس کا ایک ایک حرف اپنے اندر زندگی جاوید کی خوش خبری اور خواجگی کون ومکان کی سرفرازی رکھتا ہے —— اس روشنی میں آگے کی آیات تلاوت فرمائیے۔

آیات ۵۱-۵۵

وَاَنْذِرْ بِهِ الَّذِيْنَ يَخَافُوْنَ اَنْ يُّحْشَرُوْٓا اِلٰى رَبِّهِمْ لَيْسَ لَهُمْ مِّنْ
دُوْنِهٖ وَلِيٌّ وَّلَا شَفِيْعٌ لَّعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ﴿٥١﴾ وَلَا تَطْرُدِ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ
رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ ؕ مَا عَلَيْكَ مِنْ
حِسَابِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ وَّمَا مِنْ حِسَابِكَ عَلَيْهِمْ مِّنْ شَيْءٍ فَتَطْرُدَهُمْ
فَتَكُوْنَ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿٥٢﴾ وَكَذٰلِكَ فَتَنَّا بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ
لِّيَقُوْلُوْٓا اَهٰٓؤُلَآءِ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنْۢ بَيْنِنَا ؕ اَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَعْلَمَ
بِالشّٰكِرِيْنَ ﴿٥٣﴾ وَاِذَا جَآءَكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاٰيٰتِنَا فَقُلْ سَلٰمٌ
عَلَيْكُمْ ۘ كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ ۙ اَنَّهٗ مَنْ عَمِلَ مِنْكُمْ
سُوْٓءًا بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابَ مِنْ بَعْدِهٖ وَاَصْلَحَ فَاَنَّهٗ غَفُوْرٌ
رَّحِيْمٌ ﴿٥٤﴾ وَكَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ وَلِتَسْتَبِيْنَ سَبِيْلُ
الْمُجْرِمِيْنَ ﴿٥٥﴾

ع ٦ ٥ ١٢

ترجمۂ آیات ۵۱-۵۵

اور تم اسی کے ذریعہ سے خبردار کرو ان لوگوں کو جو ڈر رکھتے ہیں اس بات کا کہ وہ اپنے رب کے پاس اکٹھے کیے جائیں گے اس حال میں کہ اس کے سامنے نہ ان کا کوئی حامی ہوگا نہ شفیع، تاکہ وہ تقویٰ اختیار کریں۔ ۵۱

اور تم ان لوگوں کو اپنے سے دور نہ کیجیو جو صبح و شام اپنے رب کو پکارتے ہیں اس کی خوشنودی چاہتے ہوئے۔ ان کی ذمہ داری کا کوئی حصہ تم پر نہیں اور نہ تمہاری ذمہ داری کا کوئی حصہ ان پر ہے کہ تم ان کو اپنے سے دور کر کے ظالموں میں سے بن جاؤ۔ اور اسی طرح ہم نے ان میں سے ایک کو دوسرے سے آزمایا ہے کہ وہ کہیں کہ کیا یہی لوگ ہیں جن کو اللہ نے ہمارے درمیان سے اپنے فضل کے لیے چنا؟ کیا اللہ شکر گزاروں سے اچھی طرح واقف نہیں؟ اور جب تمہارے پاس وہ لوگ آیا کریں جو ہماری آیات پر ایمان لائے تو تم ان کو کہو کہ تم پر سلامتی ہو۔ تمہارے رب نے اپنے اوپر رحمت واجب کر رکھی ہے۔ جو کوئی تم میں سے نادانی سے کوئی برائی کر بیٹھے گا پھر وہ اس کے بعد توبہ اور اصلاح کر لے گا تو وہ بخشنے والا اور مہربان ہے۔ اور اسی طرح ہم اپنی آیات کی تفصیل کرتے ہیں تاکہ اہلِ ایمان کی روش بھی واضح ہو جائے اور مجرموں کا رویہ بھی بے نقاب ہو جائے۔ ۵۲-۵۵

۷۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَاَنْذِرْ بِهِ الَّذِيْنَ يَخَافُوْنَ اَنْ يُّحْشَرُوْٓا اِلٰى رَبِّهِمْ لَيْسَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ وَلِيٌّ وَّلَا شَفِيْعٌ لَّعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ (۵۱)

پیغمبر کو اہلِ نشست کی طرف متوجہ ہونے کی ہدایت

اوپر کے پیرے میں یہ اعلان پیغمبر کی زبان سے کرا دیا گیا کہ نہ میں خزانوں کا مالک ہوں، نہ غیب

جانتا ہوں نہ فرشتہ ہونے کا مدعی ہوں، میں تو بس اس وحی کی پیروی کرتا ہوں جو مجھ پر آتی ہے۔ اب یہ ارشاد ہوا کہ جو لوگ کسی نشانیٔ عذاب کے منتظر ہیں ان کو تو ان کے حال پر چھوڑ دو، البتہ جو عقل و فکر سے کام لینے والے ہیں اور جو اپنے دلوں کے اندر یہ اندیشہ رکھتے ہیں کہ ایک دن بہرحال خدا کے حضور حاضر ہونا ہے اور اس طرح حاضر ہونا ہے کہ ان کا کوئی حامی و شفیع ایسا نہ ہوگا جو ان کو خدا کی پکڑ سے بچا سکے، ان کو اس کتاب کے ذریعہ سے جو تم پر وحی کی جا رہی ہے بیدار اور خبردار کرو۔ جن لوگوں کے اندر یہ ڈر موجود ہوگا وہی اس کتاب سے فائدہ اٹھائیں گے اور وہی تقویٰ اختیار کر کے اپنے اعمال کی اصلاح کریں گے۔ جن کے اندر آخرت کا کوئی اندیشہ ہی نہیں یا جو شرکاء و شفعا بنائے بیٹھے ہیں جن کی نسبت ان کا گمان ہے کہ خواہ کچھ ہی ہو وہ ان کو خدا سے چھڑا ہی لیں گے، وہ دنیا جہان کی نشانیاں دیکھ کر بھی اسی طرح ایمان سے محروم رہیں گے۔

اس آیت سے مندرجہ ذیل باتیں واضح ہوئیں۔

ایک یہ کہ انذار کے لیے فطری اور عقلی چیز یہ قرآن ہے نہ کہ عذاب کی نشانیاں۔

دوسری یہ کہ یہ قرآن بھی نافع ان لوگوں کے لیے ہے جن کے اندر فطرت کی صلاحیتیں زندہ ہیں۔ جن کی فطری صلاحیتیں مردہ ہو چکی ہیں ان کو قرآن سے بھی نفع نہیں پہنچے گا۔

تیسری یہ کہ تقویٰ اور خدا ترسی کے لیے سب سے بڑا حجاب شفاعت باطل کا عقیدہ ہے۔

وَلَا تَطْرُدِ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ مَا عَلَيْكَ مِنْ حِسَابِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ وَّمَا مِنْ حِسَابِكَ عَلَيْهِمْ مِّنْ شَيْءٍ فَتَطْرُدَهُمْ فَتَكُوْنَ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ (٥٢)

سرداران قریش کے غرور پر ضرب

اوپر کی آیت سے یہ بات واضح ہو گئی کہ پیغمبر کو کن لوگوں کے ساتھ مشغول ہونا چاہیے اور کن لوگوں سے بے پروا ہو جانا چاہیے۔ اب یہ اس بات کی مزید وضاحت ہو رہی ہے کہ جو شامت زدہ لوگ اپنے غرور مال و جاہ میں مست ہیں، تمھیں کوئی اہمیت نہیں دیتے کہ تم خزانوں کے مالک نہیں، تمھارے ساتھیوں کو اس وجہ سے حقیر سمجھتے ہیں کہ وہ بے نوا، غریب، مفلس اور عزت و جاہ سے محروم لوگ ہیں، ان کے پیچھے اپنا وقت ضائع نہ کرو اور ان کے ایمان کی فکر میں ان لوگوں کے حقوق میں غفلت نہ ہو جو اللہ کی آیات پر ایمان لائے اور صبح و شام اس کی عبادت و طاعت میں سرگرم ہیں۔

یہاں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ قریش کے اکابر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کی مخالفت کے جہاں وہ بہانے پیدا کرتے تھے جن کی طرف اوپر اشارہ ہوا وہیں یہ دلیل بھی لاتے تھے کہ آپ کے ساتھی بالکل غربا اور عوام کے طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں، جن میں غلام اور لونڈیاں بھی شامل ہیں۔ اوّل تو یہ دین، اگر اللہ کا دین ہوتا، تو کیا اللہ اپنے دین کے لیے (نعوذ باللہ) انھی اراذل و انفار کو منتخب کرتا اور اگر یہی لوگ اس کے حامل قرار پاتے ہیں تو پھر کسی شریف کے لیے کہاں گنجائش باقی رہی کہ ان کے اندر شامل ہو کر اپنی

عزت خاک میں ملائے، ان کی اس ذہنیت کو سامنے رکھ کر اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر کو ہدایت فرمائی کہ ان کو اپنے کے لیے تم اپنوں کو کھونے کی غلطی نہ کرنا، کھوئی ہوئی آوارہ بھیڑوں کی جستجو میں اپنے اصلی گلہ سے غفلت نہ ہونے پائے۔ تم نے ان کو اللہ کی دعوت پہنچا دی۔ اب اگر یہ اپنی گمراہی میں پڑے رہے تو اس کی پرسش خدا کے ہاں بہرحال تم سے نہیں ہوگی۔ اب مواخذہ انھی سے ہونا ہے۔ ان کے حساب کی کوئی ذمہ داری تم پر نہیں ہے اور اگر ان کے پیچھے تم نے ان اللہ کے بندوں سے بے پروائی کی تو کل کو تمھاری طرف سے یہ جواب دہ بننے والے نہیں ہیں کہ تم ان کی خاطر اپنے کو ظالموں میں شامل کرلو۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ہدایت اس وجہ سے نہیں ہوئی کہ آپ سے یہ اندیشہ تھا کہ آپ اپنے ان ساتھیوں کو نظر انداز فرما دیں گے یا ان کو اپنے پاس سے الگ کر دیں گے، بلکہ یہ سرداران قریش کے غرور پر ضرب لگائی گئی ہے لیکن بات ان کو مخاطب کر کے کہنے کے بجائے پیغمبر کو مخاطب کر کے کہی گئی ہے تاکہ ان پر یہ واضح ہو جائے کہ ان کی یہ بات اس قابل بھی نہیں ہے کہ ان کو براہِ راست مخاطب کر کے اس کا جواب دیا جائے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ جو بکواس کرتے ہیں کرنے دو۔ اگر یہ چیز ان کے لیے اسلام کی طرف بڑھنے میں رکاوٹ ہے تو وہ جس جہنم میں چاہیں گریں، تم پر ان کی کوئی ذمہ داری نہیں، جو خدا کے طالب بن کر تمھارے پاس آئے ہیں تم ان کو اپنے پاس سے کس طرح دھتکار سکتے ہو؟ تمھاری ذمہ داریاں تم پر ہیں۔ کل کو یہ تو تمھاری طرف سے ذمہ دار نہیں ہوں گے کہ تم ان کی خاطر ان لوگوں کے حقوق تلف کرو جو تمھاری توجہ اور شفقت کے اصلی حقدار ہیں۔ یہاں 'طرد' کا جو لفظ استعمال ہوا ہے وہ اپنے معنی کے اعتبار سے سخت ضرور ہے اس لیے کہ اس کے معنی کسی کو دھتکارنے اور دور دفع کرنے کے ہیں لیکن یہ لفظ سرداران قریش کی ذہنیت کو سامنے رکھ کر استعمال ہوا ہے اس لیے کہ ان کی خواہش یہی تھی کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ان لوگوں کو اپنے پاس سے دھتکار دیں تب ہم بات کرنے کے روادار ہوں گے۔

انبیاء کے کردار کا ایک خاص پہلو

حضرات انبیاء علیہم السلام کے کردار کا یہ پہلو بھی یہاں نگاہ میں رہے کہ وہ اپنی قوم کے ایمان کے جیسا کہ قرآن میں تصریح ہے، نہایت حریص ہوتے ہیں۔ سیدنا مسیح نے اس باب میں ایک تمثیل بھی بیان فرمائی ہے۔ انھوں نے فرمایا کہ کیا یہ بات نہیں ہے کہ جب تم میں سے کسی کی کوئی بھیڑ کھو جاتی ہے تو وہ اس کی تلاش میں ندیوں نالوں اور جنگلوں میں پریشان پھرتا ہے اور اپنے اصلی گلہ کو بھول جاتا ہے۔ پھر جب وہ مل جاتی ہے تو اس کو اپنے کندھے پر اٹھا کر لاتا ہے اور اپنے لوگوں میں آکر کہتا ہے، اے لوگو، میرے ساتھ خوشی مناؤ، اس لیے کہ میری کھوئی ہوئی بھیڑ مجھے مل گئی۔ یہ تمثیل جس طرح اللہ تعالیٰ کی اس رافت کو ظاہر کرتی ہے جو اللہ تعالیٰ اپنے ان بندوں کے لیے رکھتا ہے جو گمراہی کے بعد ہدایت کی طرف رجوع کرتے ہیں اسی طرح حضرات انبیاء کی اس بیقراری کو بھی ظاہر کرتی ہے جو ان کے اندر اپنی قوم کے گمراہوں کے ایمان اور ان کی اصلاح کے لیے ہوتی ہے۔ حضرات انبیاء کی اس صفت میں اللہ تعالیٰ کی صفت کا ایک عکس

ہے اس وجہ سے یہ ایک محبوب اور پسندیدہ صفت ہے۔ لیکن یہ صفت بھی اپنے کچھ حدود و قیود رکھتی ہے۔ اللہ تعالیٰ یہ نہیں پسند فرماتا کہ بغیر کھوئی ہوئی بھیڑوں کی تلاش میں اتنا سرگردان رہے کہ اپنے اصل گلے کی دیکھ بھال میں غفلت ہو جائے جو سرکش اور آوارہ بھیڑ قابو میں نہیں آتی وہ کسی بھیڑیے ہی کا حصہ ہے۔ اسی طرح یہاں فرمایا کہ یہ مغرور لوگ اگر اپنی ناز برداری اس حد تک چاہتے ہیں کہ تم ان کی خاطر ان لوگوں کو اپنے پاس سے ہٹا دو جو صبح و شام رضائے الٰہی کی طلب میں سرگرم ہیں تو یہ کرنے کے تم مجاز نہیں ہو۔ ہمارے استاذ مولانا فراہیؒ نے اس مضمون کو سورۂ عبس کی تفسیر میں بڑی وضاحت سے لکھا ہے اور اس کے بعض نہایت اہم پہلو ہم بھی مناسب مواقع پر ظاہر کریں گے۔

وَكَذٰلِكَ فَتَنَّا بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لِّيَقُوْلُوْٓا اَهٰٓؤُلَآءِ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنْۢ بَيْنِنَا ۭ اَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَعْلَمَ بِالشّٰكِرِيْنَ (٥٣)

اس دنیا میں امارت و غربت دونوں امتحان کے لیے ہیں

'لِيَقُوْلُوْا' میں حرف 'ل' لام عاقبت ہے جو علت کو نہیں بلکہ نتیجہ کو ظاہر کرتا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ نے اپنی ایک سنت بیان فرمائی ہے کہ ہم نے دنیا میں کسی کو دولت جو دی ہے تو اس بنا پر نہیں دی ہے کہ وہ اسی کا سزاوار تھا۔ اسی طرح کسی کو غربت دی ہے تو اس وجہ سے نہیں کہ وہ اسی کا سزاوار تھا بلکہ ایک کو دولت اور دوسرے کو غربت دے کر دونوں کا امتحان کیا ہے۔ وہ جن کو مال و جاہ دیتا ہے تو اس لیے دیتا ہے کہ وہ دیکھے کہ وہ اللہ کی بخشی ہوئی نعمت پا کر اس کے شکر گزار، متواضع اور فرمانبردار بندے بنتے ہیں یا مغرور و متکبر ہو کر اکڑنے والے، اترانے والے، غریبوں کو دھتکارنے والے اور خدائی نعمتوں کے اجارہ دار بن کر بیٹھ جاتے ہیں۔ اسی طرح جن کو غربت دیتا ہے تو یہ دیکھنے کے لیے دیتا ہے کہ وہ اپنی غربت پر صابر، حاصل نعمتوں اور اپنی نانِ جویں پہ قانع، اپنی تقدیر پر راضی اور اپنے فقر میں خوددار رہتے ہیں یا مایوس و دل شکستہ ہو کر پست ہمت، بے حوصلہ، تقدیر سے شاکی، خدا سے برہم اور ذلیل و خوار ہو کر رہ جاتے ہیں۔ فرمایا کہ اسی امتحان میں ہم نے ان کو ڈالا ہے۔ ہم نے ان کو اپنے فضل سے نوازا تاکہ یہ ہمارے شکر گزار بندے بنیں۔ لیکن ان کی کج فہمی کے باعث ہماری نعمت ان کے لیے فتنہ بن گئی۔ یہ سمجھ بیٹھے کہ یہی ساری نعمتوں کے پیدائشی حق دار اور ہر عزت و جاہ کے خاندانی اجارہ دار ہیں۔ نتیجہ اس کج فہمی کا یہ نکلا کہ اب وہ یہ کہنے لگے کہ اسلام اگر کوئی فضیلت کی چیز ہوتی تو کیا اس سے سرفراز کرنے کے لیے خدا کو یہی اراذل و اجلاف اور یہی حقیر و نادار لوگ مل سکے؟ آخر ہم اشراف و اعیان، سرداران قریش اور رؤسائے طائف کہاں مر گئے تھے کہ آسمان سے یہ نعمت اتری تو ہمارا پتہ اس کو نہ مل سکا اور وہ ان پر جا کر نازل ہو گئی! سرداران قریش کے اس غرور کا حوالہ قرآن نے بعض دوسرے مقامات میں بھی دیا ہے۔ مثلاً وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَوْ كَانَ خَيْرًا مَّا سَبَقُوْنَآ اِلَيْهِ ۱۱ - احقاف (اور کافروں نے ایمان لانے والوں کے باب میں کہا کہ اگر یہ دین کوئی خیر والی چیز ہوتا تو یہ لوگ اس کی طرف ہم

سے سبقت نہیں لے جا سکتے تھے) دوسری جگہ ہے وَلَآ اَقُوْلُ لِلَّذِيْنَ تَزْدَرِيْٓ اَعْيُنُكُمْ لَنْ يُّؤْتِيَهُمُ اللّٰهُ خَيْرًا ۳۱ ھود (اور میں ان لوگوں کے بارے میں جو تمہاری نگاہوں میں حقیر ہیں یہ کہنے کے لیے تیار نہیں کہ خدا کبھی ان کو کوئی نعمت دے ہی نہیں سکتا) ایمان و اسلام تو درکنار نبوت کو بھی یہ لوگ اپنا اجارہ سمجھتے تھے اور علانیہ کہتے تھے کہ اگر خدا کسی کو نبی بنانے والا ہوتا تو مکہ یا طائف کے کسی رئیس کو بناتا، اس منصب کے لیے یہی (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) اس کو ملے تھے۔

دین کی نعمت کے اصلی حق دار

قرآن نے ان کے اس تمرد کے جواب میں فرمایا کہ اَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَعْلَمَ بِالشّٰكِرِيْنَ (کیا اللہ اپنے شکرگزار بندوں کو نہیں جانتا) مطلب یہ ہے کہ خدا کا دین، سونا اور چاندی، ریشم اور مخمل نہیں ہے جس کی کاٹھی اور جس کے جھول گدھوں اور خچروں، گھوڑوں اور اونٹوں پر بھی نظر آجاتے ہیں۔ یہ تو آسمانی نعمت اور یزدانی رحمت ہے جو صرف ان کا حصہ ہے جو ہر حال میں اپنے رب کے شکرگزار رہے، جنھوں نے خدا کی نعمتوں کی قدر کی، جنھوں نے اپنی صلاحیتوں کا حق ادا کیا، جنھوں نے اپنے کان کھلے رکھے، جنھوں نے اپنی آنکھوں پر غرور کی پٹی نہیں باندھی اور جنھوں نے اپنے دلوں کو مردہ نہیں ہونے دیا۔ رہے وہ نابکار و ناشکرے لوگ جنھوں نے خدا کی بخشی ہوئی تمام ظاہری و باطنی نعمتوں کو خدا ہی کے خلاف استعمال کیا ان کے لیے اس نعمت میں کوئی حصہ نہیں ہے۔ دنیا نیک و بد دونوں کو مل جاتی ہے لیکن دین کی نعمت صرف انھی کو ملتی ہے جو خدا کے شکرگزار ہوتے ہیں۔

وَاِذَا جَآءَكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاٰيٰتِنَا فَقُلْ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ ۙ اَنَّهٗ مَنْ عَمِلَ مِنْكُمْ سُوْٓءًا بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابَ مِنْ بَعْدِهٖ وَاَصْلَحَ فَاَنَّهٗ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (۵۴)۔

'سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ' جس طرح ملاقات یا رخصت کا کلمہ ہے اسی طرح خیر مقدم کا کلمہ بھی ہے۔ مثلاً فرشتے توحید پر ثابت قدم رہنے والوں کا خیر مقدم کرتے ہوئے کہیں گے سَلٰمٌ عَلَيْكُمُ ادْخُلُوا الْجَنَّةَ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۳۲ نحل (تم پر سلامتی ہو، جنت میں داخل ہو جاؤ اپنے اعمال کے صلے میں)

غربائے مسلمین کے خیر مقدم کی ہدایت

اب یہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو ان غربائے مسلمین کے ساتھ بالکل اس کے ضد طرز عمل اختیار کرنے کی ہدایت فرمائی گئی جس کا مطالبہ سرداران قریش کرتے تھے۔ سرداران قریش تو، جیسا کہ بیان ہوا، یہ چاہتے تھے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ان لوگوں کو اپنے پاس سے دھتکار دیں لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کے برعکس نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ہدایت فرمائی کہ جب ہماری آیتوں پر ایمان لانے والے ہمارے یہ بندے تمہارے پاس آیا کریں تو تم سلامتی اور رحمت کی دعا کے ساتھ ان کا خیر مقدم کیا کرو اور ہماری طرف سے ان کو بشارت دو کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے باایمان بندوں کے لیے اپنے اوپر رحمت واجب کر رکھی ہے۔ وہ تم کو اپنی رحمت سے ضرور نوازے گا۔ اگر تم میں سے کسی سے نادانی کے سبب کوئی غلطی صادر ہو جائے گی اور اس کے بعد وہ توبہ و اصلاح کرے گا تو اللہ بخشنے والا اور مہربان ہے۔

اہل ایمان کی اصل جائداد

یہاں اللہ تعالیٰ نے جو بشارت دی ہے وہ صرف رحمت و مغفرت کی ہے۔ اس کے ساتھ کسی دنیوی مال و جاہ کا کوئی لوث نہیں ہے۔ اس سے اللہ کے ان غریب، لیکن دنیا اور سر و سامانِ دنیا سے بے نیاز، بندوں کے باطن پر روشنی پڑتی ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ لوگ سر و سامانِ دنیا سے محروم ہونے کے باوجود اپنے دل میں اس دنیا کا کوئی ارمان نہیں رکھتے تھے۔ ان کے دل کو اگر لگن تھی تو اس بات کی تھی کہ ان کو اپنے خالق و مالک کی رضا حاصل ہو۔ اوپر ان کی صفت بھی یہی بیان ہوئی ہے یَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ اللہ تعالیٰ نے ان کی اس باطنی آرزو کے لحاظ سے ان کو اسی چیز کی بشارت دی جس کے وہ سب سے زیادہ طلب گار تھے۔ اس سے اشارۃً یہ بات بھی نکلی کہ دنیا کے پرستار جن چیزوں پر مرتے ہیں، اللہ کے باایمان بندوں کی نگاہوں میں ان کی قدر و قیمت بالِ مگس کے برابر بھی نہیں، نہ اس دنیا میں نہ آخرت میں۔

وَكَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ وَلِتَسْتَبِيْنَ سَبِيْلُ الْمُجْرِمِيْنَ (۵۵)

یہاں وَلِتَسْتَبِيْنَ کا معطوف علیہ محذوف ہے۔ اگر پوری بات کھول دی جائے تو یوں ہوگی وَكَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِتَسْتَبِيْنَ سَبِيْلُ الْمُؤْمِنِيْنَ وَلِتَسْتَبِيْنَ سَبِيْلُ الْمُجْرِمِيْنَ اس قسم کے حذف کی متعدد مثالیں گزر چکی ہیں۔ اوپر تفصیل سے بیان ہوا کہ جو لوگ ایمان نہیں لانا چاہتے ان کی روش کیا ہوتی ہے اور جو ایمان لاتے ہیں ان کا طریقہ کیا ہوتا ہے۔ آخر میں یہ اشارہ فرما دیا کہ یہ ساری تفصیل ہم نے اسی لیے سنائی ہے کہ تم پر دونوں کی روش اور دونوں کا انداز فکر واضح ہو جائے تاکہ بلا سبب کوئی چیز وجہ پریشانی نہ بنے۔

۸۔ آگے کا مضمون ـــــ آیات ۵۶-۶۷

آگے وہی مضمون جو اوپر سے چلا آ رہا ہے نئے انداز اور نئے پہلوؤں سے بیان ہوا ہے۔

پہلے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے اعلان کرایا ہے کہ تم خدا کے شریک ٹھہراتے ہو اور اس شرک کی نہایت میں مجھ سے لڑتے ہو لیکن مجھے ان شرکیوں کی عبادت سے میرے رب نے روک دیا ہے۔ اس وجہ سے میرے لیے اس بات کا کوئی امکان نہیں ہے کہ میں تمہاری بدعتوں کی پیروی کروں۔ یہ بات کہ خدا نے مجھے اس بات سے روک دیا ہے، ایک واضح دلیل اور ایک قطعی حجت پر مبنی ہے۔ اس باب میں میرے رب کی شہادت اس وحی کی صورت میں موجود ہے جو مجھ پر آتی ہے لیکن تم اس وحی کو جھٹلاتے ہو اور اس وقت تک اس کی تصدیق کے لیے تیار نہیں ہو جب تک تم کو خدا کا عذاب نہ دکھا دیا جائے۔ یہ چیز میرے اختیار میں نہیں ہے۔ اس کا اختیار خدا ہی کو ہے۔ اگر یہ چیز میرے اختیار میں ہوتی تو اس جھگڑے کا فیصلہ ہو چکا ہوتا۔ میں اس کے سوا کچھ نہیں کہہ سکتا کہ میرا رب اس جھگڑے کا فیصلہ فرمائے گا لیکن کب اور کس طرح؟ اس کا جواب صرف اسی کے پاس ہے جو اپنی اس کائنات کے تمام رازوں اور بھیدوں کو جاننے والا ہے۔

اس کے بعد فرمایا کہ یہ بات کہ مرنے کے بعد ایک روز اٹھنا ہے اور اٹھنے کے بعد ایک ہی خدا کے

آگے حاضر ہونا ہے پھر سب کو اپنے مولائے حقیقی کے آگے جواب دہی کرنی ہے، ایک ایسی حقیقت ہے جس کا ریہرسل (REHEARSAL) اس دنیا کے سٹیج پر ہر روز ہو رہا ہے لیکن جو لوگ آنکھیں بند کیے ہوئے ہوں ان کا کیا علاج!

اس کے بعد انسان کی اس نفسیاتی بیماری کی طرف توجہ دلائی کہ یہ جب کسی آزمائش میں ڈالا جاتا ہے تب تو خدا خدا پکارتا ہے اور اس کے سوا سب کو بھول جاتا ہے لیکن اس آزمائش سے خدا جب اس کو نجات دے دیتا ہے تو چھوٹتے ہی اپنی پچھلی سرمستیوں اور حماقتوں میں پھر کھو جاتا ہے، گویا کوئی بات سرے سے ہوئی ہی نہیں اور یہ سمجھ بیٹھتا ہے کہ اب وہ خدا کے قابو سے بالکل باہر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اسی بیماری میں یہ لوگ مبتلا ہیں جو آج عذاب کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ ان سے کہہ دو کہ ہر بات کے لیے خدا کے ہاں ایک وقت مقرر ہے جب وہ وقت آجائے گا تو دیکھ لو گے۔

اس روشنی میں آگے کی آیات تلاوت فرمائیے۔

آیات ۵۶-۶۷

قُلْ اِنِّیْ نُهِیْتُ اَنْ اَعْبُدَ الَّذِیْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ قُلْ
لَّاۤ اَتَّبِعُ اَهْوَآءَكُمْ ۙ قَدْ ضَلَلْتُ اِذًا وَّ مَاۤ اَنَا مِنَ الْمُهْتَدِیْنَ ﴿۵۶﴾
قُلْ اِنِّیْ عَلٰی بَیِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّیْ وَ كَذَّبْتُمْ بِهٖ ؕ مَا عِنْدِیْ مَا
تَسْتَعْجِلُوْنَ بِهٖ ؕ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ یَقُصُّ الْحَقَّ وَ هُوَ خَیْرُ
الْفٰصِلِیْنَ ﴿۵۷﴾ قُلْ لَّوْ اَنَّ عِنْدِیْ مَا تَسْتَعْجِلُوْنَ بِهٖ لَقُضِیَ الْاَمْرُ
بَیْنِیْ وَ بَیْنَكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِالظّٰلِمِیْنَ ﴿۵۸﴾ وَ عِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَیْبِ
لَا یَعْلَمُهَاۤ اِلَّا هُوَ ؕ وَ یَعْلَمُ مَا فِی الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ ؕ وَ مَا تَسْقُطُ مِنْ وَّرَقَةٍ
اِلَّا یَعْلَمُهَا وَ لَا حَبَّةٍ فِیْ ظُلُمٰتِ الْاَرْضِ وَ لَا رَطْبٍ وَّ لَا یَابِسٍ
اِلَّا فِیْ كِتٰبٍ مُّبِیْنٍ ﴿۵۹﴾ وَ هُوَ الَّذِیْ یَتَوَفّٰىكُمْ بِالَّیْلِ وَ یَعْلَمُ مَا
جَرَحْتُمْ بِالنَّهَارِ ثُمَّ یَبْعَثُكُمْ فِیْهِ لِیُقْضٰۤى اَجَلٌ مُّسَمًّى ۚ ثُمَّ اِلَیْهِ
مَرْجِعُكُمْ ثُمَّ یُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۶۰﴾ وَ هُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ ع ۵ ۱۳

عِبَادِهٖ وَيُرْسِلُ عَلَيْكُمْ حَفَظَةً ۭ حَتّٰٓى اِذَا جَاۗءَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ
تَوَفَّتْهُ رُسُلُنَا وَهُمْ لَا يُفَرِّطُوْنَ ﴿٦١﴾ ثُمَّ رُدُّوْٓا اِلَى اللّٰهِ مَوْلٰىهُمُ
الْحَقِّ ۭ اَلَا لَهُ الْحُكْمُ ۡ وَهُوَ اَسْرَعُ الْحٰسِبِيْنَ ﴿٦٢﴾ قُلْ مَنْ يُّنَجِّيْكُمْ
مِنْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ تَدْعُوْنَهٗ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً ۚ لَىِٕنْ اَنْجٰىنَا
مِنْ هٰذِهٖ لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِيْنَ ﴿٦٣﴾ قُلِ اللّٰهُ يُنَجِّيْكُمْ مِّنْهَا وَمِنْ
كُلِّ كَرْبٍ ثُمَّ اَنْتُمْ تُشْرِكُوْنَ ﴿٦٤﴾ قُلْ هُوَ الْقَادِرُ عَلٰٓى اَنْ يَّبْعَثَ
عَلَيْكُمْ عَذَابًا مِّنْ فَوْقِكُمْ اَوْ مِنْ تَحْتِ اَرْجُلِكُمْ اَوْ يَلْبِسَكُمْ شِيَعًا
وَّيُذِيْقَ بَعْضَكُمْ بَاْسَ بَعْضٍ ۭ اُنْظُرْ كَيْفَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّهُمْ
يَفْقَهُوْنَ ﴿٦٥﴾ وَكَذَّبَ بِهٖ قَوْمُكَ وَهُوَ الْحَقُّ ۭ قُلْ لَّسْتُ عَلَيْكُمْ
بِوَكِيْلٍ ﴿٦٦﴾ لِكُلِّ نَبَاٍ مُّسْتَقَرٌّ ۡ وَّسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ﴿٦٧﴾

ترجمۂ آیات ٥٦-٦٧

کہہ دو کہ مجھے تو ان کی عبادت سے روکا گیا ہے جن کو تم اللہ کے سوا پکارتے ہو۔ کہہ دو میں تمہاری خواہشوں کے پیچھے نہیں چل سکتا۔ اگر میں نے ایسا کیا تو گمراہ ہو جاؤں گا اور پھر راہ پانے والوں میں سے نہ بن سکوں گا۔ کہہ دو میں اپنے رب کی جانب سے ایک روشن دلیل پر ہوں اور تم نے اسے جھٹلا دیا ہے، وہ چیز میرے پاس نہیں ہے جس کے لیے تم جلدی مچائے ہوئے ہو۔ اس کا فیصلہ اللہ ہی کے اختیار میں ہے۔ وہی حق کو واضح کرے گا اور وہ بہترین فیصلہ کرنے والا ہے۔ کہہ دو کہ اگر وہ چیز میرے پاس ہوتی جس کے لیے تم جلدی مچائے ہوئے ہو تو میرے اور تمہارے درمیان جھگڑے کا فیصلہ ہو چکا ہوتا اور اللہ ظالموں سے خوب باخبر ہے۔ اور غیب کی کنجیاں اسی کے پاس ہیں۔ اس کے سوا

ان کو کوئی نہیں جانتا۔ بر و بحر میں جو کچھ ہے اس سے وہ واقف ہے۔ کوئی پتا نہیں گرتا مگر وہ اس کو جانتا ہے اور نہ زمین کی تہوں میں کوئی دانہ گرتا اور نہ کوئی تر اور خشک چیز ہے مگر وہ ایک روشن کتاب میں مندرج ہے۔ ۵۷-۵۹

اور وہی ہے جو تمھیں رات میں وفات دیتا ہے اور جانتا ہے جو کچھ تم نے دن میں کیا ہے، پھر تمھیں اس میں اُٹھاتا ہے تاکہ مدت معین پوری کی جائے۔ پھر اسی طرف تمھارا لوٹنا ہے، پھر وہ تمھیں باخبر کرے گا اس چیز سے جو تم کرتے رہے ہو اور وہ اپنے بندوں پر پوری طرح حاوی ہے اور وہ تم پر اپنے نگران مقرر رکھتا ہے۔ یہاں تک کہ جب تم میں سے کسی کی موت کا وقت آ پہنچتا ہے تو ہمارے فرستادے ہی اس کی روح قبض کرتے ہیں اور وہ اس کام میں کوتاہی نہیں کرتے۔ پھر وہ سب اللہ، اپنے مولائے حقیقی، ہی کی طرف لوٹ جائیں گے۔ آگاہ کہ فیصلہ کا سارا اختیار اسی کے ہاتھ میں ہے اور وہ سب سے زیادہ تیز حساب چکانے والا ہے۔ ۶۰-۶۲

ان سے پوچھو، خشکی اور تری کی تاریکیوں سے تم کو کون نجات دیتا ہے جبکہ اسی کو تم پکارتے ہو گڑگڑا کر اور چپکے چپکے کہ اگر اس نے ہم کو نجات دے دی اس مصیبت سے تو ہم اس کے شکر گزار بندوں میں سے بن جائیں گے؟ کہہ دو اللہ ہی تم کو نجات دیتا ہے اس مصیبت سے بھی اور دوسری ہر تکلیف سے لیکن تم پھر شرک کرنے لگتے ہو۔ کہہ دو، خدا قادر ہے اس بات پر کہ تم پر تمھارے اوپر سے کوئی عذاب بھیج دے یا تمھارے پاؤں کے نیچے سے کوئی عذاب اٹھا دے یا تم کو گروہ در گروہ کر کے آپس ہی میں گتھم گتھا کر دے اور ایک کو دوسرے کے تشدد کا مزا اچھی طرح چکھا دے۔ دیکھو، کس کس طرح

ہم اپنی آیتیں مختلف پہلوؤں سے بیان کرتے ہیں تاکہ وہ سمجھیں۔ ۶۳-۶۵

اور تمھاری قوم نے اس کی تکذیب کردی حالانکہ وہ بالکل حق ہے۔ کہہ دو میں تمھارے اوپر کوئی داروغہ نہیں مقرر ہوا ہوں۔ ہر بات کے لیے ایک وقت مقرر ہے اور تم عنقریب جان لوگے۔ ۶۶-۶۷

۹- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

قُلْ اِنِّیْ نُهِیْتُ اَنْ اَعْبُدَ الَّذِیْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ قُلْ لَّاۤ اَتَّبِعُ اَهْوَآءَكُمْ ۙ قَدْ ضَلَلْتُ اِذًا وَّمَاۤ اَنَا مِنَ الْمُهْتَدِیْنَ (۵۶)

لفظ 'قُلْ' کا عام محل استعمال

لفظ 'قُلْ' اس آیت میں بھی ہے اور بعد کی آیات میں بھی بار بار آیا ہے۔ یہ اس بات کا قرینہ ہے کہ یہ سب باتیں ان شبہات، اعتراضات، سوالات اور مطالبات کے جواب میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے کہلائی گئی ہیں جو اس وقت بحث کی گرما گرمی میں کفار کی طرف سے پیش کیے گئے۔ ان کو اچھی طرح سمجھنے کے لیے ان کے پس منظر کو سامنے رکھنا ضروری ہوتا ہے اس لیے کہ قرآن میں یہ وضاحت ہر جگہ موجود نہیں ہوتی کہ فلاں بات کفار کی کس بات کے جواب میں کہلائی گئی۔

شرک کی بنیاد خواہش پر ہے

اوپر آیت ۴۱ میں ارشاد ہوا ہے کہ 'مجھے تو حکم ملا ہے کہ میں سب سے پہلے اسلام لانے والا بنوں اور مشرکوں میں سے نہ بنوں'۔ اس کے بعد یہ بات بیان ہوئی ہے کہ اس باب میں کہ خدا کا کوئی شریک ہے یا نہیں، سب سے بڑی شہادت تو خدا ہی کی ہو سکتی ہے اور خدا کی شہادت جو بشکل قرآن مجھ پر نازل ہوئی ہے وہ تو یہی ہے کہ وہ وحدہٗ لاشریک ہے۔ اس وجہ سے میں اس شہادت کے خلاف کسی کو اس کا شریک ٹھہرانے کے لیے تیار نہیں ہوں۔ یہاں اسی اعلان کو منفی پہلو سے دہرایا کہ تم جن چیزوں کو اللہ کے سوا پکارتے ہو مجھے ان کی بندگی سے منع کیا گیا ہے۔ یہاں پکارنے سے مراد ظاہر ہے کہ وہ پکارنا ہے جو دعا اور استرحام کی نوعیت کا ہو۔ اس طرح اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو پکارنا درحقیقت اس کی عبادت ہے اور یہ چیز شرک ہے۔ اس کے بعد فرمایا کہ 'تم اعلان کر دو کہ میں تمھاری خواہشوں کی پیروی نہیں کر سکتا'۔ 'خواہشوں' سے مراد مشرکانہ بدعات ہیں اور 'اھوا' کے لفظ سے تعبیر کر کے قرآن نے ان کے بے بنیاد ہونے کو واضح فرمایا ہے کہ ان کے شریک خدا ہونے کی کوئی شہادت نہ تو عقل و فطرت کے اندر موجود ہے نہ خدا کے کلام و الہام میں محض اپنے جی سے تم نے یہ چیزیں گھڑی ہیں اور چونکہ ان کی موہوم شفاعت کی امید نے تمھیں ایمان و عمل اور فکر آخرت کی تمام

ذمہ داریوں سے فارغ کر دیا ہے، اس وجہ سے یہ تمہارے نفس کو بہت پسند ہیں۔ بہر حال تمہیں پسند ہیں تو ہوں لیکن حقیقت اور خواہش میں بڑا فرق ہے۔ میرے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ میں حقیقت کو نظر انداز کر کے تمہاری جھوٹی آرزوؤں، باطل خواہشوں اور بے سند بدعات کی پیروی کروں۔ فرمایا کہ اگر میں ایسا کروں تو میں راہِ ہدایت سے بھٹک جاؤں گا اور پھر کبھی راہِ ہدایت پانے والا نہ بن سکوں گا۔ مطلب یہ ہے کہ اوّل تو شرک کی ضلالت ہے ہی ایسی ضلالت کہ آدمی صراطِ مستقیم سے ہٹ کر ایسی کج پیچ کی پگڈنڈیوں میں گم ہو جاتا ہے کہ اس کے لیے اصل راہ پر آنا ناممکن ہو جاتا ہے، دوسرے خدا کی صریح ممانعت کے بعد اگر میں نے یہ غلطی کی تو پھر کون ہے جس کی توفیق بخشی میرا سہارا بنے گی اور وہ میرا ہاتھ پکڑ کر صحیح راہ پر لائے گا؟

قُلْ اِنِّیْ عَلٰی بَیِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّیْ وَكَذَّبْتُمْ بِهٖ ؕ مَا عِنْدِیْ مَا تَسْتَعْجِلُوْنَ بِهٖ ؕ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ یَقُصُّ الْحَقَّ وَهُوَ خَیْرُ الْفٰصِلِیْنَ ۝ قُلْ لَّوْ اَنَّ عِنْدِیْ مَا تَسْتَعْجِلُوْنَ بِهٖ لَقُضِیَ الْاَمْرُ بَیْنِیْ وَبَیْنَكُمْ ؕ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِالظّٰلِمِیْنَ (۵۷-۵۸)

بَیِّنَة سے مراد قرآن ہے

قُلْ اِنِّیْ عَلٰی بَیِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّیْ وَكَذَّبْتُمْ بِهٖ، 'بَیِّنَة' سے مراد قرآن مجید ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف سے بطورِ شہادت اتارا ہے کہ اس کا کوئی شریک و سہیم نہیں ہے۔ اس شہادت کا ذکر پیچھے آیت ۱۹ میں گزر چکا ہے۔ آگے آیت ۱۵۷ میں قرآن کے لیے یہی لفظ استعمال ہوا ہے اَوْ تَقُوْلُوْا لَوْ اَنَّاۤ اُنْزِلَ عَلَیْنَا الْكِتٰبُ لَكُنَّاۤ اَهْدٰی مِنْهُمْ ۚ فَقَدْ جَآءَكُمْ بَیِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَهُدًی وَّرَحْمَةٌ (یا کہیں تم یہ کہو کہ اگر ہم پر کتاب اتاری جاتی تو ہم ان سے زیادہ ہدایت یافتہ ہوتے، سو دیکھ لو تمہارے پاس بھی تمہارے رب کی جانب سے ایک واضح شہادت اور ہدایت و رحمت آگئی) وَكَذَّبْتُمْ بِهٖ میں ضمیر کا مرجع 'بَیِّنَة' ہے، لیکن لحاظ مفہوم کا ہے اس وجہ سے ضمیر مذکر آئی ہے۔ قرآن میں یہ اسلوب بہت استعمال ہوا ہے کہ ضمیر لفظ کے ظاہر کے لحاظ سے نہیں بلکہ اس کے مفہوم کے لحاظ سے استعمال ہوئی ہے۔ علامہ ابن قیمؒ نے اپنی کتابوں میں اس اسلوب پر بڑی سیر حاصل بحث کی ہے۔ مناسب مواقع پر ہم اس کی بلاغت پر بحث کریں گے۔ یہاں قرآن کے لیے 'بینۃ' کا لفظ استعمال کر کے اس کا ایک حجتِ قاطع اور شہادتِ واضح ہونا ظاہر کر دیا ہے پھر ضمیر اس کے لیے مذکر کی استعمال کر کے یہ بھی ظاہر کر دیا کہ اس سے مراد قرآن ہے۔

قرآن ایک حجتِ قاطع ہے

مطلب آیت کا یہ ہے کہ تم تو محض ہوا میں تیر چلا رہے ہو اور اپنی خواہشوں کی پرستش کر رہے ہو، تمہارے پاس اپنے ان فرضی معبودوں کے حق میں کوئی دلیل نہیں ہے جس سے تم یہ ثابت کر سکو کہ خدا نے ان کو اپنا شریک بنایا ہے۔ اس کے برعکس میں خدا کی طرف سے ایک حجت، ایک برہان اور ایک قطعی شہادت پر ہوں اور اسی کو تمہارے سامنے پیش کر رہا ہوں۔ خدا نے یہ 'بینۃ' خود مجھ پر اتاری ہے اور یہ ایسی واضح ہے کہ اس کی تکذیب کی گنجائش نہیں ہے لیکن تم اس کی تکذیب کرتے ہو اور بجائے اس کے کہ اس کو سمجھو اور مانو مجھ سے مطالبہ کرتے ہو کہ میں تمہیں خدا کا عذاب دکھا دوں تو تم اس کتاب کی صداقت تسلیم کرو گے 'مَا

عندی ما تستعجلون بہٖ' سو یہ عذاب، جس کے لیے تم جلدی مچائے ہوئے ہو، میرے پاس نہیں ہے۔ اس معاملہ کا فیصلہ کرنا خدا ہی کے اختیار میں ہے۔ میں جو کچھ کہہ سکتا ہوں وہ یہ ہے کہ وہ حق کو واضح اور اس نزاع کا فیصلہ کرے گا اور نہایت بہتر طریقہ پر فیصلہ کرے گا۔ وہ بہترین فیصلہ کرنے والا ہے۔ فرمایا کہ ان سے کہہ دو کہ اگر وہ چیز جس کے لیے تم جلدی مچائے ہوئے ہو میرے اختیار میں ہوتی تو میرے اور تمھارے درمیان جھگڑے کا فیصلہ ہو جاتا۔

'وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِالظّٰلِمِيْنَ' میں دو پہلو ہیں۔ ایک تو ان کفار کے لیے دھمکی ہے کہ خدا ان ظالموں سے خوب باخبر ہے چنانچہ وہ ان کے ساتھ وہی معاملہ کرے گا جس کے وہ مستحق ہیں۔ دوسرا پہلو اس میں تفویض کا ہے کہ خدا ان ظالموں سے خوب واقف ہے، پس ان کا معاملہ اسی کے حوالے ہے۔ یہاں ظلم سے مراد اپنی جان پر ظلم ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ خود اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے ہیں۔ خدا ان کو اپنی رحمت دے رہا ہے لیکن یہ اس کے عذاب کے طالب ہیں۔ ان کو روٹی دی جا رہی ہے لیکن یہ پتھر مانگتے ہیں۔ ان کو مچھلی عنایت ہوئی ہے مگر یہ سانپ پکڑنے کے درپے ہیں۔

وَعِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَآ اِلَّا هُوَ ۭ وَيَعْلَمُ مَا فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ ۭ وَمَا تَسْقُطُ مِنْ وَّرَقَةٍ اِلَّا يَعْلَمُهَا وَلَا حَبَّةٍ فِيْ ظُلُمٰتِ الْاَرْضِ وَلَا رَطْبٍ وَّلَا يَابِسٍ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ (٥٩)

خدا کا علم محیطِ کل ہے

'مفاتح' 'مفتح' کی جمع ہے جس کے معنی کنجی کے ہیں۔ یعنی غیب کے خزانوں کی کنجیاں اسی کے پاس ہیں، اس کے سوا ان کا علم کسی کے پاس نہیں ہے۔ یہی مضمون دوسرے الفاظ میں یوں بیان ہوا ہے لَهٗ مَقَالِيْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَاۗءُ وَيَقْدِرُ ۔ ١٢ شوریٰ (اسی کے قبضہ میں ہیں آسمانوں اور زمین کی کنجیاں، وہ جس کے لیے چاہتا ہے رزق کشادہ کر دیتا ہے، جس کے لیے چاہتا ہے تنگ کر دیتا ہے) 'بر و بحر' اور رطب و یابس وغیرہ الفاظ احاطہ کے مضمون کو ظاہر کرتے ہیں۔ یعنی خدا کا علم ہر چیز کو محیط ہے۔ 'ظلمات الارض' سے مراد زمین کی تہیں اور اس کے طبقات ہیں۔

علمِ الٰہی اور توحید و آخرت کا باہمی ربط

یہ اوپر والے مضمون کی مزید توسیع ہے۔ جب فرمایا کہ 'میرے اختیار میں وہ چیز نہیں ہے جس کے لیے تم جلدی مچائے ہوئے ہو، اس امر میں فیصلہ کا اختیار صرف خدا کو ہے' تو علمِ الٰہی کی وسعت اور اس کے احاطہ کے بیان کے لیے ایک نہایت موزوں تقریب پیدا ہو گئی۔ اللہ تعالیٰ کے علم کی اس وسعت کا اعتقاد ہی ہے جو اہل ایمان کے اندر کامل تفویض، کامل اعتماد اور کامل رضا بالقضا کا حوصلہ پیدا کرتا ہے۔ اس میں معمولی غلط فہمی بھی شرک کی راہیں کھول دیتی ہے۔ یہی چیز آخرت پر سچے اور پکے ایمان کی بنیاد ہے اور اسی کے صحیح تصور و تذکر سے انسان کے اندر وہ خشیت بھی پیدا ہوتی ہے جو زندگی میں اس کو صحیح روش اختیار کرنے پر آمادہ کرتی ہے۔ قرآن کے اس بیان سے ان لوگوں کی بھی پوری پوری تردید ہو گئی جو خدا کو صرف کلیات کا عالم مانتے ہیں۔ خدا صرف کلیات ہی کا نہیں بلکہ تمام جزئیات کا بھی عالم ہے۔ درخت سے جو پتا

گرتا ہے، زمین کی تہوں میں جو دانہ ڈالا جاتا ہے، سب اس کے علم میں ہوتا ہے اور ہر خشک و تر اس کے رجسٹر میں درج ہے اور یہ رجسٹر ایسا نہیں ہے جس میں اس کو کوئی چیز ڈھونڈنی پڑتی ہو بلکہ اس کی ہر چیز ہر آن بالکل واضح ہے، یہ اللہ تعالیٰ کے محیط کل علم کی ایک تعبیر ہے۔

وَهُوَ الَّذِیْ یَتَوَفّٰىكُمْ بِالَّیْلِ وَیَعْلَمُ مَا جَرَحْتُمْ بِالنَّهَارِ ثُمَّ یَبْعَثُكُمْ فِیْهِ لِیُقْضٰۤى اَجَلٌ مُّسَمًّى ۚ ثُمَّ اِلَیْهِ مَرْجِعُكُمْ ثُمَّ یُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝ وَهُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهٖ وَیُرْسِلُ عَلَیْكُمْ حَفَظَةً ؕ حَتّٰۤى اِذَا جَآءَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ تَوَفَّتْهُ رُسُلُنَا وَهُمْ لَا یُفَرِّطُوْنَ ۝ ثُمَّ رُدُّوْۤا اِلَى اللّٰهِ مَوْلٰىهُمُ الْحَقِّ ؕ اَلَا لَهُ الْحُكْمُ ۫ وَهُوَ اَسْرَعُ الْحٰسِبِیْنَ (۶۰-۶۲)

موت، برزخ اور حشر کا تمثیلی مشاہدہ

علم الٰہی کے اس بیان نے موت کے بعد زندگی، اس زندگی کے بعد حساب کتاب اور جزا سزا کی یاد دہانی کے لیے اس طرح تقریب پیدا کر دی گویا بات میں سے بات نکل آئی ہے۔ یہ بات یہاں یاد رکھنے کی ہے کہ آخرت کے باب میں بڑا مغالطہ لوگوں کو علم الٰہی کے صحیح تصور کے فقدان ہی سے پیدا ہوا ہے۔ کم فہم انسان سمجھتا ہے کہ اتنی بے شمار مخلوق کے مرنے اور جینے اور اس کے قول و فعل کے ایک ایک جزئیہ کا علم بھلا کس کو ہو سکتا ہے کہ وہ سب کو موت کے بعد دوبارہ زندہ کرے، ان کو جمع کرے اور پھر ان کا حساب کرنے بیٹھے۔ قرآن نے اسی استبعاد اور اسی مغالطہ کو یہاں دور فرمایا ہے۔

پہلے فرمایا کہ وہی خدا جو درخت سے گرنے والے ہر پتے اور زمین میں دفن ہونے والے ہر دانے کو جانتا ہے تمھیں مرنے کے بعد پھر اٹھائے گا اور جو کچھ تم نے اس دنیا میں کیا ہوگا اس سے تمھیں آگاہ کرے گا۔ اس بات کی تمہید اس طرح اٹھائی ہے کہ یہ مرنا اور مرنے کے بعد از سر نو اٹھنا اور اپنے سارے کیے دھرے سے آگاہ کیا جانا کوئی بہت بعید از قیاس چیز نہیں ہے بلکہ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کا ریہرسل ہر شب و روز تمھاری اپنی نگاہوں کے سامنے ہو رہا ہے۔ ہر شب میں خدا تمھیں وفات دیتا ہے اور جب وفات دیتا ہے تو وہ سب کچھ اس کے علم میں ہوتا ہے جو دن میں تم نے کیا ہوتا ہے۔ پھر دوسرے دن میں خدا تم کو اٹھاتا ہے اور اس طرح تمھاری وہ مدت حیات اور اجل معین پوری ہوتی ہے جو خدا نے تم میں سے ہر ایک کے لیے مقرر کی ہوئی ہے۔ گویا زندگی، موت، برزخ اور موت کے بعد اٹھائے جانے کا تمثیلی مشاہدہ تم میں سے ہر شخص کو ہر روز کرایا جا رہا ہے، خدا نے یہ دنیا بنائی ہی اس طرح ہے کہ وہ اپنی رات اور دن کی گردشوں سے ان تمام حقائق کا درس دے رہی ہے جن کی تمھیں دعوت دی جا رہی ہے بشرطیکہ تمھارے پاس دیکھنے والی آنکھیں اور سمجھنے والے دل ہوں۔ قرآن نے یہاں ہر شب میں سونے کو 'وفات' سے اور ہر صبح کے اٹھنے کو 'بعث' سے تعبیر کر کے توجہ دلائی ہے کہ مرنا اور اٹھنا تو ہر روز ہو رہا ہے، جس طرح تمھارا سونا اور جاگنا ہے اسی طرح تمھارا مرنا اور اٹھنا ہے اور جس طرح تم میں سے کسی سونے والے کے دن کے اعمال سے خدا لاعلم نہیں ہوتا اسی طرح جب تم موت کی نیند سو گے تو خدا تمھاری زندگی کے اعمال بھول نہیں جائے گا اور جس طرح تمھاری ہر شب کی نیند

کے بعد صبح ہوتی ہے اور تم آنکھیں ملتے ہوئے اٹھ بیٹھتے ہو اسی طرح موت کی نیند کے بعد قیامت کی صبح آئے گی اور تم ایسا محسوس کرو گے کہ یہ جو کچھ ہوا سب صبح و شام کا قصہ ہے۔

ہر جان ہر لحظہ خدا کی نگرانی میں ہے

وَهُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهِ الآیۃ، لفظ 'قہر' کا مفہوم آیت ۱۸ اور 'تفریط' کا مفہوم آیت ۳۸ کے تحت بیان ہو چکا ہے۔ 'حَفَظَةً' 'حافظ' کی جمع ہے جس کے معنی کسی شے کی نگرانی کے ذمہ دار کے ہیں۔ اس سے مراد یہاں وہ خدائی پہرہ دار ہیں جو ہر جان پر خدا کی طرف سے برابر مقرر رہتے ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ کوئی یہ نہ خیال کرے کہ خدا اپنی مخلوق کے کسی فرد اور اپنے گلے کی کسی بھیڑ سے کبھی غافل ہوتا ہے، سب ہر وقت اسی کے کنٹرول میں ہیں۔ وہ برابر اپنے نگران فرشتوں کو ان پر مقرر رکھتا ہے جو ایک پل کے لیے بھی ان کی نگرانی سے غافل نہیں ہوتے۔ پھر جب کسی کی موت کا وقت آتا ہے تو فرمایا ہمارے فرستادہ فرشتے ہی اس کی روح قبض کرتے ہیں اور مجال نہیں ہے کہ وہ اس کام میں کوئی کوتاہی کریں؛ نہ ان کے قابو سے کوئی باہر نکل سکتا، نہ کسی کو وہ فراموش کر سکتے، نہ کسی کی موت ایک لمحہ کے لیے بھی آگے پیچھے ہو سکتی۔

'ثُمَّ رُدُّوا إِلَى اللَّهِ مَوْلَاهُمُ الْحَقِّ' پھر سب اللہ ہی کی طرف، جو سب کا مولائے حقیقی ہے لوٹائے جائیں گے۔ یعنی مرنے کے بعد سابقہ ہر ایک کو خدا ہی سے پیش آنا ہے اس لیے کہ مولائے حقیقی وہی ہے۔ دوسرے شرکا، و شفعا جو لوگوں نے گھڑ رکھے ہیں وہ کچھ کام نہیں آئیں گے۔ 'أَلَا لَهُ الْحُكْمُ' اور کان کھول کر سن لو کہ فیصلہ کا سارا اختیار تنہا اسی کے ہاتھ میں ہوگا۔ اس کے اذن کے بغیر کوئی اس کے سامنے زبان نہ کھول سکے گا۔ 'وَهُوَ أَسْرَعُ الْحَاسِبِينَ' یعنی یہ نہ سمجھو کہ ساری خدائی کے اتنے لمبے چوڑے حساب میں اس کو کچھ زحمت پیش آئے گی یا اس میں زمانہ صرف ہو جائے گا۔ وہ سارا حساب ایک لمحہ میں سب کے سامنے رکھ دے گا۔ اس کی 'کتاب مبین'، ہر شخص کے ہر چھوٹے بڑے عمل کا سارا ریکارڈ اس کے آگے پیش کر دے گی۔

قُلْ مَنْ يُنَجِّيكُمْ مِنْ ظُلُمَاتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ تَدْعُونَهُ تَضَرُّعًا وَخُفْيَةً لَئِنْ أَنْجَانَا مِنْ هَٰذِهِ لَنَكُونَنَّ مِنَ الشَّاكِرِينَ ۝ قُلِ اللَّهُ يُنَجِّيكُمْ مِنْهَا وَمِنْ كُلِّ كَرْبٍ ثُمَّ أَنْتُمْ تُشْرِكُونَ ۝ قُلْ هُوَ الْقَادِرُ عَلَىٰ أَنْ يَبْعَثَ عَلَيْكُمْ عَذَابًا مِنْ فَوْقِكُمْ أَوْ مِنْ تَحْتِ أَرْجُلِكُمْ أَوْ يَلْبِسَكُمْ شِيَعًا وَيُذِيقَ بَعْضَكُمْ بَأْسَ بَعْضٍ ۗ انْظُرْ كَيْفَ نُصَرِّفُ الْآيَاتِ لَعَلَّهُمْ يَفْقَهُونَ ۝ وَكَذَّبَ بِهِ قَوْمُكَ وَهُوَ الْحَقُّ ۚ قُلْ لَسْتُ عَلَيْكُمْ بِوَكِيلٍ ۝ لِكُلِّ نَبَإٍ مُسْتَقَرٌّ ۚ وَسَوْفَ تَعْلَمُونَ (۶۳ - ۶۷)

ظلمات بحر و بر سے مراد

قُلْ مَنْ يُنَجِّيكُمْ مِنْ ظُلُمَاتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ۔ 'ظُلُمٰت' مصائب اور آفات کی تعبیر ہے۔ سمندر کی تاریکیوں کا ذکر قرآن نے سورۂ نور میں یوں فرمایا ہے۔ 'أَوْ كَظُلُمَاتٍ فِي بَحْرٍ لُجِّيٍّ يَغْشَاهُ مَوْجٌ مِنْ فَوْقِهِ مَوْجٌ مِنْ فَوْقِهِ سَحَابٌ ۚ ظُلُمَاتٌ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ إِذَا أَخْرَجَ يَدَهُ لَمْ يَكَدْ يَرَاهَا'

۴۰ - نور

(یا کسی گہرے سمندر کی تاریکیاں جس میں موج کے اوپر موج اٹھ رہی ہو، اور اس کے اوپر بادل چھائے ہوئے ہوں۔ تاریکیوں کے اوپر تاریکی۔ جب اپنا ہاتھ نکالے تو وہ بھی اس کو سجھائی نہ دے) اسی طرح کے طوفانوں اور مصائب سے آدمی کو خشکی میں بھی سابقہ پیش آجاتا ہے۔

تَدْعُوْنَهٗ تَضَرُّعًا وَّ خُفْيَةً ۔ تَدْعُوْنَ اَيْنَجِيْكُمْ کی ضمیر مفعول سے حال پڑا ہوا ہے۔ لفظ کی تحقیق آیت ۴۳ کے تحت گزر چکی ہے۔ یہاں اس کے بالمقابل 'خفیۃ' کا لفظ ہے جس کے معنی چپکے چپکے کے ہیں۔ اس وجہ سے تضرع کے معنی گڑگڑانے اور آہ وزاری کے ساتھ التجا و فریاد کرنے کے ہوں گے لَئِنْ اَنْجٰنَا الایۃ، اسی دعا کا بیان ہے جو اس طرح کے حالات میں ہر شخص کے دل اور زبان پر ہوتی ہے۔

اَوْ يَلْبِسَكُمْ شِيَعًا الایۃ، 'لبس' کے معنی خلط، یعنی ملانے اور گڈمڈ کرنے کے ہیں۔ یہاں مطلب یہ ہے کہ تم کو گروہ در گروہ کر کے آپس میں ایک دوسرے سے گتھم گتھا کر دے۔

'وَكَذَّبَ بِهٖ قَوْمُكَ'، میں ضمیر کا مرجع وہ عذاب بھی ہو سکتا ہے جس کا آیت ۵۸ میں ذکر ہے اور قرآن بھی ہو سکتا ہے جو اس عذاب کی خبر دے رہا ہے اور جس کی طرف آیت ۵ میں اشارہ ہے۔

لِكُلِّ نَبَاٍ مُّسْتَقَرٌّ، 'نبا' کسی اہم حادثہ کی خبر کو کہتے ہیں۔ یہاں اس سے مراد اس عذاب کی خبر ہے جو قرآن دے رہا تھا۔ مستقر، موضع استقرار اور وقت استقرار دونوں مفہوم میں ہو سکتا ہے۔ نیز مصدر کے معنی میں بھی ہو سکتا ہے۔ ہم نے وقت استقرار کے مفہوم میں لیا ہے۔

انسان کی ایک نفسیاتی بیماری

توحید کی ایک انفسی دلیل

ان آیات میں انسان کی ایک نفسیاتی بیماری سے بھی پردہ اٹھایا ہے اور ساتھ ہی توحید کی ایک نفسیاتی دلیل کی طرف بھی اشارہ فرمایا ہے۔ سیاق کلام وہی مطالبۂ عذاب کی تردید کا ہے جو اوپر سے چلا آ رہا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ انسان کا عجیب حال ہے کہ جب کسی آفت میں گرفتار ہوتا ہے تب تو گڑگڑا کر بھی اور دل میں چپکے چپکے بھی خدا ہی کو پکارتا ہے اور یہ عہد کرتا ہے کہ اس مصیبت سے خدا نے نجات دی تو اب اس کا شکر گزار اور فرمانبردار بندہ بن کر زندگی گزاروں گا۔ لیکن جب اس سے نجات پا جاتا ہے تو پھر ناشکری و نافرمانی کی وہی زندگی اختیار کر لیتا ہے جس میں پہلے مبتلا تھا اور یہ سمجھ بیٹھتا ہے گویا خدا کی خدائی سے باہر ہو گیا ہے اور اب کبھی خدا کی پکڑ میں آ ہی نہیں سکتا۔ یہاں تک کہ اگر خدا کی پکڑ سے اس کو ڈرایا جاتا ہے تو ڈھیٹ ہو کر عذاب کا مطالبہ کرتا ہے کہ عذاب دکھا دو تو مانوں گا۔ فرمایا کہ ان سے پوچھو کہ سمندر میں یا خشکی میں جب تم کسی مصیبت میں پھنس جاتے ہو تو کون تم کو اس گرداب مصیبت سے نجات دیتا ہے جبکہ تم خدا ہی کو گڑگڑا کر اور چپکے چپکے پکارتے ہو اور یہ عہد کرتے ہو کہ اگر خدا نے ہمیں آفت سے بچایا تو ہم اس کے شکر گزار بندے بن کر زندگی بسر کریں گے؟ پھر خود ہی اس کا جواب دلوایا کہ وہ خدا ہی ہے جو تمہیں اس آفت سے بھی نجات دیتا ہے اور دوسری تمام مصیبتوں سے بھی وہی نجات دیتا ہے، خواہ چھوٹی ہوں یا بڑی اور خواہ تم ان کے لیے اس کو پکارو یا نہ پکارو، لیکن تمہارا حال یہ ہے کہ اس کے بعد پھر تم شرک کرنے لگتے ہو۔

یہاں دو باتیں خاص طور پر نگاہ میں رکھنے کی ہیں۔ ایک توحید کی نفسیاتی دلیل جو ضمناً بیان ہوگئی ہے وہ یہ ہے کہ جب انسان کسی سخت مصیبت میں پھنستا ہے تو وہ خدا ہی کی طرف متوجہ ہوتا ہے، دوسرے تمام سہارے اس کے نزدیک بے حقیقت ہو جاتے ہیں۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ انسان کی اصل فطرت کے اندر صرف خدا ہی کا اعتماد جاگزیں ہے، دوسری چیزیں محض بناوٹی ہیں جو آزمائش کی بھٹی میں پڑنے کے بعد جھوٹے ملمع کی طرح اڑ جاتی ہیں۔ یہ دلیل قرآن میں مختلف اسلوبوں سے نہایت موثر تمثیلوں میں بیان ہوئی ہے۔ ہم نے اس کی پوری وضاحت اپنی کتاب 'حقیقت توحید' میں مستقل عنوان سے کی ہے۔

دوسری یہ کہ یہاں شکر اور شرک کو دو مقابل چیزوں کی حیثیت سے رکھا ہے جس سے یہ بات نکلتی ہے کہ شرک صرف یہی نہیں ہے کہ آدمی بتوں کو پوجے بلکہ وہ استکبار بھی شرک ہے جس میں مبتلا ہو کر انسان اللہ کی نعمتوں کو اپنے استحقاق ذاتی کا ثمرہ اور اپنی تدبیر و قابلیت کا نتیجہ سمجھنے لگتا ہے اور پھر فخر و غرور کے نشہ میں اکڑتا، دندناتا، اتراتا اور من مانی کرنے لگ جاتا ہے۔ یہ حالت شکر کی ضد ہے اور جس کے اندر یہ خناس سما جاتا ہے وہ خود اپنے آپ کو خدائی میں شریک سمجھنے لگتا ہے۔ قرآن نے اس ذہنیت کی تصویر سورہ کہف میں اس طرح کھینچی ہے

وَاضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلًا رَّجُلَيْنِ جَعَلْنَا لِاَحَدِهِمَا جَنَّتَيْنِ مِنْ اَعْنَابٍ وَّحَفَفْنٰهُمَا بِنَخْلٍ وَّجَعَلْنَا بَيْنَهُمَا زَرْعًا ۝ كِلْتَا الْجَنَّتَيْنِ اٰتَتْ اُكُلَهَا وَلَمْ تَظْلِمْ مِّنْهُ شَيْـًٔا ۙ وَّفَجَّرْنَا خِلٰلَهُمَا نَهَرًا ۝ وَّكَانَ لَهٗ ثَمَرٌ ۚ فَقَالَ لِصَاحِبِهٖ وَهُوَ يُحَاوِرُهٗٓ اَنَا اَكْثَرُ مِنْكَ مَالًا وَّاَعَزُّ نَفَرًا ۝ وَدَخَلَ جَنَّتَهٗ وَهُوَ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ ۚ قَالَ مَآ اَظُنُّ اَنْ تَبِيْدَ هٰذِهٖٓ اَبَدًا ۝ وَّمَآ اَظُنُّ السَّاعَةَ قَآئِمَةً وَّلَئِنْ رُّدِدْتُّ اِلٰى رَبِّيْ لَاَجِدَنَّ خَيْرًا مِّنْهَا مُنْقَلَبًا ۝ قَالَ لَهٗ صَاحِبُهٗ وَهُوَ يُحَاوِرُهٗٓ اَكَفَرْتَ بِالَّذِيْ خَلَقَكَ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ سَوّٰىكَ رَجُلًا ۝ لٰكِنَّا۠ هُوَ اللّٰهُ رَبِّيْ وَلَآ اُشْرِكُ بِرَبِّيْٓ اَحَدًا ۝

اور ان کے لیے دو شخصوں کی تمثیل بیان کرو۔ ان میں سے ایک کے لیے ہم نے انگور کے دو باغ بنائے، ان کو کھجور کے درختوں سے گھیرا اور ان کے درمیان کھیتی اگائی۔ دونوں باغ خوب پھل لائے، کچھ کمی نہیں کی۔ ہم نے ان کے درمیان ایک نہر جاری کی۔ اس میں پھل آئے تو اس نے اپنے ساتھی سے کہا اور وہ اس سے مفاخرت کر رہا تھا کہ میں تم سے مال میں زیادہ اور جمعیت میں قوی ہوں اور وہ اپنے باغ میں آیا اور وہ اپنی جان پر آفت لا رہا تھا اور بولا میں نہیں سمجھتا کہ یہ باغ کبھی برباد ہو سکے گا اور میں قیامت کے ہونے کا بھی گمان نہیں رکھتا اور اگر مجھے اپنے رب کی طرف جانا ہی ہوا تو اس سے بہتر ٹھکانا پاؤں گا۔ اس کے ساتھی نے جواب میں کہا کیا تم نے اس خدا کی ناشکری کی جس نے تم کو مٹی سے بنایا، پھر پانی کی ایک بوند سے، پھر ایک مرد بنا کر کھڑا کیا لیکن میرا رب تو وہی اللہ ہے، میں کسی کو اپنے

(کہف ۳۲-۳۸) رب کا شریک نہ بناؤں گا۔

قل ھوالقادر الآیۃ، یعنی یہ نہ سمجھو کہ آج اگر امن واطمینان کی زندگی حاصل ہے تو پھر کبھی خدا کی پکڑ میں آ ہی نہیں سکتے، خدا جب چاہے تمھارے اوپر سے پتھر برسا دے، بجلی گرا دے، گرد باد بھیج دے۔ اسی طرح جب چاہے، عین تمھارے پاؤں کے نیچے سے زلزلہ، سیلاب یا کوئی اور آفت ارضی بھیج دے۔ یہ نہیں تو تمھیں آپس ہی میں قبیلہ قبیلہ، گروہ گروہ اور قوم قوم کو باہم دگر ٹکرا دے اور ایک دوسرے کے ظلم وتشدد کا مزا چکھا دے۔ ان میں سے ہر بات، ہر وقت خدا کی قدرت میں ہے۔ فرمایا، دیکھو کس طرح ہم اپنی قدرت کی نشانیاں اور اپنے اختیار وتصرف کی دلیلیں مختلف اسلوبوں سے بیان کرتے ہیں کہ یہ سمجھیں لیکن یہ سمجھنے کے بجائے ہمارا عذاب ہی دیکھنا چاہتے ہیں۔

وَكَذَّبَ بِهٖ قَوْمُكَ وَهُوَ الْحَقُّ، یعنی قرآن نے ان کو جس عذاب کی دھمکی دی ہے وہ ایک امر واقعی اور شدنی ہے لیکن تمھاری قوم نے اس کی تکذیب کر دی ہے۔ اب ان کا معاملہ ہم پر چھوڑو اور ان سے کہہ دو کہ لَسْتُ عَلَيْكُمْ بِوَكِيْلٍ، میں تم پر کوئی داروغہ بنا کر نہیں بھیجا گیا ہوں کہ لازماً تمھیں ایمان واسلام کی راہ پر چلا ہی دوں ورنہ مجھ سے پرسش ہو جائے گی۔ میرے اوپر تو ذمہ داری صرف انذار وتبلیغ کی تھی وہ میں نے ادا کر دی۔ میں اپنی ذمہ داری سے سبکدوش ہوا۔ اب اگر تم عذاب کے لیے مچلے ہوئے ہو تو لِكُلِّ نَبَاٍ مُّسْتَقَرٌّ، ہر بات کے ظہور کے لیے خدا کی تقویم میں ایک وقت مقرر ہے۔ جب وہ وقت مقرر آ جائے گا تم خود اس کو دیکھ لو گے۔

۱۰۔ آگے کا مضمون ——— آیات ۶۸-۷۳

آگے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کی طرف التفات ہے کہ جو ضدی اور ہٹ دھرم لوگ بات سننا چاہتے ہی نہیں ان کے زیادہ درپے ہونے کی ضرورت نہیں ہے، جب دیکھو کہ یہ لوگ کج بحثیوں اور استہزا پر اتر آئے ہیں تو ان کو چھوڑ کر الگ ہو جاؤ، صرف اسی وقت ان کے سامنے کوئی بات پیش کرو جب وہ کچھ سننے سمجھنے کے موڈ میں نظر آئیں۔ تمھاری ذمہ داری تبلیغ وتذکیر تک محدود ہے۔ تم ان کے ایمان کے ذمہ دار تو ہو نہیں کہ ان کے دلوں میں ایمان اتار ہی دو۔ ان کی نت نئی فرمائشوں کی بھی پروا نہ کرو۔ بس اسی قرآن کے ذریعہ سے حق نصیحت ادا کر دو کہ جس کو سنبھلنا ہو سنبھل جائے، اپنے عمل کی پاداش میں مارا نہ جائے۔ خدا کے ہاں نہ کسی کی حمایت وسفارش کام آنی ہے اور نہ کوئی معاوضہ پیش کرنے کی گنجائش ہو گی۔

اس کے بعد پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے اعلان کرا دیا گیا ہے کہ ہم اللہ کی ہدایت پا جانے کے بعد شرک کی حیرانی وسرگشتگی میں پڑنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ ہمیں اپنے آپ کو اللہ رب العالمین کے حوالے

کرنے، اسی کی نماز پڑھنے اور اسی سے ڈرتے رہنے کی ہدایت ہوئی ہے، ہم نے اپنے آپ کو اسی کے حوالے کر دیا ہے۔ جس کا جی چاہے یہ راہ اختیار کرے، ورنہ جہاں چاہے بھٹکتا پھرے۔ مطلب یہ ہے کہ اب اس معاملے میں کسی بحث وجدال کی گنجائش نہیں ہے۔ ہم اپنے مذہب ومسلک کا واضح طور پر اعلان کیے دیتے ہیں۔

آخر میں اس کارخانۂ کائنات کے 'بالحق' ہونے کی طرف اشارہ فرمایا جس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ قیامت لازماً آنی ہے۔ اس دن خدا ہی کے اختیار میں فیصلہ ہوگا۔ وہ حکیم وخبیر ہے۔ اس دن حق کا حق ہونا اور باطل کا باطل ہونا سب پر واضح ہو جائے گا، اس وجہ سے یہ نہیں سنتے تو ان کا معاملہ اسی دن پر چھوڑ دو ـــ اس روشنی میں آگے کی آیات تلاوت فرمائیے۔

آیات ۶۸-۷۳

وَإِذَا رَأَيْتَ الَّذِينَ يَخُوضُونَ فِي آيَاتِنَا فَأَعْرِضْ عَنْهُمْ حَتَّىٰ
يَخُوضُوا فِي حَدِيثٍ غَيْرِهِ ۚ وَإِمَّا يُنسِيَنَّكَ الشَّيْطَانُ فَلَا
تَقْعُدْ بَعْدَ الذِّكْرَىٰ مَعَ الْقَوْمِ الظَّالِمِينَ ﴿٦٨﴾ وَمَا عَلَى الَّذِينَ
يَتَّقُونَ مِنْ حِسَابِهِم مِّن شَيْءٍ وَلَٰكِن ذِكْرَىٰ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُونَ ﴿٦٩﴾
وَذَرِ الَّذِينَ اتَّخَذُوا دِينَهُمْ لَعِبًا وَلَهْوًا وَغَرَّتْهُمُ الْحَيَاةُ الدُّنْيَا ۚ
وَذَكِّرْ بِهِ أَن تُبْسَلَ نَفْسٌ بِمَا كَسَبَتْ لَيْسَ لَهَا مِن دُونِ اللَّهِ
وَلِيٌّ وَلَا شَفِيعٌ وَإِن تَعْدِلْ كُلَّ عَدْلٍ لَّا يُؤْخَذْ مِنْهَا ۗ أُولَٰئِكَ
الَّذِينَ أُبْسِلُوا بِمَا كَسَبُوا ۖ لَهُمْ شَرَابٌ مِّنْ حَمِيمٍ وَعَذَابٌ أَلِيمٌ
بِمَا كَانُوا يَكْفُرُونَ ﴿٧٠﴾ قُلْ أَنَدْعُو مِن دُونِ اللَّهِ مَا لَا يَنفَعُنَا ع ۱۴
وَلَا يَضُرُّنَا وَنُرَدُّ عَلَىٰ أَعْقَابِنَا بَعْدَ إِذْ هَدَانَا اللَّهُ كَالَّذِي اسْتَهْوَتْهُ
الشَّيَاطِينُ فِي الْأَرْضِ حَيْرَانَ لَهُ أَصْحَابٌ يَدْعُونَهُ إِلَى الْهُدَى
ائْتِنَا ۗ قُلْ إِنَّ هُدَى اللَّهِ هُوَ الْهُدَىٰ ۖ وَأُمِرْنَا لِنُسْلِمَ لِرَبِّ
الْعَالَمِينَ ﴿٧١﴾ وَأَنْ أَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَاتَّقُوهُ ۚ وَهُوَ الَّذِي إِلَيْهِ

تُحْشَرُوْنَ ﴿۷۲﴾ وَهُوَ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ ؕ وَیَوْمَ
یَقُوْلُ كُنْ فَیَكُوْنُ ۚ قَوْلُهُ الْحَقُّ ؕ وَلَهُ الْمُلْكُ یَوْمَ یُنْفَخُ فِی الصُّوْرِ ؕ عٰلِمُ الثلثة
الْغَیْبِ وَالشَّهَادَةِ ؕ وَهُوَ الْحَكِیْمُ الْخَبِیْرُ ﴿۷۳﴾

ترجمۂ آیات ۶۸-۷۳

اور جب تم ان لوگوں کو دیکھو جو ہماری آیتوں میں میں میکھ نکالتے ہیں تو ان سے کنارہ کش ہو جاؤ یہاں تک کہ وہ کسی اور بات میں مصروف ہو جائیں۔ اور اگر شیطان تمھیں بھلا دے تو یاد آنے کے بعد ان ظالم لوگوں کے ساتھ نہ بیٹھو جو اللہ سے ڈرتے ہیں ان پر ان لوگوں کے حساب کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔ بس یاد دہانی کر دینا ہے تاکہ وہ بھی ڈریں۔ ان لوگوں کو چھوڑ دو جنھوں نے اپنے دین کو کھیل تماشا بنا رکھا ہے اور جن کو دنیا کی زندگی نے دھوکے میں ڈال رکھا ہے اور اسی کے ذریعہ سے یاد دہانی کرو کہ نہ ہو کہ کوئی جان اپنے کیے کی پاداش میں ہلاکت کے حوالے کی جائے۔ اللہ کے آگے نہ اس کا کوئی کارساز ہوگا نہ سفارشی اور اگر وہ ہر معاوضہ بھی دے تو بھی اس سے قبول نہ کیا جائے گا۔ یہی لوگ ہیں جو اپنے کیے کی پاداش میں ہلاکت کے حوالے کیے جائیں گے۔ ان کے لیے کھولتا پانی پینے کو اور ایک دردناک عذاب ہوگا ان کے کفر کی پاداش میں۔ ۶۸-۷۰

کہہ دو، کیا ہم اللہ کے سوا ایسی چیزوں کو پکاریں جو نہ تو ہمیں نفع پہنچاتی ہیں نہ نقصان اور ہم الٹے پیچھے پھینک دیے جائیں بعد اس کے کہ اللہ نے ہمیں ہدایت بخشی ہے، اس شخص کے مانند جس کو شیطانوں نے بیابان میں سرگشتہ و حیران چھوڑ دیا ہو، اس کے ساتھی اسے سیدھی راہ کی طرف بلا رہے ہوں کہ ہماری طرف آ جا۔ کہہ دو اللہ کی ہدایت ہی اصل ہدایت ہے اور ہمیں حکم ملا ہے کہ ہم اپنے آپ کو عالم کے رب کے حوالہ کریں۔ اور یہ کہ نماز قائم

کرو اور اسی سے ڈرتے رہو اور وہی ہے جس کے حضور تم سب اکٹھے کیے جاؤ گے اور وہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے غایت کے ساتھ۔ جس دن کہے گا ہو جا تو ہو جائے گا۔ اس کی بات شدنی ہے اور اسی کی بادشاہی ہوگی جس دن صور پھونکا جائے گا۔ وہ غائب و حاضر سب کا علم رکھنے والا ہے اور وہ حکیم و خبیر ہے۔ ۷۱-۷۳

۱۱- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَاِذَا رَاَیْتَ الَّذِیْنَ یَخُوْضُوْنَ فِیْٓ اٰیٰتِنَا فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ حَتّٰی یَخُوْضُوْا فِیْ حَدِیْثٍ غَیْرِهٖ ط وَاِمَّا یُنْسِیَنَّكَ الشَّیْطٰنُ فَلَا تَقْعُدْ بَعْدَ الذِّكْرٰی مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ ۝ وَمَا عَلَی الَّذِیْنَ یَتَّقُوْنَ مِنْ حِسَابِهِمْ مِّنْ شَیْءٍ وَّلٰكِنْ ذِكْرٰی لَعَلَّهُمْ یَتَّقُوْنَ ۝ وَذَرِ الَّذِیْنَ اتَّخَذُوْا دِیْنَهُمْ لَعِبًا وَّلَهْوًا وَّغَرَّتْهُمُ الْحَیٰوةُ الدُّنْیَا وَذَكِّرْ بِهٖٓ اَنْ تُبْسَلَ نَفْسٌۢ بِمَا كَسَبَتْ ۖ لَیْسَ لَهَا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِیٌّ وَّلَا شَفِیْعٌ ۚ وَاِنْ تَعْدِلْ كُلَّ عَدْلٍ لَّا یُؤْخَذْ مِنْهَا ط اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ اُبْسِلُوْا بِمَا كَسَبُوْا ۚ لَهُمْ شَرَابٌ مِّنْ حَمِیْمٍ وَّعَذَابٌ اَلِیْمٌۢ بِمَا كَانُوْا یَكْفُرُوْنَ (۶۸-۷۰)

'خوض' کا مفہوم

وَاِذَا رَاَیْتَ الَّذِیْنَ یَخُوْضُوْنَ الآیة 'خوض' کے معنی کسی چیز میں گھس جانے کے ہیں 'خاض الماء' وہ پانی میں گھس گیا۔ اسی سے 'خوض فی الحدیث' کا محاورہ نکلا ہے جس کے معنی ہیں بات میں سے بات نکالنا بال کی کھال ادھیڑنا، کسی بات میں اعتراض، نکتہ چینی اور کٹ حجتی کے نت نئے پہلو پیدا کرنے کی کوشش کرنا۔

قرآن کا مذاق اڑانے والوں کے پاس بیٹھنے کی ممانعت

قرآن میں یہ لفظ کئی جگہ استعمال ہوا ہے اور ہر جگہ اسی طرح کی سخن گستری کے لیے استعمال ہوا ہے جس کا مقصد کسی بات کو ہنسی دل لگی اور مذاق میں اڑا دینا ہو۔ مثلاً وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ لَیَقُوْلُنَّ اِنَّمَا كُنَّا نَخُوْضُ وَنَلْعَبُ ۝ (اگر تم ان سے پوچھو تو جواب دیں گے ہم تو بس ذرا سخن گستری اور شغول کر رہے تھے) یہاں بھی آگے والی آیت وَذَرِ الَّذِیْنَ اتَّخَذُوْا دِیْنَهُمْ لَعِبًا وَّلَهْوًا' میں لفظ کی اس حقیقت کو کھول دیا ہے اس لیے کہ اس سے مراد وہی لوگ ہیں جو آیات الٰہی میں 'خوض' کرتے ہیں۔ گویا 'خوض' کے بعد اس کا مقصد واضح کر دیا گیا ہے۔ قرآن نے سورۂ نساء میں اس 'خوض' کی تفسیر بھی فرما دی ہے۔ چنانچہ اسی آیت کا حوالہ دے کر جیسا کہ ہم تفسیر سورۂ نساء میں واضح کر چکے ہیں، وہاں فرمایا ہے۔ وَقَدْ نَزَّلَ عَلَیْكُمْ فِی الْكِتٰبِ اَنْ اِذَا سَمِعْتُمْ اٰیٰتِ اللّٰهِ یُكْفَرُ بِهَا وَیُسْتَهْزَاُ بِهَا فَلَا تَقْعُدُوْا مَعَهُمْ حَتّٰی یَخُوْضُوْا فِیْ حَدِیْثٍ غَیْرِهٖٓ (۱۴۰- نساء) (اور وہ قرآن میں تمھیں ہدایت دے چکا ہے کہ جب تم سنو کہ اللہ کی آیات کا کفر کیا جا رہا ہے اور ان کا مذاق اڑایا جا رہا ہے تو تم ان کے پاس نہ بیٹھو یہاں تک کہ وہ کسی دوسری

بات میں لگ جائیں) یہاں اس خوض کی وضاحت اللہ کی آیات کے کفر اور ان کا مذاق اڑانے سے کی گئی ہے۔

خطاب اگرچہ بصیغۂ واحد ہے مگر عام ہے

یہاں خطاب اگرچہ واحد کے صیغہ سے ہے جس کا غالب قرینہ یہی ہے کہ خطاب آنحضرتؐ سے ہو لیکن یہ خطاب آنحضرتؐ کے واسطہ سے تمام مسلمانوں سے ہے۔ چنانچہ اشارۃً آگے بتا بھی دیا ہے کہ یہ خطاب معناً عام ہی ہے۔ چنانچہ بعد والی آیت میں یہ جو فرمایا کہ وَمَا عَلَى الَّذِينَ يَتَّقُونَ مِنْ حِسَابِهِمْ مِنْ شَيْءٍ کہ خدا سے ڈرنے والوں پر ان کافروں کے کفر و ایمان کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے، اس نے اس خطاب کے پہلو کو واضح کر دیا کہ خطاب بحیثیت مجموعی تمام مسلمانوں سے ہے۔ پھر سورۂ نساء کی اس آیت میں جس کا حوالہ اوپر گزرا ہے، صاف لفظوں میں بتا دیا کہ یہ خطاب عام ہی ہے۔ اس لیے کہ وہاں سورہ انعام کی اسی ہدایت کی بنا پر ان لوگوں پر گرفت فرمائی جنھوں نے اس حکم کی خلاف ورزی کی تھی۔

اس ہدایت کے دو پہلو

اس ہدایت کے دو پہلو ہیں اور دونوں نہایت اہم ہیں۔

ایک تو یہ کہ یہ رویہ اس حکمتِ دعوت کے خلاف ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے دین کی تبلیغ کے لیے پسند فرمائی ہے۔ جس وقت کسی گروہ پر کسی چیز کی مخالفت، اس کی تضحیک اور اس کی تردید کا بخار چڑھا ہوا ہو اور بخار کی شدت سے مریض کی کیفیت ہذیانی ہو رہی ہو عین اسی حالت میں اس کے سامنے اس چیز کو پیش کرنا گویا اس کے بخار اور ہذیان دونوں کو مزید بڑھا دینا ہے۔ اگر کوئی معالج مریض کی بیماری ہی میں اضافہ چاہتا ہو تو وہ تو آزاد ہے جو چاہے کرے لیکن کوئی مہربان طبیب جو مریض کی صحت کا خواہاں ہے وہ کبھی ایسی غلطی نہیں کرے گا۔ اسی رعایت احوال کے پیشِ نظر یہاں مسلمانوں کو ہدایت ہوئی کہ جب تم دیکھو کہ یہ اسلام کے مخالفین قرآن کا مذاق اڑانے پر تلے ہوئے، طنز و تضحیک کے ترکش سنبھالے ہوئے اور مخالفت کے لیے آستین چڑھائے ہوئے ہیں تو اس وقت طرح دے جاؤ اور کسی ایسے وقت کا انتظار کرو جب یہ بحرانی کیفیت ذرا دور ہو جائے تو اس وقت ان کو سنانے اور سمجھانے کی کوشش کرو۔

دوسرا یہ کہ یہ اس غیرتِ حق کے منافی ہے جو اہل ایمان کے اندر ہوتی ہے یا ہونی چاہیے۔ اگر کوئی شخص یا گروہ علانیہ خدا اور رسول کے خلاف بکواس کرتا ہے تو اس سے لڑنا بھی ایک داعی کے لیے غلط، جیسا کہ اوپر بیان ہوا، اور خاموش رہنا بھی غلط، اس لیے کہ اس سے وہ حمیت حق مجروح ہوتی ہے جو علامتِ ایمان ہے اور جس کا ضعف بالآخر درجہ بدرجہ آدمی کو اس نفاق میں مبتلا کر دیتا ہے جس میں مبتلا ہو جانے کے بعد اللہ، رسول، قرآن اور شریعت ہر چیز کی توہین و تذلیل وہ اپنی آنکھوں سے دیکھتا اور کانوں سے سنتا ہے لیکن اس کو ایسا سانپ سونگھ جاتا ہے کہ زبان کھولنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔

یہاں اس ہدایت کے اندر یہ دونوں ہی پہلو ملحوظ ہیں۔ پہلا تو سیاقِ کلام ہی سے واضح ہے اور دوسرے کو قرآن نے سورۂ نساء کی مذکورہ بالا آیت میں واضح فرما دیا اس لیے کہ اسی ہدایت کا حوالہ دے کر وہاں منافقین پر گرفت فرمائی ہے کہ یہ لوگ مخالفینِ اسلام کی ان مجلسوں میں شریک ہوتے ہیں جہاں اللہ کی آیات

کا علانیہ مذاق اڑایا جاتا ہے حالانکہ ان کو قرآن میں اس سے روکا جا چکا ہے۔

شریعت کا مذاق اڑانے والوں کے ساتھ بیٹھنا بے غیرتی اور اس پر راضی رہنا نفاق ہے

'آیات' سے مراد یہاں ظاہر ہے کہ قرآن کی آیات ہیں اس لیے کہ جن لوگوں کا حال یہ بیان ہو رہا ہے ان کے سامنے قرآن ہی پیش کیا جا رہا تھا اور وہ اسی کو مذاق بنا رہے تھے لیکن یہی حکم بعینہٖ ساری شریعت اور اس کے سارے احکام کا ہوگا۔ شریعت کا مذاق جہاں بھی اڑایا جائے وہاں بیٹھنا بے غیرتی اور اس پر راضی رہنا نفاق اور کفر ہے۔

'وَاِمَّا يُنْسِيَنَّكَ الشَّيْطٰنُ فَلَا تَقْعُدْ بَعْدَ الذِّكْرٰى مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ' یہ اوپر والی ہدایت کی تاکید مزید ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر کبھی شیطان اس بات سے غافل ہی کر دے تو یاد آجانے کے بعد ایسے ظالموں کے ساتھ نہ بیٹھو۔ اس تاکید کی ضرورت اس لیے تھی کہ بسا اوقات آدمی کسی مجلس میں جا پہنچتا ہے اور وہاں بات بڑھتے بڑھتے اس حد تک بڑھ جاتی ہے کہ دین و شریعت کے استہزا تک پہنچ جاتی ہے۔ ایسے وقت میں آدمی محسوس تو کرتا ہے کہ اب یہ جگہ بیٹھنے کی نہیں رہی لیکن خیال کرتا ہے کہ بھری مجلس سے کس طرح اٹھ کر چلا جائے۔ یا اگر مناظرہ قسم کا ہوتا ہے تو یہ خیال کرتا ہے کہ اب میدان چھوڑ کر کس طرح وہاں سے ہٹ جائے، حریف کیا کہے گا۔ یہ دونوں ہی خیال آدمی کے لیے فتنہ ہیں۔ اگر مجلس کا پاس و لحاظ مانع ہے تو یہ قلت غیرت کی دلیل ہے۔ آدمی سوچے کہ اگر اس کے منہ پر اس کے ماں باپ کو گالی دی جائے تو کیا وہ اس کو خاموشی سے گوارا کرے گا تو خدا اور اس کی شریعت کا حق تو ماں باپ بلکہ تمام دنیا جہان سے بڑا ہے۔ اور اگر وہ بحث و مناظرہ کے لیے وہاں جما رہے گا تو گو اس کی نیت احقاقِ حق اور ابطالِ باطل ہی کی ہو لیکن جب ان لوگوں کے ذہن خراب ہو چکے ہیں جن کو بات سنانی ہے اور ان کو سنانا ان کو مزید اشتعال دلانے کے مترادف ہے تو اس کا ایسے لوگوں کے ساتھ الجھنا صرف مونچھ کی لڑائی بن کر رہ جائے گا۔ مقصد حق کو اس سے نہ صرف یہ کہ کوئی تقویت نہیں پہنچے گی بلکہ الٹا اس سے شدید قسم کا نقصان پہنچے گا۔ اس وجہ سے صحیح روش یہی ہے کہ آدمی اس کو شیطان کا چکمہ سمجھے اور ایسی مجلس سے کان جھاڑ کے اٹھ آئے۔

یہ بات یہاں یاد رہے کہ اِمَّا يُنْسِيَنَّكَ الشَّيْطٰنُ کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ اگر کبھی شیطان کسی چکر میں ڈال کر ایسی صورتِ حال سے دوچار کرا ہی دے یا ایسے ظالموں سے بھڑا ہی دے تو تمہیں یہ روّیہ اختیار کرنے کی ہدایت کی جاتی ہے۔ اس سے یہ بات آپ سے آپ نکلی کہ اوّل تو آدمی برابر چوکنا رہے کہ شیطان اس کو اس طرح کے فتنہ میں ڈالنے نہ پائے لیکن اگر وہ کہیں اللہ کی اس ہدایت سے غافل کر کے کسی فتنے میں ڈال ہی دے تو آدمی متنبہ ہوتے ہی ایسی مجلس کو سلام کرے اور وہاں سے چل دے۔ اس لیے کہ جو لوگ اللہ کی آیات کا مذاق اڑائیں وہ اپنی جانوں پر سب سے بڑا ظلم ڈھانے والے ہیں اور ان کی معیت معلوم نہیں خدا کے کس غضب میں مبتلا کر دے۔

'وَمَا عَلَى الَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ مِنْ حِسَابِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ وَّلٰكِنْ ذِكْرٰى لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ' یہ مسلمانوں کو تسلی اور

مسلمانوں کو تسلی اور حکمتِ تبلیغ کی تلقین

تبلیغ دین کے معاملے میں اس نقطۂ اعتدال اور طریقۂ حکمت کو اختیار کرنے کی تلقین ہے جس کا ذکر اوپر والی آیت میں ہوا۔ مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کو یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ ان کے اوپر ان کافروں اور ظالموں سے متعلق جو ذمہ داری ہے وہ صرف اللہ کی دعوت اور اس کے دین کو پہنچا دینے کی ہے تاکہ جس طرح وہ خدا سے ڈرنے والے ہیں اسی طرح یہ کفار بھی خدا سے ڈرنے والے بن جائیں۔ ان کے کفر و ایمان کی کوئی ذمہ داری مسلمانوں پر نہیں ہے۔ یہ اگر ایمان لائیں گے تو اس کا صلہ خود پائیں گے اور اگر کفر پر اڑے رہیں گے تو قیامت کو اللہ کے حضور جواب دہ خود بنیں گے۔ مسلمانوں سے جب کہ انھوں نے خدا سے ڈرتے رہنے کا حق ادا کیا، کوئی مواخذہ ان سرکشوں کے باب میں نہیں ہوگا کہ یہ لوگ خدا سے ڈرنے والے کیوں نہ بنے؛ خدا کے ہاں کوئی شخص کسی دوسرے کی ذمہ داریوں سے متعلق مسئول نہیں ہوگا۔ خدا سے ڈرنے والوں پر جو ذمہ داری دوسروں کے باب میں عائد ہوتی ہے وہ صرف تبلیغ و تذکیر کی ہے اور اس ذمہ داری کی ادائیگی کے لیے یہ کافی ہے کہ اہل ایمان جب دیکھیں کہ کوئی سازگار موقع ان کے کانوں میں بھی بات ڈال دینے کا ہے تو ان کو اللہ کی بات پہنچا دیں۔ اپنے آپ کو ان کی ہدایت و ضلالت کا مسئول سمجھ کر ان کے تعاقب کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ مضمون سورۂ مائدہ کی آیت ۱۰۵ یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا عَلَیْكُمْ اَنْفُسَكُمْ لَا یَضُرُّكُمْ مَّنْ ضَلَّ اِذَا اهْتَدَیْتُمْ الایۃ کے تحت بھی گزر چکا ہے۔

اس آیت سے کئی باتیں واضح ہوئیں جو ذہن میں رکھنے کی ہیں۔

ایک یہ کہ اوپر والی آیت میں خطاب اگرچہ بصیغۂ واحد تھا لیکن کلام کا رخ مسلمانوں کی طرف تھا۔ چنانچہ کلام کے تدریجی ارتقا سے یہ حقیقت خود واضح ہوگئی اور یہی قرآن کا معروف اسلوب ہے۔

دوسری یہ کہ اس سے اس جوش دعوت و تبلیغ کا اظہار ہو رہا ہے جو صحابہ رضی اللہ عنہم کے اندر پایا جاتا تھا۔ آیت سے صاف مترشح ہو رہا ہے کہ صحابہؓ کو شہادتِ حق کی ذمہ داری کا اتنا شدید احساس تھا کہ وہ سمجھتے تھے کہ اگر لوگوں نے ہدایت نہ قبول کی تو شاید آخرت میں یہ ان کی کوتاہی خدمت میں محسوب ہو۔

تیسری یہ کہ اس سے دعوت و تبلیغ کی اہمیت واضح ہوتی ہے۔ اس لیے کہ آیت سے صاف واضح ہے کہ اہل ایمان سے مواخذہ تو نہیں ہوگا کہ لوگوں نے ہدایت قبول کیوں نہیں کی لیکن یہ مواخذہ ان سے ہوگا کہ انھوں نے لوگوں کو تذکیر و تبلیغ کی یا نہیں۔

بازی بازی باریش بابا ہم بازی

وَذَرِ الَّذِیْنَ اتَّخَذُوْا دِیْنَهُمْ لَعِبًا وَّلَهْوًا وَّغَرَّتْهُمُ الْحَیٰوةُ الدُّنْیَا: 'دین' سے مراد یہاں وہ دین ہے جو اللہ نے ان کے لیے اتارا تھا اور جس کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے صحابہؓ ان لوگوں کے سامنے پیش کر رہے تھے۔ مطلب یہ ہے کہ جو لوگ ایسے شامت زدہ ہیں کہ جس چیز کو اللہ نے ان کے دین کی حیثیت سے اتارا ہے اس کا مذاق اڑائیں ان سے کس خیر کی امید رکھتے ہو؛ ان کو چھوڑو، ان کے درپے ہونے کی ضرورت نہیں۔ بازی بازی باریش بابا ہم بازی! جو لوگ زندگی کے معاملے میں اتنے غیر سنجیدہ، اتنے بے فکرے اور ایسے لاابالی ہیں کہ دین کو بھی وہ اپنے مسخراپن کا موضوع بنا لیں۔ ان کو مطمئن کرنے کے لیے فکر مند ہونے

کی ضرورت نہیں۔

منکرین کا اصل مغالطہ

'وَّغَرَّتْهُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا' یہ ان کی اس ساری شرارت کے اصل سبب سے پردہ اٹھایا ہے کہ اصل چیز جس نے ان کی آنکھوں پر پٹی باندھ رکھی ہے وہ تو اس دنیا کی، ان کے زعم کے مطابق، وہ کامیاب زندگی ہے جو ان کو حاصل ہے اور جس میں وہ مگن ہیں۔ وہ دیکھ رہے ہیں کہ وہ کھا رہے ہیں، عیش کر رہے ہیں اور دندنا رہے ہیں، اور کہیں سے ان کے اطمینان میں کوئی رخنہ نہیں ہے۔ اگر ان کی زندگی غلط ہے، جیسا کہ قرآن کہہ رہا ہے، تو پھر وہ تباہ کیوں نہیں کر دیے جاتے، اور جب وہ یہاں مسلمانوں سے بہتر حالت میں ہیں تو بالفرض موت کے بعد اٹھنا ہی ہوا تو آخر وہ آخرت میں کیوں اچھے نہیں رہیں گے؟ ان کا اصلی مغالطہ یہی ہے کہ جب ہماری زندگی کامیاب ہے تو ہمارا رویہ بھی لازماً صحیح ہے۔ وہ اسی دنیا کی زندگی کو کل کی زندگی سمجھے بیٹھے ہیں اور یہ زندگی چونکہ جزا و سزا کے اصول پر نہیں چل رہی ہے بلکہ امتحان و آزمائش کے اصول پر چل رہی ہے، یہاں حق کے ساتھ خدا نے باطل کو بھی ڈھیل دے رکھی ہے، اس وجہ سے وہ اپنی خواہشوں کی پیروی میں باطل ہی کو اپنا دین بنا بیٹھے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ یہی زندگی اور یہی رویہ صحیح ہے اور قرآن ان کو جس انجام سے خبردار کر رہا ہے وہ محض ایک موہوم ڈراوا ہے۔

'وَذَكِّرْ بِهٖٓ اَنْ تُبْسَلَ نَفْسٌۢ بِمَا كَسَبَتْ' 'بہ' میں ضمیر کا مرجع قرآن ہے جس کا اوپر آیت ۷۰ میں ذکر ہے۔ 'ابسلہ'، 'اسلمہ للھلکۃ'، اس کو ہلاکت کے حوالہ کیا۔ ابسل فلاناً لعملہ وبہ وکلہ الیہ' فلاں کو اس کے عمل کے حوالہ کر دیا۔ 'اَن' سے پہلے عربی زبان کے معروف قاعدے کے مطابق مضاف لفظ 'مخافۃ' یا اس کے ہم معنی کوئی دوسرا لفظ محذوف ہے۔ اس کے دو ترجمے ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ اس قرآن کے ذریعے سے تذکیر کرو، نہ ہو کہ کوئی جان اپنے عمل کی پاداش میں ہلاکت کے حوالے کی جائے۔ دوسرا یہ کہ اس قرآن کے ذریعے سے یاددہانی کرو، نہ ہو کہ کوئی جان اپنی کرتوت کے حوالہ کی جائے یا اپنی کرتوت کے بدلے رہن ہو کے رہ جائے۔ دونوں میں حقیقت کے اعتبار سے کچھ زیادہ فرق نہ ہوگا۔

تذکیر کے لیے قرآن کافی ہے

مطلب یہ ہے کہ جو لوگ اپنے دین کو مذاق بنائے ہوئے ہیں نہ زیادہ ان کے درپے ہونے کی ضرورت ہے اور نہ ان کے نت نئے مطالبات کے لیے فکرمند ہونے کی، بس اسی قرآن کے ذریعہ سے اپنا فرض تذکیر و تبلیغ جو تم پر عائد ہوتا ہے، ادا کرتے رہو کہ کوئی جان اپنے عمل کی پاداش میں گرفتارِ عذاب نہ ہو۔

تمہارا فریضہ لوگوں کو اس خطرے سے آگاہ کر دینا ہے کہ آگے کی منزل میں ہر ایک کو اپنے عمل سے سابقہ پیش آنا ہے۔ عمل ہی ہلاک کرے گا اور عمل ہی نجات دے گا۔ نہ کوئی کسی کا حامی و مددگار ہوگا اور نہ کوئی شفیع و سفارشی اور نہ کسی کے پاس کوئی معاوضہ دینے کو ہوگا اور نہ کسی کا کوئی بڑے سے بڑا معاوضہ قبول ہوگا۔ اس خطرے سے آگاہ کر دینا ضروری ہے تاکہ کوئی بے خبری میں اپنے ہی عمل کی گرفت میں نہ آ جائے۔ اس آگاہی کے بعد اگر کوئی خود اپنی شامتِ اعمال میں گرفتار ہونا چاہتا ہے تو اس کی ذمہ داری خود اس پر ہے۔

تم اپنی ذمہ داری سے سبکدوش ہو۔ جو لوگ اس آگاہی کی پروا نہیں کریں گے وہ اپنی کرتوتوں کے حوالے ہوں گے اور ان کے کفر کی پاداش میں ان کے لیے کھولتا پانی پینے کو اور عذاب دردناک ہوگا۔

اہل دوزخ کے لیے اولین سامان ضیافت

"کھولتے پانی" کا ذکر یہاں بطور نزل یعنی اولین سامانِ ضیافت کے ہے جیسا کہ دوسری جگہ اس کی تصریح ہے وَاَمَّا اِنْ كَانَ مِنَ الْمُكَذِّبِيْنَ الضَّاۗلِّيْنَ فَنُزُلٌ مِّنْ حَمِيْمٍ ۹۲ واقعہ (اور اگر وہ جھٹلانے والے گمراہوں میں سے ہوا تو اس کے لیے اولین سامان ضیافت کھولتا ہوا پانی ہوگا) یعنی وہاں اترتے ہی پہلی ضیافت تو ان کی ماءِ حمیم سے ہوگی پھر اس کے بعد ان کے لیے عذابِ الیم کے دروازے کھول دیے جائیں گے۔

'وَاِنْ تَعْدِلْ كُلَّ عَدْلٍ' کا صحیح زور سمجھنے کے لیے یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ قیامت کے دن مجرمین یہ آرزو کریں گے کہ کاش وہ اپنی اولاد، اپنی بیوی، اپنے بھائی اور اپنے خاندان اور ساری دنیا کو فدیہ میں دے کر اس عذاب سے چھوٹ جائیں لیکن ان کی یہ آرزو پوری نہ ہوگی۔ ملاحظہ ہوں آیات ۱۱-۱۴ سورۂ معارج۔

قُلْ اَنَدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُنَا وَلَا يَضُرُّنَا وَنُرَدُّ عَلٰٓى اَعْقَابِنَا بَعْدَ اِذْ هَدٰىنَا اللّٰهُ كَالَّذِي اسْتَهْوَتْهُ الشَّيٰطِيْنُ فِي الْاَرْضِ حَيْرَانَ ۡ لَهٗٓ اَصْحٰبٌ يَّدْعُوْنَهٗٓ اِلَى الْهُدَى ائْتِنَا ۭ قُلْ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى ۭ وَاُمِرْنَا لِنُسْلِمَ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۙ وَاَنْ اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّقُوْهُ ۭ وَهُوَ الَّذِيْٓ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ۝ وَهُوَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ ۭ وَيَوْمَ يَقُوْلُ كُنْ فَيَكُوْنُ ۭ قَوْلُهُ الْحَقُّ ۭ وَلَهُ الْمُلْكُ يَوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ ۭ عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ ۭ وَهُوَ الْحَكِيْمُ الْخَبِيْرُ (۷۱-۷۳)

خدا کی ہدایت آجانے کے بعد کسی کے لیے کوئی عذر باقی نہیں رہا

قُلْ اَنَدْعُوْا ..... بَعْدَ اِذْ هَدٰىنَا اللّٰهُ۔ اب یہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے اعلان کرایا کہ یہ لوگ جو ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہیں کہ تمہیں پھر اسی گمراہی میں پھنسائیں جس سے خدا نے تمہیں نکالا ہے تو تم ان کو صاف صاف سنا دو کہ کیا تم لوگ یہ چاہتے ہو کہ ہم اللہ کے سوا ایسی چیزوں کو پکاریں جن کو نہ ہمیں نفع پہنچانے پر کوئی اختیار نہ ضرر پہنچانے پر اور اس طرح ہم اُلٹے پاؤں پھر اسی گمراہی میں جا گریں جس سے خدا نے ہمیں نکلنے کی توفیق بخشی اور ہماری رہنمائی فرمائی۔ مطلب یہ ہے کہ اگر پہلے ہم اس گمراہی میں مبتلا رہے تو اس کے لیے کچھ عذر تھا لیکن اب اگر ہم رجعت اختیار کریں گے تو ہمارے پاس کیا عذر ہوگا؟ 'مَا لَا يَنْفَعُنَا وَلَا يَضُرُّنَا' میں ان معبودوں کے لیے 'مَا' کا لفظ ان کی تحقیر پر دلیل ہے اور نفع و ضرر کی نفی اصل حقیقت کے اعتبار سے ہے۔ اس لیے کہ ان چیزوں میں سے اگر کسی چیز سے نفع و ضرر پہنچتا ہے تو اللہ کے حکم سے پہنچتا ہے نہ کہ ان میں سے کوئی چیز بذاتِ خود یا با اختیارِ خود نافع و ضار ہے۔ 'بَعْدَ اِذْ هَدٰىنَا اللّٰهُ' مخاطبوں کے لیے نہایت موثر موعظت بھی ہے کہ اس آفتابِ ہدایت کے طلوع ہو جانے کے بعد بھی جو لوگ خود ٹھوکریں کھا رہے ہیں اور دوسروں کو بھی ٹھوکریں کھلانا چاہتے ہیں وہ ذرا اپنے انجام پر غور کریں۔

كَالَّذِي اسْتَهْوَتْهُ الشَّيٰطِيْنُ فِي الْاَرْضِ حَيْرَانَ لَهٗٓ اَصْحٰبٌ يَّدْعُوْنَهٗٓ اِلَى الْهُدَى ائْتِنَا ۔

'استھواء' کے معنی کسی کی عقل گم کر دینا، ہوش اڑا دینا، حیران و درماندہ کر دینا۔ 'ارض' کے معنی یوں تو زمین کے ہیں لیکن یہاں گم گشتگی کی تمثیل بیان ہو رہی ہے اس وجہ سے قرینہ بتا رہا ہے کہ اس سے مراد صحرا اور بیابان ہے جہاں راہ بھٹکنے کا خطرہ ہوتا ہے۔ فعل استھواء کی نسبت شیاطین کی طرف اس مفہوم کے اعتبار سے ہے جو تمثیل میں مضمر ہے۔ یہ تمثیل ایمانی و اخلاقی گم گشتگی کی ہے جس میں زیادہ دخل شیاطین جن و انس کا ہوتا ہے۔ اس وجہ سے فعل کی نسبت شیاطین کی طرف کر کے اصل حقیقت کی طرف اشارہ کر دیا۔ ھدای کے معنی تفسیر سورۂ بقرہ کے آغاز میں ہم بتا چکے ہیں کہ سیدھی راہ کے بھی آتے ہیں۔

مخالفینِ اسلام کی تمثیل

یہ اوپر والے ٹکڑے 'نُرَدُّ عَلٰٓى اَعْقَابِنَا بَعْدَ اِذْ هَدٰىنَا اللّٰهُ' کی تمثیل ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہدایت الٰہی کی شاہراہ پا جانے کے بعد اگر ہم تمہارے کہے پر چلے اور مرنے کے اس کفر و شرک میں پھر مبتلا ہو گئے جس سے خدا نے ہمیں نکالا ہے تو ہماری مثال بالکل اس شخص کی ہو گی جس کو شیاطین نے کسی صحرا میں بھٹکا دیا ہو، وہ حیران و درماندہ ادھر ادھر پھر رہا ہو، اس کے کچھ ساتھی اس کو پکار رہے ہوں کہ راستہ ادھر ہے، ہماری طرف آ جاؤ لیکن اس کی عقل ایسی گم ہو کہ اس کی سمجھ میں کچھ نہ آ رہا ہو کہ کدھر جائے۔

اس تمثیل کا اسلوب اگرچہ بظاہر ایک عمومی تمثیل کا ہے لیکن غور کیجیے تو معلوم ہو گا کہ فی الحقیقت یہ ان مخالفینِ اسلام کی تمثیل ہے جو یہاں زیر بحث ہیں۔ اس تمثیل میں ان کے سامنے یہ بات رکھی گئی ہے کہ تم صحرا میں بھٹکتے ہوئے مسافر کی مانند ہو، شیاطین اور گمراہ لیڈروں نے تمہاری مت ماری ہے اور تمہارے کچھ راہ یاب ساتھی (اشارہ اہلِ ایمان کی طرف ہے) تمہیں اصل راہ کی طرف بلا رہے ہیں لیکن تم ان کی پکار نہیں سن رہے ہو ـــــ دیکھیے کس خوبی کے ساتھ ان کی پوری تصویر ان کے سامنے رکھ دی گئی ہے۔ حکایت بظاہر دوسروں کی لیکن بات ساری کی ساری ان کی۔

'قُلْ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى' یعنی ان کو بتا دو کہ اصل ہدایت تو اللہ کی ہدایت ہے تو اللہ کی ہدایت پا جانے کے بعد اب ہم کسی اور طریقے کی پیروی کس طرح کر سکتے ہیں؟

'وَاُمِرْنَا لِنُسْلِمَ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ' یہ مشرکین کی دعوت شرک کا جواب ہے کہ تم ہمیں ان چیزوں کی پرستش کی دعوت دے رہے ہو جو نہ ہمیں نفع پہنچا سکیں اور نہ نقصان پہنچا سکیں اور حکم ہمیں اللہ رب العالمین کے آگے سرفگندگی اور حوالگی کا ہوا ہے۔ یہاں لفظ 'امر' کے بعد 'ل' اس امر کے موکد ہونے کو ظاہر کر رہا ہے اور 'رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ' کی صفت اس امر موکد کی دلیل ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ ہی تمام عالم کا رب ہے تو اس کے سوا کون حقدار ہو سکتا ہے کہ اپنے آپ کو اس کے حوالہ کیا جائے۔

'وَاَنْ اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّقُوْهُ وَهُوَ الَّذِيْٓ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ' یہ 'اُمِرْنَا لِنُسْلِمَ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ' کے تحت اور اسی کی عملی تصویر ہے لیکن اسلوب غائب سے بدل کر حاضر کا کر دیا گیا ہے جس سے

اس کے اندر براہ راست خطاب کا زور پیدا ہوگیا ہے۔ نماز کا ذکر یہاں اس اسلام کے اولین عملی مظہر کی حیثیت سے ہوا ہے جس کا ذکر 'اُمِرْنَا لِنُسْلِمَ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ' میں ہے۔ 'تقویٰ' یہاں ان تمام حدود کی پابندی کے مفہوم میں ہے جن کی پابندی کا خدا نے حکم دیا ہے۔ 'وَاِلَیْہِ تُحْشَرُوْنَ' میں آخرت اور توحید دونوں چیزیں جمع کر دی گئی ہیں اور یہ اوپر والے احکام کی دلیل ہے کہ نماز کا قیام اور حدودِ الٰہی کا احترام اس لیے لازم ہے کہ ایک دن خدا کے آگے حاضر ہونا ہے اور صرف اسی کے آگے حاضر ہونا ہے۔ اس دن کوئی اور مرجع و مولیٰ نہیں ہوگا 'وَھُوَ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ الآیۃ' ایک نہایت جامع آیت ہے جس میں نہایت مختصر الفاظ میں اوپر والے ٹکڑے 'ھُوَ الَّذِیْ اِلَیْہِ تُحْشَرُوْنَ' کے ہر جزو کی دلیل بیان ہو گئی ہے۔

کارخانہ کائنات کے 'بالحق' ہونے کا لازمی نتیجہ

آسمان و زمین میں خالق کی قدرت، حکمت اور ربوبیت کے جو آثار و دلائل موجود ہیں وہ اس حقیقت پر شاہد ہیں کہ یہ کارخانہ کسی کھلنڈرے کا کھیل نہیں ہے جو اس نے محض اپنا جی بہلانے کے لیے بنایا ہو بلکہ یہ ایک قدیر، علیم، حکیم اور رحمان و رحیم ذات کی بنائی ہوئی دنیا ہے۔ اگر یہ یونہی چلتی رہے، اس کے اندر جو ظلم ہے اس کے انصاف کے لیے کوئی دن نہ آئے، جو عدل ہے اس کی داد کا کوئی وقت نہ آئے، اس کے اندر جو بُرے، شریر اور نابکار ہیں ان کو کوئی سزا نہ ملے، جو نیک، حق شناس اور عدل شعار ہیں ان کو ان کی نیکیوں کی جزا نہ ملے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ یہ سارا کارخانہ بالکل عبث، بے غایت اور باطل ہے جس کے بنانے والے کے نزدیک خیر اور شر، ظلم اور عدل، حق اور باطل میں کوئی فرق ہی نہیں ہے۔ یہ بات انسان کی عقل و فطرت کسی طرح بھی قبول نہیں کر سکتی اس لیے کہ جس خالق کی خلقت کے ہر گوشے میں اس کی حکمت، قدرت، رحمت اور ربوبیت کے آثار موجود ہیں اور اتنی کثرت کے ساتھ موجود ہیں کہ انسان کسی طرح ان کا احاطہ نہیں کر سکتا اس کی نسبت وہ کس طرح یہ باور کر لے کہ اس کو ہماری نیکی بدی اور ہمارے عدل و ظلم سے کوئی بحث نہیں ہے۔ اگر بحث ہے اور ضرور بحث ہے اس لیے کہ یہ بحث نہ ہو تو یہ دنیا بالکل کھیل بلکہ نہایت ظالمانہ کھیل بن کے رہ جاتی ہے تو اس سے یہ بات لازم آتی ہے کہ اس دنیا کے لیے ایک یوم انصاف آئے جس میں خدا کی کامل رحمت اور اس کی کامل حکمت ظاہر ہو اور ہر نیکی اپنا صلہ پائے اور ہر بدی اپنی سزا۔

'وَیَوْمَ یَقُوْلُ کُنْ فَیَکُوْنُ، قَوْلُہُ الْحَقُّ' یعنی کوئی اس وہم میں مبتلا نہ ہو کہ اس دن کے لانے میں خدا کو کوئی دشواری پیش آئے گی۔ جس نے یہ دنیا مجرد اپنے حکم 'کن' سے بنائی ہے وہ جب حشر برپا کرنا چاہے گا تو اسی کلمہ 'کن' سے حشر بھی برپا کر دے گا۔ آخر جب اس کو پہلی بار دنیا کے پیدا کر دینے میں کوئی زحمت نہیں پیش آئی تو دوبارہ کیوں پیش آئے گی؟ 'قَوْلُہُ الْحَقُّ' میں 'حق' کے معنی شدنی کے ہیں یعنی خدا کی ہر بات ہو کے رہتی ہے۔ اس میں ایک لمحہ کے لیے بھی کوئی رکاوٹ پیدا نہیں ہو سکتی۔

'وَلَہُ الْمُلْکُ یَوْمَ یُنْفَخُ فِی الصُّوْرِ' یعنی جس دن حشر کے لیے صور پھونکا جائے گا اس دن سارا اختیار اور ساری بادشاہی صرف خدائے واحد و قہار ہی کی ہوگی۔ اس دن نہ کسی کا کوئی زور چلے گا'

نہ کسی کو کوئی اختیار حاصل ہوگا، نہ کسی کی سعی و سفارش اللہ کے اذن کے بغیر کسی کو کچھ نفع پہنچا سکے گی۔ سب خدا کے آگے سرفگندہ ہوں گے صرف اسی کا حکم ناطق و نافذ ہوگا۔

'عَالِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ' وہ سارے غائب و حاضر کا علم رکھنے والا ہے اس وجہ سے نہ کسی کی کوئی ظاہر یا پوشیدہ بات اس سے مخفی ہوگی، نہ وہ کسی سے کوئی بات پوچھنے کا محتاج ہوگا، نہ کوئی اس کے علم میں کوئی اضافہ کر سکے گا، نہ کوئی غلط قسم کا عذر کر سکے گا۔

'وَهُوَ الْحَكِيمُ الْخَبِيرُ' وہ حکیم بھی ہے اور خبیر بھی۔ اس کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ اس کا ہر فیصلہ عدل و حکمت اور علم و خبر پر مبنی ہو۔ نہ اس کے عدل و حکمت میں کوئی نقص ہے کہ وہ کسی باطل کو حق اور حق کو باطل بنا دے۔ نہ اس کے علم و خبر میں کوئی خلا ہے کہ لاعلمی اور بے خبری کے سبب سے کسی مغالطے میں پڑ جائے یا کوئی اس کو مغالطہ میں ڈال کر حق کو باطل اور باطل کو حق بنا دے۔

۱۱۔ آگے کا مضمون ——— آیات ۷۴-۹۰

سورہ کے شروع سے جو بحث چلی آ رہی تھی یہاں آ کر اپنے نقطۂ عروج پر پہنچ گئی ہے۔ اب آگے حضرت ابراہیمؑ اور ان سے پہلے اور ان کے بعد پیدا ہونے والے تمام نبیوں کا حوالہ دے کر بتایا گیا ہے کہ ان سب کی دعوت یہی تھی جو یہ پیغمبر دے رہے ہیں۔ پھر پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے فرمایا ہے کہ تم بہرشکل انہی ہدایت یافتہ گروہ کی ہدایت کی پیروی کرو۔ اگر تمہاری یہ قوم تمہاری بات نہیں سنتی تو اس کو اس کے حال پر چھوڑ دو، تمہاری ذمہ داری صرف دعوت و تبلیغ کی ہے۔ ان کے دلوں میں ایمان و ہدایت اتار دینا تمہاری ذمہ داری نہیں ہے۔

اس سلسلہ میں خاص اہمیت کے ساتھ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اس دعوتِ توحید کا ذکر فرمایا ہے جو بالکل ابتدا ہی میں انھوں نے اپنے باپ اور اپنی قوم کو دی ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کی دعوت کے خاص طور پر ذکر کی وجہ، جیسا کہ ہم تفسیر سورۂ بقرہ میں وضاحت کے ساتھ بیان کر چکے ہیں، یہ ہے کہ بنی اسماعیل اور بنی اسرائیل دونوں ہی ان کو مسلم طور پر اپنا خاندانی بزرگ اور روحانی پیشوا مانتے تھے اور مدعی تھے کہ جس دین پر وہ ہیں ان کو انہی سے وراثت میں ملا ہے اور اپنی تمام مشرکانہ بدعات میں انہی کے نام نامی کو بطور سند پیش کرتے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت بھی چونکہ ملتِ ابراہیمؑ پر ہوئی تھی اس وجہ سے ضروری ہوا کہ جس طرح بقرہ اور آل عمران میں بنی اسرائیل پر یہ واضح کر دیا گیا کہ ان کی ایجاد کردہ یہودیت و نصرانیت کو ملت ابراہیمؑ سے کوئی تعلق نہیں ہے، اسی طرح بنی اسمٰعیل پر بھی یہ واضح کر دیا جائے کہ انھوں نے جو دین شرک اختیار کر رکھا ہے یہ ان کی اپنی ایجاد ہے، حضرت ابراہیمؑ سے اس کو کوئی دور کی نسبت بھی نہیں ہے۔

علاوہ ازیں حضرت ابراہیم کی دعوت اور ان کی زندگی کے ہر پہلو سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو جو سبق حاصل ہو سکتے تھے وہ کسی اور طریقے سے حاصل نہیں ہو سکتے تھے۔ اس کی وجہ، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا، یہ ہے کہ آپ اسی ملت بیضا کی تجدید و تکمیل کے لیے آئے تھے جس کی دعوت حضرت ابراہیمؑ نے دی تھی اور اسی قوم کے اندر آئے تھے جو حضرت ابراہیمؑ کی نام لیوا تھی۔ اب اس روشنی میں آگے کی آیات کی تلاوت فرمائیے۔

وَإِذْ قَالَ إِبْرٰهِيمُ لِأَبِيهِ آزَرَ أَتَتَّخِذُ أَصْنَامًا آلِهَةً ۖ إِنِّي أَرٰىكَ وَقَوْمَكَ آيات ٧٤-٩٠
فِي ضَلٰلٍ مُّبِينٍ ﴿٧٤﴾ وَكَذٰلِكَ نُرِي إِبْرٰهِيمَ مَلَكُوتَ السَّمٰوٰتِ
وَالْأَرْضِ وَلِيَكُونَ مِنَ الْمُوقِنِينَ ﴿٧٥﴾ فَلَمَّا جَنَّ عَلَيْهِ اللَّيْلُ رَأَىٰ كَوْكَبًا ۖ
قَالَ هٰذَا رَبِّي ۖ فَلَمَّا أَفَلَ قَالَ لَا أُحِبُّ الْآفِلِينَ ﴿٧٦﴾ فَلَمَّا رَأَى
الْقَمَرَ بَازِغًا قَالَ هٰذَا رَبِّي ۖ فَلَمَّا أَفَلَ قَالَ لَئِن لَّمْ يَهْدِنِي
رَبِّي لَأَكُونَنَّ مِنَ الْقَوْمِ الضَّالِّينَ ﴿٧٧﴾ فَلَمَّا رَأَى الشَّمْسَ بَازِغَةً
قَالَ هٰذَا رَبِّي هٰذَا أَكْبَرُ ۖ فَلَمَّا أَفَلَتْ قَالَ يٰقَوْمِ إِنِّي بَرِيءٌ مِّمَّا
تُشْرِكُونَ ﴿٧٨﴾ إِنِّي وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِي فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَ
الْأَرْضَ حَنِيفًا وَمَا أَنَا مِنَ الْمُشْرِكِينَ ﴿٧٩﴾ وَحَاجَّهُ قَوْمُهُ ۚ
قَالَ أَتُحَاجُّونِّي فِي اللَّهِ وَقَدْ هَدٰىنِ ۚ وَلَا أَخَافُ مَا تُشْرِكُونَ
بِهِ إِلَّا أَن يَشَاءَ رَبِّي شَيْـًٔا ۗ وَسِعَ رَبِّي كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا ۗ أَفَلَا
تَتَذَكَّرُونَ ﴿٨٠﴾ وَكَيْفَ أَخَافُ مَا أَشْرَكْتُمْ وَلَا تَخَافُونَ أَنَّكُمْ
أَشْرَكْتُم بِاللَّهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهِ عَلَيْكُمْ سُلْطٰنًا ۚ فَأَيُّ
الْفَرِيقَيْنِ أَحَقُّ بِالْأَمْنِ ۖ إِن كُنتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿٨١﴾ الَّذِينَ آمَنُوا وقف لازم
وَلَمْ يَلْبِسُوا إِيمَانَهُم بِظُلْمٍ أُولٰٓئِكَ لَهُمُ الْأَمْنُ وَهُم مُّهْتَدُونَ ﴿٨٢﴾ ع ٩ ١٣ ١٥

وَتِلْكَ حُجَّتُنَآ اٰتَيْنٰهَآ اِبْرٰهِيْمَ عَلٰى قَوْمِهٖ ؕ نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنْ نَّشَآءُ
اِنَّ رَبَّكَ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ ﴿۸۳﴾ وَوَهَبْنَا لَهٗۤ اِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ ؕ كُلًّا
هَدَيْنَا ۚ وَنُوْحًا هَدَيْنَا مِنْ قَبْلُ وَمِنْ ذُرِّيَّتِهٖ دَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ
وَاَيُّوْبَ وَيُوْسُفَ وَمُوْسٰى وَهٰرُوْنَ ؕ وَكَذٰلِكَ نَجْزِى الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۸۴﴾
وَزَكَرِيَّا وَيَحْيٰى وَعِيْسٰى وَاِلْيَاسَ ؕ كُلٌّ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۸۵﴾ وَاِسْمٰعِيْلَ
وَالْيَسَعَ وَيُوْنُسَ وَلُوْطًا ؕ وَكُلًّا فَضَّلْنَا عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿۸۶﴾ وَمِنْ
اٰبَآئِهِمْ وَذُرِّيّٰتِهِمْ وَاِخْوَانِهِمْ ۚ وَاجْتَبَيْنٰهُمْ وَهَدَيْنٰهُمْ
اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۸۷﴾ ذٰلِكَ هُدَى اللّٰهِ يَهْدِىْ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ
مِنْ عِبَادِهٖ ؕ وَلَوْ اَشْرَكُوْا لَحَبِطَ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۸۸﴾
اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ۚ فَاِنْ يَّكْفُرْ
بِهَا هٰٓؤُلَآءِ فَقَدْ وَكَّلْنَا بِهَا قَوْمًا لَّيْسُوْا بِهَا بِكٰفِرِيْنَ ﴿۸۹﴾
اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ فَبِهُدٰىهُمُ اقْتَدِهْ ؕ قُلْ لَّآ اَسْئَلُكُمْ
عَلَيْهِ اَجْرًا ؕ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٰى لِلْعٰلَمِيْنَ ﴿۹۰﴾ ع ۱۰ ۸ ۱۶

ترجمہ آیات ۷۴-۹۰

اور یاد کرو جب ابراہیم نے اپنے باپ آزر سے کہا، کیا تم بتوں کو معبود بنائے بیٹھے ہو؟ میں تم کو اور تمہاری قوم کو کھلی ہوئی گمراہی میں دیکھ رہا ہوں۔ اور اسی طرح ہم ابراہیم کو آسمانوں اور زمین میں ملکوت الٰہی کا مشاہدہ کراتے تھے تاکہ وہ اپنی قوم پر حجت قائم کرے اور کاملین یقین میں سے بنے۔ ۷۴-۷۵

پس یوں ہوا کہ جب رات نے اس کو ڈھانک لیا اس نے ایک تارے کو دیکھا۔

بولا کہ یہ میرا رب ہے۔ پھر جب وہ ڈوب گیا اس نے کہا میں ڈوب جانے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔ پھر جب اس نے چاند کو چمکتے دیکھا بولا یہ میرا رب ہے، پھر جب وہ بھی ڈوب گیا اس نے کہا اگر میرے رب نے میری رہنمائی نہ فرمائی تو میں گمراہوں میں سے ہو کر رہ جاؤں گا۔ پھر جب اس نے سورج کو چمکتے دیکھا بولا کہ یہ میرا رب ہے یہ سب سے بڑا ہے۔ پھر جب وہ بھی ڈوب گیا تو اس نے اپنی قوم سے کہا کہ اے میری قوم کے لوگو، میں ان چیزوں سے بری ہوں جن کو تم شریک ٹھہراتے ہو۔ میں نے تو اپنا رُخ بالکل یکسو ہو کر اس کی طرف کیا جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے اور میں تو مشرکوں میں سے نہیں ہوں۔ ۷۶-۷۹

اور اس کی قوم اس سے جھگڑنے لگی۔ اس نے جواب دیا کیا تم اللہ کے بارے میں مجھ سے جھگڑتے ہو، درآنحالیکہ اس نے میری رہنمائی فرمائی ہے۔ اور میں ان سے نہیں ڈرتا جن کو تم اس کا شریک ٹھہراتے ہو مگر یہ کہ کوئی بات میرا رب ہی چاہے۔ میرے رب کا علم ہر چیز کو محیط ہے۔ تو کیا تم لوگ دھیان نہیں کرتے؟ اور میں ان چیزوں سے کیسے ڈروں جن کو تم شریک ٹھہراتے ہو اور تمہارا حال یہ ہے کہ تم اس بات سے نہیں ڈرتے کہ تم نے ایسی چیزوں کو خدا کا شریک بنا رکھا ہے جن کے باب میں اس نے تم پر کوئی دلیل نہیں اتاری۔ تو ہم دونوں گروہوں میں سے امن و اطمینان کا زیادہ سزاوار کون ہے، اگر تم جانتے ہو؟ جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے اپنے ایمان کو شرک سے آلودہ نہیں کیا وہی لوگ ہیں جن کے لیے امن اور چین ہے اور وہی راہ یاب ہیں۔ ۸۰-۸۲

یہ ہے ہماری وہ حجت جو ہم نے ابراہیمؑ کو اس کی قوم پر قائم کرنے کے لیے بخشی۔ ہم جس کو چاہتے ہیں درجے پر درجے بلند کرتے ہیں۔ بیشک تیرا رب حکیم و علیم ہے۔ اور ہم نے اس کو

اسحٰق اور یعقوب عطا کیے۔ ان میں سے ہر ایک کو ہدایت بخشی اور نوح کو بھی ہم نے ہدایت بخشی اس سے پہلے اور اس کی ذریت میں سے داؤد، سلیمان، ایوب، یوسف، موسیٰ اور ہارون کو بھی۔ اور ہم خوب کاروں کو اسی طرح صلہ دیا کرتے ہیں۔ اور زکریا، یحییٰ، عیسیٰ اور الیاس کو بھی یہ سب نیکوکاروں میں سے تھے اور اسمٰعیل، الیسع، یونس اور لوط کو بھی اور ان میں سے ہر ایک کو ہم نے عالم والوں پر فضیلت بخشی۔ اور ان کے آباؤ اجداد، ان کی اولاد اور ان کے بھائی بندوں میں سے بھی ہم نے ہدایت یافتہ بنائے اور ان کو برگزیدہ کیا۔ اور ان کو ہم نے صراط مستقیم کی ہدایت بخشی۔ یہ اللہ کی ہدایت ہے اس سے وہ سرفراز فرماتا ہے اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے اور اگر وہ شرک کرتے تو ان کا سارا کیا دھرا اکارت ہو کے رہ جاتا۔ یہ لوگ ہیں جن کو ہم نے کتاب اور قوتِ فیصلہ اور نبوت عطا فرمائی تو اگر یہ لوگ اس کا انکار کر دیں گے تو کچھ پروا نہیں ہم نے اس کے لیے ایسے لوگ مامور کر دیے ہیں جو اس کے منکر نہیں ہیں۔ یہی لوگ ہیں جن کو اللہ نے ہدایت بخشی تو تم بھی انہی کے طریقے کی پیروی کرو۔ اعلان کر دو، میں اس پر تم سے کسی صلہ کا طالب نہیں۔ یہ تو بس عالم والوں کے لیے ایک یاددہانی ہے۔ ۸۳-۹۰

۱۲- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ لِاَبِيْهِ اٰزَرَ اَتَتَّخِذُ اَصْنَامًا اٰلِهَةً ۚ اِنِّيْٓ اَرٰىكَ وَقَوْمَكَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ (۷۴)

آزر کے نام کے بارے میں روایات کا اختلاف

آزر، حضرت ابراہیم کے والد کا نام ہے۔ تورات کے عربی اور انگریزی ترجموں اور تالمود، سب میں اس کا تلفظ ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ قرآن نے یہاں جس تصریح کے ساتھ اس نام کا ذکر کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بارے میں یہود کے ہاں روایات کا جو اختلاف ہے وہ اس کو رفع کرنا چاہتا ہے اور قرآن چونکہ قدیم صحیفوں کے لیے کسوٹی (مہیمن) کی حیثیت رکھتا ہے اور براہِ راست وحی الٰہی پر مبنی ہے اس وجہ سے ماننا چاہیے کہ یہی نام صحیح ہے۔

انبیاءؑ کی دعوت کا ایک خاص اسلوب

یہود کے مذہبی لٹریچر کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آزرؑ صرف بت پرست ہی نہیں بلکہ بت گر اور بت فروش بھی تھے بلکہ عجب نہیں کہ بت خانے کے پروہت بھی رہے ہوں۔ ایسے حالات میں آزر کے گھر میں ابراہیمؑ کا پیدا ہونا اور باپ کے سارے کاروبار بت پرستی و بت فروشی پر بیٹھے ہی کے ہاتھوں یہ ضرب کاری لگنا قدرتِ الٰہی کا ایک کرشمہ ہے۔ حضرات انبیاء کی صداقت کی نشانیوں میں سے ایک نشانی یہ بھی ہے کہ انھوں نے جس حق کی دعوت دنیا کو دی ہے اس کی اذان سب سے پہلے ان کے کانوں میں دی ہے جو ان کے سب سے زیادہ قریب بھی تھے اور ان کو سب سے زیادہ عزیز بھی۔

حضرت ابراہیمؑ نے اپنے باپ کو جو دعوت دی ہے اس کی طرف یہاں صرف اجمالی اشارہ ہے۔ قرآن میں دوسرے مقامات میں اس کی تصریح بھی ہے۔

اِذْ قَالَ لِاَبِیْهِ یٰۤاَبَتِ لِمَ تَعْبُدُ	یاد کرو جب اس نے اپنے باپ سے کہا۔ اے میرے
مَا لَا یَسْمَعُ وَلَا یُبْصِرُ وَلَا یُغْنِیْ عَنْكَ	باپ، آپ ایسی چیزوں کو کیوں پوجتے ہیں جو نہ سنتی ہیں
شَیْـًٔا ۝ یٰۤاَبَتِ اِنِّیْ قَدْ جَآءَنِیْ	نہ دیکھتی ہیں اور نہ کچھ آپ کے کام آنے والی ہیں۔ اے
مِنَ الْعِلْمِ مَا لَمْ یَاْتِكَ فَاتَّبِعْنِیْۤ	میرے باپ، میرے پاس وہ علم آیا ہے جو آپ کے
اَهْدِكَ صِرَاطًا سَوِیًّا ۝ یٰۤاَبَتِ لَا تَعْبُدِ	پاس نہیں آیا تو میری پیروی کیجیے میں آپ کو سیدھی راہ
الشَّیْطٰنَ ؕ اِنَّ الشَّیْطٰنَ كَانَ لِلرَّحْمٰنِ	دکھاؤں گا۔ اے میرے باپ شیطان کی بندگی نہ کیجیے۔
عَصِیًّا ۝ یٰۤاَبَتِ اِنِّیْۤ اَخَافُ اَنْ یَّمَسَّكَ	شیطان خدائے رحمان کا بڑا نافرمان ہے۔ اے میرے
عَذَابٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ فَتَكُوْنَ لِلشَّیْطٰنِ	باپ میں ڈرتا ہوں کہ آپ کو خدائے رحمان کی طرف سے
وَلِیًّا ۝ قَالَ اَرَاغِبٌ اَنْتَ عَنْ	کوئی عذاب نہ آپکڑے کہ آپ شیطان کے ساتھی بن کے
اٰلِهَتِیْ یٰۤاِبْرٰهِیْمُ ۚ لَىِٕنْ لَّمْ	رہ جائیں۔ اس نے جواب دیا، ابراہیم! کیا تم میرے
تَنْتَهِ لَاَرْجُمَنَّكَ وَاهْجُرْنِیْ	معبودوں سے منحرف ہو رہے ہو۔ اگر تم باز نہ آئے تو میں
مَلِیًّا ۝	تمھیں سنگسار کر دوں گا۔ اب تم میرے پاس سے یک دم
(۴۲-۴۶ سورہ مریم)	دفع ہو جاؤ۔

اَتَتَّخِذُ اَصْنَامًا اٰلِهَةً یعنی اپنے ہی ہاتھوں کے گھڑے ہوئے بت اور ان کو معبود بنا ڈالا ہے، یہ تو ایک کھلی ہوئی گمراہی ہے جس میں آپ بھی مبتلا ہیں اور آپ کی قوم بھی! دوسری جگہ فرمایا ہے اَتَعْبُدُوْنَ مَا تَنْحِتُوْنَ ۝ (صافات) کیا تم پوجتے ہو ان چیزوں کو جن کو خود اپنے ہی ہاتھوں گھڑتے ہو)

وَكَذٰلِكَ نُرِیْۤ اِبْرٰهِیْمَ مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلِیَكُوْنَ مِنَ الْمُوْقِنِیْنَ۔ (۷۵)

وَكَذٰلِكَ نُرِیْۤ اِبْرٰهِیْمَ، دوسرے مقام میں ہم اس اسلوب کی وضاحت کر چکے ہیں کہ یہ دراصل كُنَّا نُرِیْ اِبْرَاهِیْمَ ہے۔ عربی زبان کے معروف اسلوب کے مطابق یہاں كُنَّا محذوف ہو گیا ہے۔

لفظ 'ملکوت' کی تحقیق

'مَلَکُوْت' جس طرح 'رَہبَۃ' سے 'رَہبوت' ہے اسی طرح 'ملک' سے 'ملکوت' ہے۔ 'ملکوت' کا لغوی مفہوم تو عزت و اقتدار، بادشاہی اور سلطنت ہے لیکن قرآن میں یہ لفظ خدا کی اس تکوینی بادشاہی کے لیے استعمال ہوا ہے جو آسمان اور زمین بلکہ ہر چیز پر قائم و دائم ہے۔ اس 'ملکوت الٰہی' پر غور کرنے کی دعوت مختلف اسلوبوں سے قرآن میں بار بار دی گئی ہے اَوَلَمْ یَنْظُرُوْا فِیْ مَلَکُوْتِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۱۸۵۔ اعراف (کیا انھوں نے آسمانوں اور زمین میں خدا کی بادشاہی پر غور نہیں کیا) سُبْحَانَ الَّذِیْ بِیَدِہٖ مَلَکُوْتُ کُلِّ شَیْءٍ وَّاِلَیْہِ تُرْجَعُوْنَ ۲۳۔ یٰس (پاک ہے وہ ذات جس کے ہاتھ میں ہر چیز کی زمام ہے اور اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے)

ملکوتِ الٰہی میں تفکر تمام علم کی کلید ہے

یہاں یہ بات واضح کی جا رہی ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام آسمان و زمین کے نظام پر غور کرتے تھے اور اللہ تعالیٰ نے اپنی توفیق بخشی سے ان پر اپنی معرفت کے وہ اسرار و حقائق کھولے جو انھوں نے اپنے باپ اور اپنی قوم پر واضح کیے۔ یہ حقیقت یاد رکھنی چاہیے کہ اسی ملکوت پر غور کرنے سے وہ کلید ہاتھ آتی ہے جس سے صحیح فکر اور صحیح عمل کے دروازے کھلتے ہیں۔ اسی سے زندگی کا سرا بھی ہاتھ آتا ہے اور اسی سے اس کے منتہا کا بھی پتہ چلتا ہے۔ اس دنیا کا کوئی خالق ہے یا یہ خود ہی آ دھمکی ہے؟ اگر کوئی خالق ہے تو وہ یکہ و تنہا ہے یا اس کے اور بھی شریک و سہیم ہیں؟ یہ پیدا ہو کر کبھی ختم ہو گی یا اسی طرح ہمیشہ ہمیش چلتی رہے گی؟ اگر اس کا کوئی خالق و مالک ہے تو اس کی صفات و خصوصیات کیا ہیں اور کس لیے اس نے اتنا بڑا عالم کھڑا کر دیا ہے؟ اس دنیا میں حق و باطل کے لیے کوئی معیار ہے یا یہ کوئی اندھیر نگری ہے؟ انسان اپنے اقوال و افعال کے لیے مسئول اور جواب دِہ ہے یا بالکل مطلق العنان اور شتر بے مہار ہے؟ آسمانوں اور زمین میں ایک ہی قادر و قیوم کی تدبیر و حکمت کارفرما ہے یا ان کے اندر الگ الگ مشیتیں اور الگ الگ ارادے زور آزمائی کر رہے ہیں؟ یہ اور اس قبیل کے دوسرے بہت سے سوالات ہیں جن کے صحیح حل پر ہی صحیح فکر اور صحیح عمل کی بنیاد ہے۔ اس وجہ سے قرآن نے آسمان و زمین کے اس نظام پر غور کرنے کی دعوت بھی دی ہے اور صحیح نتائج تک پہنچنے میں ہمارے فکر کی رہنمائی بھی فرمائی ہے۔

جہاں تک غور کرنے کا تعلق ہے اس ملکوت پر غور تو ایک سائنس دان بھی کرتا ہے لیکن وہ سارا غور و فکر اپنی ذات یا اپنے محدود ماحول کو محور بنا کر کرتا ہے۔ اس کی نگاہ صرف اپنے نفع عاجل پر ہوتی ہے اس وجہ سے وہ ان حقائق تک پہنچنے کی کوشش نہیں کرتا جو اس کی نگاہ کو اس کے مطلوب نفع عاجل سے ہٹا دیں۔ وہ چمن میں کھلے ہوئے گلاب کو اس نگاہ سے دیکھتا ہے کہ اس سے گل قند یا اسی طرح کی کوئی اور چیز تیار ہو سکتی ہے جس سے فلاں فلاں فائدے حاصل کیے جا سکتے ہیں۔ اس کے بعد وہ اس چکر میں نہیں پڑتا کہ اس پھول کے حسن و جمال، اس کی رعنائی و دل کشی، اس کی عطر بیزی و مشام نوازی میں اس کے صانع کی قدرت کاری گری، حکمت، رحمت اور ربوبیت کے جلوے دیکھنے کی کوشش کرے اور ان جلووں سے بے خود

ہو کر پھول سے گزر کر پھول کے پیدا کرنے والے کے جمال و کمال کے مشاہدے میں غرق ہو جائے۔

اے گل بتو خرسندم تو بوئے کسے داری

حالانکہ ایک صاحبِ نظر کے لیے پھول کا یہی پہلو زیادہ جاذبِ نظر ہے۔ وہ یہ سوچتا ہے کہ اگر پھول سے مقصود صرف گل قندی ہوتا تو صرف اس مقصد کے لیے اس کی ایک ایک پنکھڑی پر قدرت کو اس فیاضی کے ساتھ گل کاری کی کیا ضرورت تھی؟ یہ گل کاری اور صنعت گری تو اسی لیے فرمائی گئی ہے کہ پھول کی ایک ایک پتی معرفتِ کردگار کے دفتر کا کام دے۔

نیوٹن نے سیب کے درخت سے ایک سیب زمین پر گرتے دیکھا۔ اس سے اس کا ذہن زمین کی کشش کے اصول کی طرف منتقل ہو گیا۔ پھر اس اصول سے بہت سے اصول دریافت ہو گئے جو علمی تحقیقات و انکشافات میں بہت کارآمد ثابت ہوئے لیکن نگاہ ایک خاص حد سے آگے نہ بڑھ سکی۔ اس اصول کی تمام کارفرمائیاں بس اسی دنیا کی تنگ نائے کے اندر محدود رہ گئیں۔ ورنہ یہیں سے یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ وہ کون ہے جس نے کائنات کی ایک ایک چیز کو خواہ چھوٹی ہو یا بڑی، جذب و کشش کے اس قانون سے باندھ رکھا ہے؟ ظاہر ہے کہ اس سوال کا ایماندارانہ جواب یہی ہو سکتا ہے کہ ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ یہ سارا کارخانہ ایک غالب و مقتدر اور ایک حکیم و علیم کا بنایا ہوا ہے لیکن اس سوال اور اس کے جواب سے چونکہ بہت بھاری ذمہ داریاں انسان پر عاید ہوتی ہیں اس وجہ سے ہمارے سائنس دان اس سے بھاگتے ہیں۔

حضراتِ انبیاء کی بلند نگاہی

زیرِ بحث آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہ جو فرمایا کہ "اور اسی طرح ہم ابراہیم کو آسمان و زمین میں ملکوتِ الٰہی کا مشاہدہ کراتے تھے" تو اس سے اسی بلند نگاہی کی طرف اشارہ ہے جو اللہ تعالیٰ کی توفیق اور اس کی ہدایت سے حضرات انبیاء کرام کو بالخصوص حاصل ہوتی ہے اور بقدرِ استعداد اس توفیق میں سے وہ لوگ بھی حصہ پاتے ہیں جو ایمان دارانہ اس کائنات پر غور کرتے ہیں اور اپنے غور و فکر کے نتائج سے گریز کے بجائے ان کا خیر مقدم کرتے ہیں۔ وَيَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا میں اسی گروہ کے لوگوں کی طرف اشارہ ہے۔

'وَلِيَكُوْنَ مِنَ الْمُوْقِنِيْنَ' یہاں عربی زبان کے اس معروف قاعدے کے مطابق جس کی ایک سے زیادہ مثالیں پیچھے گزر چکی ہیں، معطوف علیہ محذوف ہے جس کا تعین قرینہ کرے گا۔ یہاں آگے وضاحت موجود ہے کہ اس مشاہدۂ ملکوت سے اللہ نے حضرت ابراہیمؑ کو اپنی وحدانیت کی اس دلیل کی طرف رہنمائی فرمائی جو انھوں نے اپنی قوم پر قائم فرمائی۔ چنانچہ فرمایا ہے وَتِلْكَ حُجَّتُنَآ اٰتَيْنٰهَآ اِبْرٰهِيْمَ عَلٰى قَوْمِهٖ (اور یہ ہے ہماری وہ دلیل جو ہم نے ابراہیم کو اس کی قوم کے مقابل میں عطا فرمائی) اس قرینہ کی روشنی میں اگر اس محذوف کو کھولا جائے تو پوری بات یوں ہو گی کہ "اور اسی طرح ہم ابراہیم کو آسمانوں اور زمین میں ملکوتِ الٰہی کا مشاہدہ کراتے تھے تاکہ وہ اس کے ذریعہ سے اپنی قوم پر حجت قائم کرے اور تاکہ وہ اہلِ یقین میں سے بنے"۔

یقین کے مدارج

یہاں جس 'یقین' کا ذکر ہے یہ وہ یقین ہے جو ایمان کے اوپر کا درجہ ہے جس کو حق الیقین سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ ایمان ایک عام چیز ہے جس کے لیے اگر فطرت سلیم ہو تو اندر کا وجدان بھی کافی ہوتا ہے لیکن یقین، فکر و نظر، تفکر و تدبر اور ملکوت الٰہی کے علم و مشاہدے سے پیدا ہوتا ہے۔ اس کے مراتب و مدارج کی کوئی حد و نہایت نہیں ہے چنانچہ آگے نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنْ نَّشَآءُ میں اسی کے مراتب عالیہ کی طرف اشارہ ہوا ہے۔ یہی یقین جب ایمان کے اندر پیدا ہوتا ہے تب اس کا فیضان متعدی ہوتا ہے یہاں تک کہ بسا اوقات اس سے دشت و جبل گونج اٹھتے ہیں۔ حضرات انبیا چونکہ خلق کی ہدایت پر مامور ہوتے ہیں اس وجہ سے وہ اس میں سے حصۂ وافر پاتے ہیں اور پھر ان کے بعد ان لوگوں کا درجہ ہوتا ہے جو ان کے متبعین باحسان میں شامل ہوتے ہیں۔

فَلَمَّا جَنَّ عَلَيْهِ الَّيْلُ رَاٰ كَوْكَبًا ۚ قَالَ هٰذَا رَبِّيْ ۚ فَلَمَّآ اَفَلَ قَالَ لَآ اُحِبُّ الْاٰفِلِيْنَ ۝ فَلَمَّا رَاَ الْقَمَرَ بَازِغًا قَالَ هٰذَا رَبِّيْ ۚ فَلَمَّآ اَفَلَ قَالَ لَئِنْ لَّمْ يَهْدِنِيْ رَبِّيْ لَاَكُوْنَنَّ مِنَ الْقَوْمِ الضَّآلِّيْنَ ۝ فَلَمَّا رَاَ الشَّمْسَ بَازِغَةً قَالَ هٰذَا رَبِّيْ هٰذَآ اَكْبَرُ ۚ فَلَمَّآ اَفَلَتْ قَالَ يٰقَوْمِ اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ ۝ اِنِّيْ وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِيْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِيْفًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ (۷۶-۷۹)

ان آیات میں لغت یا اسلوب زبان کا کوئی اشکال نہیں ہے۔ نظم کے پہلو سے یہ اوپر والی آیات کے اجمال کی تفصیل ہے۔ پہلے حوالہ دیا کہ کس طرح ابراہیمؑ نے اپنے باپ اور اپنی قوم کے دین کے کھوکھلے پن کو ان کے سامنے بے نقاب کیا اور ان کی کھلی ہوئی گمراہی پر ان کو ملامت کی۔ پھر اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ اس طرح ہم ابراہیم علیہ السلام پر آسمان و زمین میں اپنی ملکوت کے اسرار و حقائق بے نقاب کرتے تھے تاکہ وہ اپنی قوم پر ہماری حجت قائم کرے اور تاکہ وہ کامل یقین میں سے بنے۔ اس کے بعد اب یہ وضاحت ہو رہی ہے کہ ابراہیمؑ نے کس طرح اپنی قوم پر یہ واضح کیا کہ وہ اس کائنات کی جن چیزوں کو معبود سمجھ کر ان کی پرستش کر رہی ہے وہ ساری چیزیں خود اپنے وجود سے شہادت دے رہی ہیں کہ وہ ملکوتِ الٰہی کے تابع اور اس کے احکام و قوانین کے تحت مسخر ہیں۔ مجال نہیں ہے کہ ہر مراد ادھر ادھر ان سے تجاوز کر سکیں۔ اس وجہ سے عبادت کا اصلی مستحق وہ ہے جو ان سب کا خالق و فاطر ہے نہ کہ یہ جو محکوم و مقہور ہیں۔ اب ہم حضرت ابراہیمؑ کے اس استدلال کی وضاحت کریں گے لیکن اس وضاحت سے پہلے چند باتیں حضرت ابراہیمؑ کے طرزِ خطاب و استدلال سے متعلق سمجھ لینی ضروری ہیں۔

حضرت ابراہیمؑ کے طرزِ استدلال کی بعض خصوصیات

حضرات انبیاء علیہم السلام یوں اپنی دعوت اور اپنے مقصد کے اعتبار سے تو بالکل یک رنگ و ہم آہنگ ہوتے ہیں لیکن اپنے مخاطبوں کے مزاج، ان کی افتادِ طبع اور ان کے ذوق کے اختلاف کے سبب سے ہر نبی کے طرزِ خطاب اور طریقۂ استدلال و بحث میں کچھ امتیازی خصوصیات پیدا ہو گئی ہیں۔ مثلاً حضرت یحییٰ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام زیادہ تر تمثیلوں میں بات کرتے تھے۔ بعض انبیا میں موعظت کا رنگ غالب ہے بعض کے ہاں قانون کا انداز نمایاں ہے۔ یہ فرق، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، زیادہ تر نتیجہ ہے مخاطب کے

ذوق و مزاج کے فرق و اختلاف کا لیکن کچھ اس میں اس ذوقی رجحان کو بھی دخل ہوتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے ہر طبیعت میں الگ الگ ودیعت فرمایا ہے۔

استدراج

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قوم، جیسا کہ قرآن میں بیان کردہ واقعات سے معلوم ہوتا ہے، بڑی مناظرباز اور حجت طراز قوم تھی۔ اول تو لوگ بات سننے کے لیے آسانی سے تیار ہی نہ ہوتے اور اگر کبھی سنانے کا کوئی موقع نکلتا بھی تو بڑی جلدی بدک جاتے اور مباحثہ و مناظرہ کے لیے آستینیں چڑھا لیتے۔ ان کے مزاج کی اس درشت کی وجہ سے حضرت ابراہیمؑ بحث و خطاب میں استدراج کا طریقہ زیادہ اختیار فرماتے۔ استدراج کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے مخاطب پر اس راہ سے درجہ بدرجہ گھیرے ڈالتے جدھر سے اس کو سان گمان بھی نہ ہوتا کہ وہ گھیرے میں آسکتا ہے۔ اس کی ایک مثال اس واقعہ میں موجود ہے جو سورۂ انبیاء میں بیان ہوا ہے۔ انھوں نے ایک دن موقع نکال کر قوم کے بت خانے کے سارے بت ٹکڑے ٹکڑے کر کے رکھ دیے۔ صرف بڑے بت کو سلامت چھوڑ دیا۔ جب پوچھ گچھ شروع ہوئی اور حضرت ابراہیمؑ سے سوال ہوا کہ کیا یہ تمھارا فعل ہے، انھوں نے جھٹ جواب دیا کہ یہ تو اس بڑے بت کی کارستانی معلوم ہوتی ہے اور ٹوٹے ہوئے بتوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ انھی سے کیوں نہیں پوچھ لیتے جن پر یہ مصیبت گزری ہے۔ اگر یہ بولتے ہیں تو اپنی مصیبت کی داستان خود ہی سنا دیں گے۔ حضرت ابراہیمؑ کی یہ بات سن کر پہلے تو سب پر شرم سے گھڑوں پانی پڑ گیا کہ فی الواقع ہم کتنے احمق ہیں کہ ایسی چیزوں کو معبود بنائے بیٹھے ہیں جو خود اپنی حفاظت سے بھی قاصر ہیں۔ جب یہ خود اپنی حفاظت نہیں کر سکتیں تو بھلا ہماری حفاظت کیا کریں گی۔ اس طرح اندر سے ان کا اعتقاد متزلزل ہو گیا۔ لیکن پھر حمیت جاہلیت کے جوش میں حضرت ابراہیمؑ کی بات کا جواب دینے کی کوشش کی تو اس کوشش میں اپنی حماقت کا اعتراف بھی کر گئے۔ بولے کہ یہ تو تمھیں معلوم ہی ہے کہ یہ بولتے نہیں۔ ان کے اس اعتراف پر حضرت ابراہیمؑ کو ایک نہایت عمدہ موقع ان کی حماقت پر توجہ دلانے کا مل گیا اور انھوں نے ایک نہایت مؤثر تقریر کی کہ تم پر افسوس ہے کہ تم ایسی چیزوں کی پرستش کرتے ہو جو نہ کسی نفع پر قادر ہیں نہ کسی نقصان پر۔

توریہ

اس طریقۂ استدراج کے تقاضے سے حضرت ابراہیمؑ کبھی کبھی توریہ سے بھی کام لیتے تھے۔ توریہ کا یہ مطلب ہے کہ وہ اپنی کوئی اسکیم پوری کرنے کے لیے حریف کے سامنے اپنی بات اس طرح پیش کرتے کہ بات تو بالکل صحیح ہوتی لیکن اس کے پیش کرنے کا انداز ایسا ہوتا کہ حریف اس سے مغالطہ میں پڑ جاتا جس کا نتیجہ یہ نکلتا کہ ہوشیاری کے باوجود وہ اسکیم کے بروئے کار آجانے سے پہلے اس سے آگاہ نہ ہو پاتا۔ اس کی نہایت لطیف مثال سورۂ صافات میں ہے۔ انشاء اللہ ہم اس پر اس کے مقام میں گفتگو کریں گے اور وہیں بعض الفاظ کی وضاحت بھی کریں گے جن کے صحیح مفہوم سے بے خبری کے باعث بہت سے لوگ نہایت افسوسناک قسم کی غلط فہمیوں کے شکار ہو گئے۔

مزاج

اس استدراج اور اس توریہ میں کہیں کہیں پاکیزہ ظرافت بھی شامل ہو جاتی ہے جو کچھ تو اس استدراج اور توریہ کا فطری تقاضا ہوتی ہے اس لیے کہ ہر کام ایک مخصوص انداز اور مخصوص اسلوب کا طالب ہوتا ہے اور کچھ اس میں اس لطافتِ ذوق کی نمود بھی ہوتی ہے جو حضرت ابراہیمؑ کے مزاج کی ایک خصوصیت ہے اس کی نہایت عمدہ مثالیں سورۂ انبیا اور سورۂ صافات میں آئیں گی۔

اس تمہید کے بعد اب زیرِ بحث آیات پر غور فرمائیے۔

'حجتِ ابراہیمی' کی وضاحت

ایک دن انھوں نے ایک ستارے کو چمکتے دیکھا (ہو سکتا ہے کہ یہ ستارہ زہرہ ہو جس کی ان کی قوم پوجتی تھی یا کوئی اور ستارہ ہو) تو بولے کہ ہاں بھائی یہ میرا رب ہے۔ قرینہ صاف بتا رہا ہے کہ یہ بات انھوں نے خود اپنے آپ کو مخاطب کر کے اس طرح فرمائی ہو گی کہ دوسروں کے کان میں بھی پڑ جائے۔ سننے والوں نے جب ان کی زبان سے یہ بات سنی ہو گی تو انھوں نے اطمینان کا سانس لیا ہو گا کہ چلو، یہ بھی غنیمت ہے۔ ایک ایسا شخص جو باپ دادا کے دین اور ہمارے معبودوں سے بالکل بیزار ہے جس حد تک بھی ہمارے ساتھ موافقت کر رہا ہے اسی پر قناعت کرو اور زیادہ اس کے درپے نہ ہو۔ حضرت ابراہیمؑ یہ بات لوگوں کے کانوں میں ڈال کر خاموش ہو رہے۔ پھر جب ستارہ ڈوب گیا تو انھوں نے بالکل اسی انداز میں اپنے کو مخاطب اور دوسروں کو سناتے ہوئے کہا کہ میں ان ڈوب جانے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔ آس پاس والوں کا سابق اطمینان تو ان کی یہ بات سن کر رخصت ہو گیا ہو گا لیکن وہ اس سوچ میں ضرور پڑ گئے ہوں گے کہ اس نوجوان کا ہمارے معبودوں سے انحراف محض نوجوانی کی ترنگ اور بے قیدی و آزادی کی لا ابالیانہ خواہش کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ اس کی سوچ نے اس کے عقیدے کو متزلزل کر دیا ہے۔ چونکہ بات ان کو براہِ راست مخاطب کر کے تحدی کے انداز میں نہیں کہی گئی تھی اس وجہ سے وہ زیادہ مشتعل بھی نہیں ہوئے ہوں گے بلکہ وہ اس فکر میں پڑ گئے ہوں گے کہ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ ہماری بات ہی میں کوئی کمزوری ہے۔

کسی جمود کا اس حد تک ہل جانا بھی ایک بڑی کامیابی ہے۔ حضرت ابراہیمؑ نے اس طرح ان کو اس حقیقت کی طرف توجہ دلائی کہ ان ستاروں کا طلوع ہونا اور چمکنا ہی کیوں دیکھتے ہو۔ طلوع ہونے کے بعد ان کا ڈوب جانا کیوں نہیں دیکھتے؟ جب طلوع کے ساتھ غروب اور آنے کے ساتھ جانا بھی ہے اور اس پابندی اور محکومی کے ساتھ کہ مجال نہیں ہے کہ کبھی ایک لمحہ کے لیے بھی وقت یا سمت میں یا ہیئت اور شکل میں سرِ مو تغیر ہو جائے تو یہ تو گویا وہ خود زبانِ حال سے بتا رہے ہیں کہ ہم آئے نہیں بلکہ لائے گئے ہیں اور جاتے نہیں بلکہ لے جائے جاتے ہیں۔ عمر

لائی حیات آئے قضا لے چلی چلے
اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے

اس حقیقت کے ساتھ ساتھ حضرت ابراہیمؑ نے یہ بات بھی ان کے کانوں میں ڈال دی کہ خالق و مالک کے

ساتھ بندے کا تعلق محبت کی بنیاد پر ہے، نہ کہ مجرد خوف کی بنیاد پر۔ مجرد خوف ایسی چیز نہیں ہے جس کی بنیاد پر کسی کا کوئی حق قائم ہو جائے اور حق بھی اس کی عبادت کا۔ مشرکین کے لیے یہ بات بھی ایک نئی رہنمائی دینے والی بات تھی اس لیے کہ شرک کی بنیاد تمام تر خوف پر ہے۔ حضرت ابراہیمؑ نے گویا بتایا کہ میں مجرد خوف کی بنیاد پر کسی کی عبادت کرنے کے لیے تیار نہیں بلکہ محبت کی بنا پر عبادت کرتا ہوں اور محبت کی سزاوار یہ آنی جانی چیزیں نہیں بلکہ صرف وہ ہے جس کے حکم سے یہ چیزیں آتی جاتی ہیں۔

فَلَمَّا رَاَ الْقَمَرَ بَازِغًا الایۃ اسی طرح کسی دن، پورے چاند کی پھیلی ہوئی چاندنی میں انھوں نے پھر اس تعلیم کے لیے موقع پیدا کر لیا اور بالکل اسی لب و لہجہ اور اسی انداز میں انھوں نے چاند کے متعلق وہی بات کہی جو پہلے ستارے کے متعلق کہی تھی۔ پھر جب وہ بھی ڈوب گیا تو انھوں نے اسی طرح اپنے کو مخاطب کرتے ہوئے اور آس پاس والوں کو سناتے ہوئے فرمایا کہ لَئِنْ لَّمْ يَهْدِنِيْ رَبِّيْ لَاَكُوْنَنَّ مِنَ الْقَوْمِ الضَّآلِّيْنَ (اگر میرے رب نے میری رہنمائی نہ فرمائی تو میں گمراہوں میں سے ہو جاؤں گا) غور کیجیے تو معلوم ہو گا کہ یہاں تعلیم کا قدم پہلے کی نسبت سے آگے ہے۔ یہاں صرف اتنی ہی بات نہیں ظاہر ہوئی کہ ڈوبنے والے سزاوار عبادت نہیں بلکہ یہ بات بھی ظاہر ہوئی کہ ان ڈوبنے والوں کو معبود بنانا کھلی ہوئی ضلالت ہے۔ نیز یہ بات بھی ظاہر ہوئی کہ یہ ضلالت کوئی معمولی چیز نہیں ہے بلکہ بڑے حسرت و اندوہ کی چیز ہے۔ علاوہ ازیں یہ بات بھی ظاہر ہوئی کہ ہدایت کا سرچشمہ صرف خدا ہے، وہ ہدایت نہ بخشے تو انسان ہر چمکتی چیز کو سونا سمجھ کر اس کے درپے ہو جاتا ہے۔ یہ ساری باتیں حضرت ابراہیمؑ نے چونکہ اپنے آپ سے کہیں اس وجہ سے سننے والوں میں سے جس کے کان میں پڑی ہوں گی اس کے لیے ان سے چڑنے کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی تھی بلکہ جس کے اندر کچھ بھی غور و فکر کی صلاحیت رہی ہو گی وہ اس سوچ میں پڑ گیا ہو گا کہ ایک یہ شخص ہے جو طلب ہدایت میں اس طرح بے قرار ہے اور ایک ہم ہیں کہ پتھر کی طرح اپنی جگہ سے کھسکنے کا نام ہی نہیں لے رہے ہیں۔

ایک حقیقت کا اظہار

یہاں حضرت ابراہیمؑ نے جو یہ بات فرمائی کہ لَئِنْ لَّمْ يَهْدِنِيْ رَبِّيْ لَاَكُوْنَنَّ مِنَ الْقَوْمِ الضَّآلِّيْنَ تو یہ ایک حقیقت نفس الامری کا اظہار ہے۔ ہدایت ہمیشہ خدا ہی سے حاصل ہوتی ہے، اگر وہ ہدایت نہ دے تو کسی کو بھی ہدایت حاصل نہیں ہو سکتی۔ بعض لوگوں نے اس کو شرط فی الماضی کے مفہوم میں لیا ہے لیکن اس تکلف کی ضرورت نہیں۔ ان کے یہ بات کہنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ اس سے پہلے گمراہی میں تھے یا اپنے کو گمراہی پر سمجھتے تھے بلکہ انھوں نے اپنی فطرت سلیم کا آئینہ دوسروں کے سامنے رکھا ہے کہ وہ لوگ اس آئینہ میں اپنے منہ دیکھیں۔ لیکن بس آئینہ رکھ دیا ہے خود ان کو مخاطب کر کے کچھ نہیں کہا ہے کہ وہ دہشت زدہ اور بدگمان نہ ہوں۔

اسی طرح ایک دن انھوں نے سورج کے طلوع و غروب کو اپنی تعلیم کا ذریعہ بنا لیا۔ سورج جب آب تاب سے نکلا اور نصف النہار پر پہنچا تو اسی انداز میں جس کا ذکر اوپر گزرا، انھوں نے سورج کے متعلق بھی وہی بات فرمائی جو تارے اور چاند کے متعلق فرمائی تھی۔ البتہ اس کے ساتھ اتنا اضافہ بھی فرما دیا کہ هٰذَآ اَكْبَرُ یہ

سب سے بڑا ہے؟ قرینہ صاف پتہ دے رہا ہے کہ یہ بات انھوں نے طنز، تحقیر اور استہزار کے طور پر فرمائی لیکن سننے والوں نے پھر اطمینان کا سانس لیا ہوگا کہ چلو، اس سرپھرے آدمی سے یہ بھی غنیمت ہے۔ زہرہ اور چاند کو نہیں مانتا نہ سہی، ہمارے بڑے دیوتا سورج کو تو مانتا ہے لیکن ان کا یہ اطمینان بھی زیادہ دیرپا نہ ثابت ہوا۔ آخر سورج کو بھی ڈوبنا ہی تھا، وہ بھی ڈوب گیا، جب وہ بھی ڈوب گیا تو حضرت ابراہیمؑ نے بالکل کھل کر اور سب کو مخاطب کر کے حق کا اعلان فرما دیا کہ 'یٰقَوْمِ اِنِّیْ بَرِیْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِکُوْنَ' اے میری قوم کے لوگو! تم جن چیزوں کو خدا کا شریک ٹھہراتے ہو میں ان سے اپنے آپ کو بری کرتا ہوں۔ اب تک انھوں نے جو کچھ فرمایا تھا اس کی نوعیت خود اپنے اوپر اپنے تاثرات کے اظہار کی تھی، اگرچہ اس سے مقصود بالواسطہ قوم کی عقل اور اس کے ضمیر کو بیدار کرنا ہی تھا لیکن قوم کو براہِ راست مخاطب نہیں فرمایا تھا۔ اب انھوں نے ان کو براہِ راست مخاطب کر کے ان کے دین اور ان کے معبودوں سے اپنی برأت کا اعلان فرما دیا۔

اعلانِ برأت اور توحید کا زندۂ جاوید کلمہ

'اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ' یہ اس اعلانِ برأت کی تعبیر اور اس کا کلمہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ میں نے تمام معبودانِ باطل سے کٹ کر اور بالکل یکسو ہو کر اپنا رخ اس رب کی طرف کر لیا ہے جو تمام آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے۔ اور میں مشرکین میں سے نہیں ہوں۔ 'لِلَّذِیْ' کا 'لِ' اس بات پر دلیل ہے کہ 'وَجَّهْتُ' کا لفظ 'اَسْلَمْتُ' کے مضمون پر بھی مشتمل ہے۔ یعنی میں نے اپنے آپ کو بالکلیہ آسمان و زمین کے خالق و مالک کے حوالہ کر دیا۔ یہ توحید اور اسلام کی عظیم آیت اور ملتِ ابراہیمی کا کلمۂ جامعہ ہے اور ہم چونکہ اپنی نمازوں میں اسی حقیقت کا اظہار و اعتراف کرتے ہیں اس وجہ سے ان کا آغاز اسی کلمۂ جامعہ سے کرتے ہیں۔

وَحَآجَّهٗ قَوْمُهٗ ؕ قَالَ اَتُحَآجُّوْٓنِّیْ فِی اللّٰهِ وَقَدْ هَدٰىنِ ؕ وَلَآ اَخَافُ مَا تُشْرِکُوْنَ بِهٖٓ اِلَّآ اَنْ یَّشَآءَ رَبِّیْ شَیْـًٔا ؕ وَسِعَ رَبِّیْ کُلَّ شَیْءٍ عِلْمًا ؕ اَفَلَا تَتَذَکَّرُوْنَ ۝ وَکَیْفَ اَخَافُ مَآ اَشْرَکْتُمْ وَلَا تَخَافُوْنَ اَنَّکُمْ اَشْرَکْتُمْ بِاللّٰهِ مَا لَمْ یُنَزِّلْ بِهٖ عَلَیْکُمْ سُلْطٰنًا ؕ فَاَیُّ الْفَرِیْقَیْنِ اَحَقُّ بِالْاَمْنِ ۚ اِنْ کُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝ اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ یَلْبِسُوْٓا اِیْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ اُولٰٓئِکَ لَهُمُ الْاَمْنُ وَهُمْ مُّهْتَدُوْنَ ۝ (۸۰-۸۲)

قوم کا طرف سے ڈرانے اور حضرت ابراہیمؑ کا جواب

'وَحَآجَّهٗ قَوْمُهٗ' جب یہ بات یہاں تک پہنچ گئی، حضرت ابراہیمؑ نے صاف صاف نہ صرف توحید کا بلکہ شرک اور شرکاء سے اپنی برأت کا بھی اعلان کر دیا تو ان کی قوم ان سے بحث و جدال کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی اور شرک کی بنیاد، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، چونکہ تمام تر خوف اور وہم پرستانہ اندیشوں پر ہوتی ہے اس وجہ سے قوم کے لوگوں نے طرح طرح سے ان کو ڈرانا دھمکانا شروع کر دیا کہ معبودوں سے نفرت و بغاوت کا اعلان کرتے ہو تو ان کی پکڑ میں آ جاؤ گے، اندھے ہو جاؤ گے، اپاہج ہو جاؤ گے، تم پر بجلی گرے گی، بری موت مرو گے۔ حضرت ابراہیمؑ نے جواب میں فرمایا کہ تم خدا کے باب میں مجھ سے جھگڑتے ہو کہ میں تنہا اسی کو کیوں مانتا ہوں، اس کے شریک کیوں نہیں ٹھہراتا؟ اسی خدا نے تو مجھے یہ ہدایت بخشی ہے کہ اس کا کوئی شریک

نہیں ہے۔ یہ بات یہاں یاد رکھنی چاہیے کہ حضرت ابراہیمؑ کی قوم خدا کی منکر نہیں تھی بلکہ اس کے شریک ٹھہراتی تھی اور یہ بات صرف حضرت ابراہیمؑ کی قوم ہی کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ دنیا کی کوئی قوم بھی خدا کی منکر نہیں ہوئی ہے، جس نے بھی ٹھوکر کھائی ہے اس کی توحید کے باب میں ٹھوکر کھائی ہے۔ 'وَلَآ اَخَافُ مَا تُشْرِكُوْنَ بِهٖٓ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ رَبِّيْ شَيْـًٔا' یہ قوم کے ڈراووں کا جواب ہے کہ میں تمھارے ان فرضی شریکوں سے ذرا نہیں ڈرتا، مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا جب تک میرا رب مجھے کوئی نقصان نہ پہنچانا چاہے، نفع نقصان اسی کے اختیار میں ہے، اس کے اذن کے بغیر کسی کی مجال نہیں ہے کہ میرا بال بیکا کر سکے۔ اس کا علم ہر چیز کا احاطہ کیے ہوئے ہے اس وجہ سے مجھے یہ بھی اندیشہ نہیں ہے کہ کوئی اس کی لاعلمی میں مجھے کوئی نقصان پہنچا دے گا۔ یہ تم لوگ کیسی باتیں کرتے ہو، کیا تم لوگ سوچتے نہیں؟ 'اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ' میں تفویض الی اللہ کا مضمون ہے جس سے اس حقیقت کا اظہار ہو رہا ہے کہ میں یہ جو کچھ کہہ رہا ہوں خدا کے اعتماد پر کہہ رہا ہوں۔ یہ مضمون حضرت شعیبؑ کی زبان سے سورۂ اعراف میں بھی آیا ہے قَدِ افْتَرَيْنَا عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اِنْ عُدْنَا فِيْ مِلَّتِكُمْ بَعْدَ اِذْ نَجّٰىنَا اللّٰهُ مِنْهَا ۭ وَمَا يَكُوْنُ لَنَآ اَنْ نَّعُوْدَ فِيْهَآ اِلَّآ اَنْ يَّشَاۗءَ اللّٰهُ رَبُّنَا ۭ وَسِعَ رَبُّنَا كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا ۭ عَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْنَا (۸۹۔ اعراف) (اگر ہم تمھاری ملت میں پھر لوٹ گئے بعد اس کے کہ اللہ نے ہمیں اس سے نجات بخشی تو یہ ہم اللہ پر جھوٹ تہمت باندھیں گے، یہ ہم سے تو ہوگا نہیں کہ ہم پھر اس میں لوٹ آئیں مگر یہ کہ اللہ ہمارا رب چاہے۔ ہمارے رب کا علم ہر چیز کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ اللہ ہی پر ہم نے بھروسہ کیا) اس سے معلوم ہوا کہ پاک سے پاک ارادے اور سچے سے سچے عزم کی تکمیل بھی اللہ تعالیٰ کی توفیق پر ہی منحصر ہے۔ اس وجہ سے بندے کو کوئی بات بھی مجرد اپنے عزم پر دعوے کے ساتھ نہیں کہنی چاہیے بلکہ خدا کے اعتماد پر کہنی چاہیے۔ اس لیے کہ ہر راہ میں اس کی آزمائشیں ہیں اور ان آزمائشوں میں پورا اترنا اس کی مدد اور توفیق کے بغیر ممکن نہیں۔

اُلٹا چور کوتوال کو ڈانٹے

'وَكَيْفَ اَخَافُ مَآ اَشْرَكْتُمْ' یعنی ڈرنا تو تمھیں چاہیے خدا کے غضب اور اس کے قہر سے کہ تم نے ایسی چیزوں کو خدا کا شریک بنا رکھا ہے جن کے بارے میں تمھارے پاس خدا کی اتاری ہوئی کوئی سند اور دلیل نہیں ہے کہ اس نے ان کو اپنا شریک بنایا ہے لیکن الٹے تم ڈرا مجھے رہے ہو۔ جہاں تک خدا کا تعلق ہے اس کو تو تم بھی مانتے ہو، میں بھی مانتا ہوں۔ یہ تو ایک مسلم بات ہوئی۔ اب خدا کے سوا کچھ اور بھی ہیں جو خدا کے شریک و سہیم ہیں تو اس کا بارِ ثبوت تم پر ہے۔ اگر تم بے ثبوت ان کو شریکِ خدا بنائے بیٹھے ہو تو تم خدا کے اقراری مجرم ہو۔ اور اگر وہ تم کو اس کی سزا دے تو تم سزا کے مستحق ہو۔ میں نے کس کا جرم کیا ہے جس سے ڈروں؟ اگر تم کچھ علم رکھتے ہو تو بتاؤ کہ خدا کی امان کا حقدار میں ہوں یا تم؟ لیکن یہ عجب ہے کہ تم چور ہو کر الٹے کوتوال کو ڈانٹتے ہو۔

'اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ يَلْبِسُوْٓا اِيْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ الآیۃ' ظلم سے مراد، جیسا کہ ایک سے زیادہ

توحید کا اصل حقیقت

مقامات میں ہم واضح کر آئے ہیں، شرک ہے۔ اب یہ توحید کے باب میں اصل حقیقت کا بیان ہے کہ خدا کو ماننا صرف وہ معتبر ہے جو شرک کے ہر شائبہ سے پاک ہو۔ جس ایمان کے اندر شرک کی ملاوٹ ہو وہ ایمان خدا کے ہاں معتبر نہیں۔ تم امن کا ضامن اپنے شرکا کو سمجھتے ہو اور خدا سے بے نیاز ہو حالانکہ امن کے سزاوار وہ ہیں جو ہر معاملے میں صرف خدا پر اعتماد رکھتے ہیں اور شرک سے بری ہیں۔ یہی لوگ ہدایت پر ہیں، اس کے سوا ہر راہ گمراہی کی راہ ہے۔

وَتِلْكَ حُجَّتُنَآ اٰتَيْنٰهَآ اِبْرٰهِيْمَ عَلٰى قَوْمِهٖ ۭ نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنْ نَّشَاۗءُ ۭ اِنَّ رَبَّكَ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ (۸۳)

یہ ارتقائے فکر نہیں بلکہ ارتقائے دعوت ہے

"تِلْكَ حُجَّتُنَآ اٰتَيْنٰهَآ اِبْرٰهِيْمَ عَلٰى قَوْمِهٖ" یہ اشارہ توحید کی اس دلیل کی طرف ہے جو حضرت ابراہیمؑ نے اپنی قوم پر قائم فرمائی اور جو اوپر تفصیل سے مذکور ہوئی۔ اس کے متعلق ارشاد ہوا ہے کہ یہ ہے ہماری وہ حجت جو ہم نے ابراہیمؑ کو اس کی قوم کے مقابل میں عطا فرمائی، اس سے یہ بات صاف نکلتی ہے کہ جو لوگ اس کو حضرت ابراہیمؑ کا فکری ارتقا سمجھتے ہیں ان کا خیال قرآن کے بالکل خلاف ہے۔ یہ حضرت ابراہیمؑ کے فکر کا ارتقا نہیں بلکہ اس کو کہہ سکتے ہیں تو ان کی دعوت کا ارتقا کہہ سکتے ہیں۔ اگر یہ حضرت ابراہیمؑ کے فکر کا ارتقاء بیان ہوا ہوتا تو 'عَلٰى قَوْمِهٖ' کے الفاظ کی ضرورت نہیں تھی۔

یہاں چند اور باتیں بھی ذہن میں رکھیے۔

انبیاء نبوت سے پہلے بھی فطرتِ سلیم پر ہوتے ہیں

ایک یہ کہ حضرات انبیا علیہم السلام فطرتِ سلیم پر پیدا ہوتے اور فطرتِ سلیم ہی پر پروان چڑھتے ہیں۔ نبوت سے پہلے بھی ان کو کبھی توحید و شرک کے معاملے میں اشتباہ پیش نہیں آتا۔ توحید تو عہد فطرت ہے جو خدا نے اولادِ آدم سے ان کو دنیا میں بھیجنے سے پہلے ہی لیا ہے اور قرآن سے یہ ثابت ہے کہ اس عہد ہی کی بنا پر توحید کے معاملے میں ہر شخص عنداللہ مسئول ہوگا خواہ اسے کسی نبی کی دعوت پہنچی ہو یا نہ پہنچی ہو۔ ایسی حالت میں کسی نبی کے متعلق یہ گمان کرنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے کہ وہ نبوت سے پہلے بھی کبھی کسی شرک سے آلودہ ہو سکتا ہے[1]۔ نبوت سے پہلے بھی حضرات انبیاء جہاں تک مبادی فطرت کا تعلق ہے بالکل فطرۃ اللہ پر ہوتے ہیں اس لیے کہ وہ نخل فطرت کے بہترین ثمر ہوتے ہیں۔ اس دور میں انھیں جو جستجو ہوتی ہے وہ خدا کی نہیں بلکہ خدا کی مرضیات اور اس کے احکام کی ہوتی ہے۔ یہ جستجو بھی درحقیقت ان کی فطرتِ سلیم ہی کی پیاس ہوتی ہے جو اپنے بلوغ پر بھڑکتی ہے اور سیرابی و آسودگی کی خواہاں ہوتی ہے۔ یہ سیرابی ان کو وحی کے ابرِ نیساں سے حاصل ہوتی ہے۔ انبیا کے لیے وحی کی حیثیت تاریکی کے اندر روشنی کی نہیں بلکہ روشنی

---

[1] اس مسئلہ پر مفصل بحث سورۃ اعراف کی آیت ۱۷۲ کے تحت آئے گی۔ اپنی کتاب 'حقیقتِ شرک و توحید' میں بھی ایک فصل 'شرک کا اصل سبب' کے عنوان سے ہم نے اس مسئلہ پر لکھی ہے۔

کے اوپر روشنی کی ہوتی ہے نُوْرٌ عَلٰی نُوْرٍ یَهْدِی اللّٰهُ لِنُوْرِهٖ مَنْ یَّشَآءُ اس مسئلہ پر خدا نے چاہا تو ہم سورۂ نور کی تفسیر میں تفصیل سے بحث کریں گے۔

یہ حجت حضرت ابراہیمؑ نے اپنی دعوت کا آغاز فرمایا ہے۔ پہلے انھوں نے نبی ہونے کے بعد پیش کی ہے

دوسری یہ کہ حضرت ابراہیمؑ کا ملکوتِ الٰہی سے جو استشہاد اوپر مذکور ہوا ہے وہ نبوت سے پہلے کا نہیں بلکہ نبوت سے سرفراز ہونے کے بعد کا ہے جب انھوں نے اپنی دعوت کا آغاز فرمایا ہے۔ پہلے انھوں نے اپنے باپ کو دعوت دی اور یہی حضرات انبیاء کی معروف سنت رہی ہے کہ انھوں نے سب سے پہلے اپنے سب سے زیادہ قریبی عزیزوں کو دعوت دی ہے۔ اس کے بعد اپنی قوم کی طرف متوجہ ہوئے اور ان کے سامنے بالتدریج اس طرح اعلانِ حق فرمایا جس کی تفصیل اوپر بیان ہوئی۔ اس بات کی دلیل کہ یہ نبوت کے بعد کا واقعہ ہے آیات ۷۹۔۸۰ میں موجود ہے۔ ان آشکارا الفاظ میں یہ زندۂ جاوید کلمات ایک نبی کے سوا کون کہہ سکتا ہے۔

ترتیبِ واقعات شاہد ہے کہ یہ ارتقائے نکر نہیں ہے

تیسری یہ کہ اگر یہ حضرت ابراہیمؑ کا فکری ارتقا ہوتا تو واقعات کی یہ ترتیب بالکل خلاف فطرت ماننی پڑے گی۔ آخر سب سے پہلے ان کو ایک چھوٹے سے تارے ہی نے کیوں اپنی طرف متوجہ کیا، ہر صبح کو اس کروفر سے طلوع ہونے والا سورج کہاں چلا گیا تھا؟ اس قسم کے خلاف فطرت مشاہدے کے لیے پھر اس سے زیادہ خلاف فطرت یہ روایت لوگوں کو گھڑنی پڑی کہ حضرت ابراہیمؑ کی ولادت ایک غار میں ہوئی تھی، اسی میں وہ پلے اور جوان ہوئے اور جب اس سے نکلے تو شب کا وقت تھا اور پہلی چیز جس کا انھوں نے اس کائنات کی جاذب نظر چیزوں میں سے مشاہدہ کیا وہ زہرہ ستارہ تھا۔

استدراجی طریقۂ استدلال کی ایک خصوصیت

چوتھی یہ کہ استدراجی طریقۂ استدلال میں متکلم اگر حریف کی کسی بات کو مانتا ہے تو ماننے کے لیے نہیں مانتا بلکہ وہ اس کو اسی داؤں پر شکست دینا چاہتا ہے جس کو حریف اپنا خاص داؤں سمجھتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انبیا کے مکذبین کے لیے اپنی جس سنتِ استدراج کا ذکر قرآن میں فرمایا ہے اس کی بھی خاص خصوصیت یہی بیان ہوئی کہ اللہ تعالیٰ وہیں سے ان کو دھر لیتا ہے جہاں سے ان کو اپنی کامیابی و فتح مندی کا غرّہ ہوتا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ کی قوم اگر سورج، چاند، زہرہ کی پرستش کرتی تھی تو آخر اس کے نزدیک ان کی خدائی کی دلیل کیا تھی؟ یہی نا کہ وہ طلوع ہوتے اور چمکتے ہیں۔ حضرت ابراہیمؑ نے اسی کو پکڑ لیا کہ اگر طلوع ہونا اور چمکنا ہی ان کی الوہیت کی دلیل ہے تو آؤ ان کا ڈوبنا اور تاریک ہونا بھی دیکھ لو اور بتاؤ تمھاری وہ دلیل کہاں گئی! نفسیاتِ انسانی کا یہ نکتہ بھی یہاں ملحوظ رہے کہ جن کی خدائی کی دلیل ان کے وقتی کروفر ہی سے اخذ کی گئی ہو ان کی بے ثباتی اور ناپائداری پر سب سے مؤثر تقریر کا وقت وہی ہوتا ہے جب ان کی لاش ان کے پرستاروں کے سامنے پڑی ہو۔

ہر سخن جائے و ہر نکتہ مکانے دارد

پانچویں یہ کہ انبیا کے طریقۂ کار اور خطاب و استدلال میں، استدراج، مزاح، طنز، توریہ اور تدریج وغیرہ کے انداز جو کہیں کہیں پائے جاتے ہیں، یہ سب انسانی فطرت کے مقتضیات پر مبنی ہیں۔ ان میں سے ہر اسلوب کا ایک محل ہوتا ہے اور ہر انداز اپنا ایک مقام رکھتا ہے۔ بسا اوقات ایک وقفہ، جو بظاہر ٹھہراؤ ہوتا

ہے، سفر کی ہزاروں منزلیں طے کرا دیتا ہے اور ایک دلآویز طنز، جو بظاہر طنز ہوتا ہے، ہزاروں حجتوں پر بھاری ہو جاتا ہے۔ خدا نے چاہا تو قرآن کے آخری گروپ میں دعوتِ انبیا کے یہ نفسیاتی پہلو تفصیل سے زیرِ بحث آئیں گے۔

ملکوتِ الٰہی میں تفکر کی برکتیں

'نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنْ نَّشَآءُ اِنَّ رَبَّكَ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ' 'درجات' جمع بھی ہے اور اس پر تنوین بھی ہے اس وجہ سے اس کا صحیح ترجمہ یہ ہوگا کہ ہم جس کو چاہتے ہیں درجے پر درجے بلند کرتے ہیں۔ اوپر 'لِيَكُوْنَ مِنَ الْمُوْقِنِيْنَ' کے تحت ہم نے جس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے اسی کی تعبیر یہ دوسرے الفاظ میں ہے کہ جو لوگ ملکوتِ الٰہی پر غور کرتے ہیں اللہ تعالیٰ اسی طرح علم و معرفت اور ایمان و یقین میں ان کے مدارج بلند کرتا جاتا ہے۔ حکیم و علیم کی صفات کا یہاں حوالہ اسی سنت اللہ کی طرف اشارہ کر رہا ہے جو اللہ نے اپنے اس چاہنے کے لیے مقرر فرمائی ہے۔ یعنی اس کا یہ چاہنا، اس کے علم و حکمت پر مبنی ہوتا ہے۔ وہ اپنے قرب کے مدارج آنکھ بند کر کے نہیں بانٹتا بلکہ ان کو بخشتا ہے جو اس کے سزاوار ہوتے ہیں اور جو اس کے حقوق ادا کرتے ہیں۔ اس میں نہایت لطیف اشارہ اس بات کی طرف بھی ہے کہ آدمی اگر عقل و فکر سے کام نہ لے تو اپنے ہاتھوں کے تراشے ہوئے پتھروں کو معبود بنا کر سجدے کرتا اور ان سے حاجت روائی کا امیدوار ہوتا ہے اور اگر عقل و فکر سے کام لے تو شمس و قمر اور زہرہ و مشتری سب اس کی راہ کی گرد ہو کر رہ جاتے ہیں۔

وَوَهَبْنَا لَهٗٓ اِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ ۭ كُلًّا هَدَيْنَا ۚ وَنُوْحًا هَدَيْنَا مِنْ قَبْلُ وَمِنْ ذُرِّيَّتِهٖ دَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ وَاَيُّوْبَ وَيُوْسُفَ وَمُوْسٰى وَهٰرُوْنَ ۭ وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ۝ وَزَكَرِيَّا وَيَحْيٰى وَعِيْسٰى وَاِلْيَاسَ ۭ كُلٌّ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝ وَاِسْمٰعِيْلَ وَالْيَسَعَ وَيُوْنُسَ وَلُوْطًا ۭ وَكُلًّا فَضَّلْنَا عَلَي الْعٰلَمِيْنَ ۝ وَمِنْ اٰبَاۗىِٕهِمْ وَذُرِّيّٰتِهِمْ وَاِخْوَانِهِمْ ۚ وَاجْتَبَيْنٰهُمْ وَهَدَيْنٰهُمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝ ذٰلِكَ هُدَى اللّٰهِ يَهْدِيْ بِهٖ مَنْ يَّشَاۗءُ مِنْ عِبَادِهٖ ۭ وَلَوْ اَشْرَكُوْا لَحَبِطَ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ۚ فَاِنْ يَّكْفُرْ بِهَا هٰٓؤُلَاۗءِ فَقَدْ وَكَّلْنَا بِهَا قَوْمًا لَّيْسُوْا بِهَا بِكٰفِرِيْنَ ۝ اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ فَبِهُدٰىهُمُ اقْتَدِهْ ۭ قُلْ لَّآ اَسْـَٔـلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا ۭ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٰى لِلْعٰلَمِيْنَ (٨٤-٩٠)

اس دنیا میں حضرت ابراہیمؑ کے لیے رفع ذکر کی سرفرازی

اوپر کی آیات میں حضرت ابراہیمؑ کی دعوت کے ساتھ ان کے روحانی و ایمانی مدارج کا بیان ہوا۔ اب یہ بتایا جا رہا ہے کہ اس دنیا میں بھی اللہ نے ان کو اور ان کی دعوت کو رفعِ ذکر اور شہرتِ دوام کی عزت و سرفرازی عطا فرمائی۔ ان کی ذریت میں بڑے بڑے انبیاء اور بلند مرتبہ صالحین و مجددین اٹھے اور ان سب کا دین وہی دینِ توحید تھا جس کی دعوت ابراہیمؑ نے اور ان سے پہلے نوحؑ نے دی۔ مطلب یہ ہے کہ یہی دین تمام انبیاء کا مشترک دین ہے اور تم بھی اسی دین کی دعوت دے رہے ہو۔ اگر تمھاری قوم اس کو قبول نہیں کرنا چاہتی تو تم اس کی پروا نہ کرو۔ اللہ نے دوسروں کو کھڑا کر دیا ہے جو اس کے حامل بنیں گے۔ تمھیں ان کی مخالفت سے بے نیاز ہو کر بہرحال انہی لوگوں کے دین کی پیروی کرنی ہے جن کو اللہ کی ہدایت نصیب ہوئی۔

تو تم انہی کی پیروی کرو اور ان مخالفوں سے صاف صاف کہہ دو کہ میں تم سے کسی عوض کا طالب تو ہوں نہیں کہ اگر تم نے میری دکان سے مال نہ خریدا تو میری دکان بیٹھ جائے گی۔ میں تو تمہارے سامنے جو کچھ پیش کر رہا ہوں تمہارے لیے ایک یاددہانی ہے۔ اس کو قبول کرو تو تمہارا اپنا نفع ہے، نہ قبول کرو گے تو تم خود بھگتو گے میرا کچھ نہیں جائے گا۔

ایں خانہ تمام آفتاب است

وَوَهَبْنَا لَهٗٓ اِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ الایہ حضرت اسحٰقؑ، حضرت ابراہیمؑ کے بیٹے اور حضرت یعقوبؑ پوتے ہیں۔ فرمایا کہ كُلًّا هَدَيْنَا اُن میں سے ہر ایک کو ہم نے ہدایت بخشی یعنی اسی دینِ توحید اور اسی صراطِ مستقیم کی جس کی دعوت ابراہیمؑ نے دی۔ وَنُوْحًا هَدَيْنَا مِنْ قَبْلُ یہ حضرت ابراہیمؑ سے اوپر کے سلسلۂ ہدایت کی طرف بھی اشارہ ہو گیا کہ ابراہیمؑ سے پہلے نوحؑ کو بھی ہم نے اسی راستے کی ہدایت کی تھی اور اس نے اسی کی دعوت دی۔ تالمود سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت نوحؑ نے حضرت ابراہیمؑ کی تربیت بھی فرمائی تھی۔ اس پہلو سے گویا اوپر اور نیچے دونوں کی کڑیاں مل گئیں۔ وَمِنْ ذُرِّيَّتِهٖ میں ضمیر حضرت ابراہیمؑ کی طرف لوٹتی ہے۔ فرمایا کہ اس کی ذریت میں سے ہم نے داؤدؑ، سلیمانؑ، ایوبؑ، یوسفؑ، موسیٰؑ اور ہارونؑ کو بھی اسی صراطِ مستقیم کی ہدایت سے نوازا۔

انبیاء جن کو نبوت کے ساتھ سیاسی اقتدار بھی حاصل ہوا

یہاں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ یہ سارے حضرات جلیل القدر انبیائے بنی اسرائیل میں سے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ یہ خصوصیت بھی ان میں مشترک ہے کہ ان میں سے ہر ایک کو بادشاہت یا کسی نہ کسی نوع کی سیاسی سیادت حاصل ہوئی۔ وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ میں اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ انھیں یہ ہدایت اس وجہ سے حاصل ہوئی کہ یہ خوب کار لوگ تھے، اللہ نے ان کو جو صلاحیتیں بخشیں ان کو انھوں نے صحیح استعمال کیا تو اللہ نے ان کو اپنی نعمتوں سے نوازا۔ گویا اس کا کوئی تعلق خاندان کی وراثت سے نہیں بلکہ تمام تر صفات و اخلاق سے تھا۔

انبیاء جن کا مشترک وصف زہد و توکل ہے

وَزَكَرِيَّا وَيَحْيٰى الایہ زکریا، یحییٰ اور عیسیٰ علیہم السلام مشہور پیغمبروں میں سے ہیں۔ 'الیاس' سے مراد توریت کے ایلیا نبی ہیں۔ ان پیغمبروں کی نسبت بھی فرمایا کہ اللہ نے ان کو بھی اسی صراطِ مستقیم کی ہدایت بخشی جس کی ہدایت ابراہیمؑ اور دوسرے نبیوں کو بخشی۔ یہ بھی توحید اور اسلام ہی کے داعی تھے، کسی اور دین کے داعی نہیں تھے۔ كُلٌّ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ یہ سب کے سب زمرہ صالحین میں سے تھے۔ اس سے ایک تو وہی بات نکلی جس کی طرف اوپر اشارہ گزرا کہ یہ جو کچھ انھیں حاصل ہوا ان کے صلاح و تقویٰ کی بنا پر حاصل ہوا، دوسری بات یہ نکلی کہ یہ تھے بہرحال خدا کے صالح بندوں ہی میں سے، ان میں سے کسی کو خدائی کا مقام حاصل نہیں تھا جیسا کہ نصاریٰ نے حضرت عیسیٰؑ کے متعلق گمان کیا۔ جس طرح مذکورہ بالا انبیاء میں حکومت و سیادت مشترک وصف کی حیثیت رکھتی ہے اسی طرح ان انبیا میں زہد، فقر اور تبتل کی شان مشترک ہے۔

'الیسع' کی تحقیق

وَاِسْمٰعِيْلَ وَالْيَسَعَ وَيُوْنُسَ وَلُوْطًا الآیۃ ان ناموں میں سے تین نام اسمٰعیلؑ، یونسؑ اور لوطؑ تو مشہور ہیں، قرآن میں بھی ان انبیاء کی سرگزشتیں بیان ہوئی ہیں۔ البتہ الیسع سے ملتے جلتے دو نبیوں کے نام ہیں۔ ایک الیشع جن کا زمانہ سنہ ۸۵۳ ق.م بتایا جاتا ہے، دوسرے یسعیاہ جن کا زمانہ سنہ ۶۲۰ ق.م بتایا گیا ہے۔ پہلا نام قرآن کے تلفظ سے قریب تر ہے۔ 'وَكُلًّا فَضَّلْنَا عَلَى الْعٰلَمِيْنَ' میں اسی منصبی فضیلت کی طرف اشارہ ہے جو ہر نبی کو اس کے منصب کی بنا پر حاصل ہوتی ہے۔ نبی چونکہ خلق کی ہدایت پر مامور ہوتا ہے اس وجہ سے اس کو یہ فضیلت حاصل ہوتی ہے۔ یہاں ان انبیاء کے لیے جو صفات بیان ہوئی ہیں وہ تمام انبیاء کی مشترک صفات ہیں، الگ الگ بیان کرنے سے مقصود ان کی تخصیص نہیں، محض تعدید ہے تاکہ ہر صفت پر قاری کی الگ الگ توجہ ہو جائے۔

'وَمِنْ اٰبَآئِهِمْ وَذُرِّيّٰتِهِمْ' الآیۃ یعنی یہ ہدایت صرف ان نبیوں تک ہی محدود نہیں رہی، ان کے باپ دادوں، ان کی آل اولاد اور ان کے بھائی بندوں میں سے بھی کتنوں کو یہ سعادت حاصل ہوئی۔ فرمایا کہ ہم نے انھیں بھی اپنی راہ دکھائی، انھیں برگزیدہ کیا اور ان کو صراط مستقیم کی ہدایت بخشی۔ 'اجتباء' سے مراد یہاں وہ برگزیدگی ہے جو اللہ نے اپنی توحید اور ہدایت کی دعوت و اشاعت کے لیے ان کو بخشی۔ 'صراط مستقیم' سے مراد یہاں توحید کی راہ ہے۔ اور اس کی تنکیر یہاں تفخیمِ شان کے پہلو سے ہے۔

ہدایت وہ ہے جو انبیاء کو حاصل ہوئی

'ذٰلِكَ هُدَى اللّٰهِ' یعنی یہی ہدایت جو ان تمام نبیوں کو اور ان کی پیروی کرنے والوں کو حاصل ہوئی یہی اللہ کی ہدایت ہے۔ باقی اس کے سوا جتنی راہیں ہیں سب شیطان کی نکالی ہوئی ہیں۔ یہ راہ اللہ اپنے ان بندوں پر کھولتا ہے "جن کے لیے چاہتا ہے" "جن کے لیے چاہتا ہے" سے اشارہ اس سنت اللہ کی طرف ہے جو اس نے ایمان و ہدایت کے لیے مقرر کر رکھی ہے۔ اس کی وضاحت ہم ایک سے زیادہ مقامات میں کر چکے ہیں۔ فرمایا کہ یہ لوگ بھی، جن کو اللہ نے یہ مرتبے عطا فرمائے اگر کہیں شرک میں مبتلا ہو جاتے تو ان کا سارا کیا دھرا برباد ہو کے رہ جاتا۔ مجرد اس بنیاد پر ان کی برگزیدگی قائم نہ رہتی کہ یہ نوحؑ یا ابراہیمؑ کی اولاد ہیں۔ یہ تنبیہ اہل عرب کے لیے بھی ہے اور بنی اسرائیل کے لیے بھی کہ توحید سے منحرف ہو کر جو لوگ مجرد اس نسبت پر برگزیدگی کے خواب دیکھ رہے ہیں جو انھیں ابراہیمؑ کی اولاد ہونے کے سبب سے حاصل ہے وہ نری حماقت میں مبتلا ہیں۔ یہ تو در کنار اگر وہ بھی شرک میں آلودہ ہو جاتے تو خدا کے ہاں ان کا بھی کوئی وزن باقی نہ رہ جاتا۔

'حکم' اور 'حکمت' کی وضاحت

'اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ' الآیۃ 'کتاب' کے ساتھ حکمت کا لفظ قرآن میں اکثر آیا ہے۔ یہاں 'حکم' کا لفظ ہے۔ مولانا فراہیؒ اپنی کتاب مفردات القرآن میں لفظ 'حکم' پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ 'حکم' سے مراد صحیح فہم اور صحیح فہم کی روشنی میں معاملات کا فیصلہ کرنا ہے۔ یہی چیز جب پختہ ہو کر ایک ملکۂ راسخہ کی حیثیت اختیار کر لیتی ہے تو اس کو حکمت کہتے ہیں؛ حکم اور حکمت کتاب الٰہی کے لوازم میں سے ہیں اس لیے کہ کتاب الٰہی کا اصل مقصد ہی زندگی کے معاملات میں رہنمائی دینا ہے، عام اس

ہے کہ زندگی انفرادی ہو یا اجتماعی اور عام اس سے کہ پیش آمدہ صورتِ معاملہ صریحاً کتاب میں بیان ہوئی ہو یا اجتہاداً واستنباطاً اس کا حکم نکالنا پڑے۔ کتاب کی طرح یہ حکم بھی عطیۂ الٰہی ہے اور اسی سے کتابِ الٰہی زندگی کی ایک عملی حقیقت بنتی ہے۔ اگر حاملینِ کتاب اس چیز سے محروم ہو جائیں تو پھر کتاب زندگی کے معاملات و مسائل سے بے تعلق ہو کر محض ایک ایسی تاریخی دستاویز بن کے رہ جاتی ہے جو نوادرات کے کسی عجائب خانہ میں رکھی ہو۔

صحابہ کرامؓ کا عظیم رتبہ

آیت کا مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ (جن کا اوپر بیان ہوا) ہیں جن کو ہم نے کتاب، حکم اور نبوت کی نعمت سے سرفراز کیا اور انھوں نے اس نعمت کی قدر کی۔ اب انھی نعمتوں سے ہم نے تمھارے واسطہ سے (اشارہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہے) ان لوگوں کو (اشارہ اہل مکہ کی طرف ہے) نوازنا چاہا ہے۔ حق تو یہ تھا کہ یہ اس نعمت کی قدر کرتے لیکن یہ لوگ اس نعمت کی اگر ناقدری کرتے ہیں تو تم ان کی پروا نہ کرو، ہم نے ایسے لوگوں کو اس کی ذمہ داری اٹھانے کے لیے مقرر کر دیا ہے جو اس کا انکار کرنے والے نہیں ہیں۔ 'وَکَّلْنَا بِھَا' میں ذمہ دار بنائے جانے کے ساتھ ساتھ ضامن اور امین بنائے جانے کا مفہوم بھی پایا جاتا ہے۔ 'ب' اس پر دلیل ہے۔ 'قَوْمًا' سے مراد یہاں صحابہؓ کی وہ جماعت بھی ہے جو اس وقت تک داخلِ اسلام ہو چکی تھی اور وہ لوگ بھی ہیں جن کے لیے بعد میں اس کے حاملین میں داخل ہونا مقدر تھا، اگرچہ ان آیات کے نزول کے وقت تک وہ ان میں داخل نہیں ہوئے تھے۔ اس ٹکڑے میں صحابہؓ کی استقامت اور مستقبل میں اُمت کی کثرت کی پیشینگوئی ہے اور اس پہلو سے یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ایک عظیم بشارت ہے جو اس دور میں آپ کو دی گئی جب آپ مخالفتوں کے طوفان سے گزر رہے تھے۔ الفاظ سے تقدیرِ الٰہی کا وہ اٹل فیصلہ بھی مترشح ہو رہا ہے جو اس دعوت کو فتح مند کرنے کے لیے ہو چکا ہے اور یہ اشارہ بھی نکل رہا ہے کہ اللہ نے اپنے جن بندوں کو اس کے لیے کھڑا کر دیا ہے ان کی قلتِ تعداد پر نہ جاؤ، یہی لوگ اس دعوت کے علمبردار ہوں گے اور یہی قطرے ایک دن سمندر بنیں گے۔

یہ دعوت ہے نہ کہ تجارت

اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ ھَدَی اللّٰہُ الاٰیۃ 'اقْتَدِہْ' میں 'ہ' وقف اور سکتہ کی ہے۔ فرمایا کہ یہی لوگ ہیں جن کو اللہ نے اپنی ہدایت سے سرفراز فرمایا تو تم انھی کے نقشِ قدم پر چلو اور انھی کی ہدایت کی پیروی کرو۔ رہے یہ لوگ جو مدعی تو ہیں ابراہیمؑ کے وارث ہونے کے لیکن پیروی کر رہے ہیں شیطان کی اور تمھاری بات سننے کے لیے تیار نہیں ہیں تو ان کو ان کے حال پر چھوڑو۔ ان سے کہہ دو کہ میں اس پر کوئی معاوضہ تو تم سے مانگ نہیں رہا ہوں کہ تم اس کا بوجھ محسوس کر رہے ہو، میں نے اپنے رب سے مفت پایا ہے، مفت بانٹ رہا ہوں۔ اگر قبول کرو گے تو تمھارا ہی نفع ہے، رد کر دو گے تو خود محروم رہو گے۔ یہ اللہ کے دین کی دعوت ہے، یہ کوئی تجارت اور دوکانداری نہیں ہے کہ تم گاہک نہ بنے تو میرا کاروبار بیٹھ جائے گا۔ میرا اجر تو اللہ کے ذمہ ہے۔

ذکریٰ کے دو مفہوم

اِنْ ھُوَ اِلَّا ذِکْرٰی لِلْعٰلَمِیْنَ میں 'ھُوَ' کا مرجع قرآن ہے اور یہ اسی مضمون کی مزید توضیح ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ قرآن تو محض لوگوں کے لیے ایک تذکیر اور ایک یاددہانی ہے۔ پیغمبر نے اگر یہ یاددہانی پہنچا دی تو وہ

اپنی ذمہ داری سے سبکدوش ہوا۔ اگر لوگ اس کو قبول نہیں کرتے تو اس کا انجام وہ خود دیکھیں گے۔ پیغمبر پر یہ ذمہ داری نہیں ہے کہ لوگ اس کو قبول ہی کر لیں۔ قرآن کے لیے 'ذِکْرٰی' کے لفظ سے دو حقیقتوں کی طرف اشارہ ہو رہا ہے۔ ایک تو اس حقیقت کی طرف کہ وہ جو کچھ پیش کر رہا ہے وہ کوئی اوپری اور انوکھی بات نہیں ہے بلکہ انھی حقائق کی یاد دہانی ہے جو انسانی فطرت کے اندر ودیعت ہیں لیکن لوگوں نے ان کو اپنی خواہشات و بدعات کے نیچے دبا دیا ہے۔ دوسرے اس حقیقت کی طرف کہ یہ اسی ہدایت الٰہی کی یاد دہانی کر رہا ہے جس کو نوحؑ، ابراہیمؑ اور تمام انبیا لے کر آئے لیکن ان کے ساتھ نسبت کے مدعیوں نے اس ہدایت الٰہی کی جگہ مختلف ناموں سے مختلف ضلالتیں ایجاد کر لیں، اور انہی ضلالتوں کو اپنے بزرگوں کا دین سمجھ بیٹھے۔ قرآن اپنی اس تذکیر سے تاریخ کے فراموش کردہ اوراق کو بھی یاد دلا رہا ہے اور فطرت کے فراموش کردہ اسباق کو بھی۔ پس جس کا جی چاہے اس سے فائدہ اٹھائے۔

۱۳۔ آگے کا مضمون —— آیات ۹۱-۹۴

اوپر بیان ہوا کہ قرآن، توحید اور اسلام کی جو دعوت دے رہا ہے یہ تمام انبیا کی مشترک دعوت ہے۔ جو لوگ اس کی تکذیب کر رہے ہیں یہ ان کی اپنی محرومی و بدقسمتی ہے۔ اب آگے چند آیتوں میں ان تکذیب کرنے والوں کے رویہ پر تبصرہ فرمایا ہے اور ان کے اقوال کا حوالہ دے کر ان کی لغویت واضح کی ہے۔ ان تکذیب کرنے والوں میں پیش پیش تو قدرتی طور پر رؤسائے مکہ تھے لیکن ابتدا ہی سے یہود نے ان کی پیٹھ ٹھونکنی شروع کر دی تھی اس لیے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کے فروغ میں اصلی خطرہ وہ اپنے ہی لیے سمجھتے تھے۔ ان لوگوں کے ذہن میں بات تو یہ بسی ہوئی تھی کہ نبوت و رسالت ان کے خاندان کا اجارہ ہے، اگر کوئی نبی آنے والا ہی ہے تو بنی اسرائیل میں آئے گا، اس خانوادہ سے باہر کیسے آ سکتا ہے۔ اب جو یہ صورتِ حال ان کے سامنے آئی تو سخت کش مکش میں پڑ گئے کہ اس خطرے کو کیسے روکیں۔ غیر جانبدار بن کے بیٹھے رہنا ممکن نہیں تھا لیکن مخالفت کریں تو کس انداز سے کریں۔ اگر یہ بات کہیں کہ نبوت و رسالت ان کے خاندان کا حصہ ہے اور تورات کی موجودگی میں اب کسی اور قرآن و کتاب کی ضرورت باقی نہیں رہی تو اندیشہ تھا کہ اس سے عربوں کی حمیت بھڑکے گی اور عجب نہیں کہ اس جوش میں وہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی حمایت کے لیے اٹھ کھڑے ہوں۔ اس اندیشے کی بنا پر انھوں نے اپنے دل کی بات تو دل میں رکھی لیکن آنحضرتؐ کے مخالفین کو شہ دینے کے لیے یوں کہنا شروع کر دیا کہ جو بھی یہ دعویٰ کرتا ہے کہ اس پر خدا نے کوئی کتاب اتاری ہے بالکل برخود غلط ہے، خدا نے کسی پر بھی کوئی چیز نہیں اتاری ہے۔ یہ بات وہ کہتے تو تھے اپنے مخصوص ذہنی تحفظ کے ساتھ ہی لیکن اس سیاسی مصلحت سے، جس کی طرف ہم نے اشارہ کیا، وہ اس کو ایک عام کلیہ کے رنگ میں پیش کرتے تھے۔ قرآن نے یہاں ان کی یہ شرارت بھی بے نقاب کی اور قریش کے ان

منکرین کو بھی جواب دیا جو محض اپنے غرور سیادت میں یہ بات ماننے کے لیے تیار نہیں تھے کہ ان کے حلقے سے باہر بھی کوئی شخص ایسا ہو سکتا ہے جس کو خدا کوئی شرف و عزت بخش سکتا ہے۔ اس روشنی میں آگے کی آیات تلاوت فرمائیے۔

آیات ۹۱-۹۴

وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖٓ اِذْ قَالُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰى بَشَرٍ مِّنْ
شَيْءٍ ۗ قُلْ مَنْ اَنْزَلَ الْكِتٰبَ الَّذِيْ جَآءَ بِهٖ مُوْسٰى نُوْرًا وَّهُدًى
لِّلنَّاسِ تَجْعَلُوْنَهٗ قَرَاطِيْسَ تُبْدُوْنَهَا وَتُخْفُوْنَ كَثِيْرًا ۚ وَعُلِّمْتُمْ
مَّا لَمْ تَعْلَمُوْٓا اَنْتُمْ وَلَآ اٰبَآؤُكُمْ ۖ قُلِ اللّٰهُ ۙ ثُمَّ ذَرْهُمْ فِيْ خَوْضِهِمْ
يَلْعَبُوْنَ ﴿۹۱﴾ وَهٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ مُّصَدِّقُ الَّذِيْ بَيْنَ
يَدَيْهِ وَلِتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰى وَمَنْ حَوْلَهَا ۗ وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ
يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَهُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ ﴿۹۲﴾ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ
افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ قَالَ اُوْحِيَ اِلَيَّ وَلَمْ يُوْحَ اِلَيْهِ شَيْءٌ وَّ
مَنْ قَالَ سَاُنْزِلُ مِثْلَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ ۗ وَلَوْ تَرٰٓى اِذِ الظّٰلِمُوْنَ فِيْ
غَمَرٰتِ الْمَوْتِ وَالْمَلٰٓئِكَةُ بَاسِطُوْٓا اَيْدِيْهِمْ ۚ اَخْرِجُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ۗ
اَلْيَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُوْنِ بِمَا كُنْتُمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ غَيْرَ
الْحَقِّ وَكُنْتُمْ عَنْ اٰيٰتِهٖ تَسْتَكْبِرُوْنَ ﴿۹۳﴾ وَلَقَدْ جِئْتُمُوْنَا فُرَادٰى
كَمَا خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّتَرَكْتُمْ مَّا خَوَّلْنٰكُمْ وَرَآءَ ظُهُوْرِكُمْ ۚ وَمَا نَرٰى
مَعَكُمْ شُفَعَآءَكُمُ الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ اَنَّهُمْ فِيْكُمْ شُرَكٰٓؤُا ۗ لَقَدْ تَّقَطَّعَ
بَيْنَكُمْ وَضَلَّ عَنْكُمْ مَّا كُنْتُمْ تَزْعُمُوْنَ ﴿۹۴﴾ ع ۱۱ ۱۷

ترجمۂ آیات ۹۱-۹۴

اور انھوں نے اللہ کی صحیح قدر نہیں پہچانی جب کہ یہ کہا کہ اللہ نے کسی بشر پر بھی

کوئی چیز نہیں اتاری۔ ان سے پوچھو، وہ کتاب کس نے اتاری جس کو موسیٰ روشنی اور لوگوں کے لیے ہدایت کی حیثیت سے لے کر آئے، جس کو تم ورق ورق کر کے کچھ کو ظاہر کرتے ہو اور زیادہ کو چھپاتے ہو، اور تم کو ان باتوں کی تعلیم دی گئی جن کو نہ تم جانتے تھے اور نہ تمھارے باپ دادا؛ کہہ دو اللہ ہی نے، پھر ان کو ان کی کج بحثیوں میں چھوڑ دو، کھیلتے رہیں اور یہ ایک کتاب ہے جو ہم نے اتاری بابرکت، تصدیق کرنے والی اپنے سے پہلے کی چیز کی (تاکہ تو خوش خبری دے) اور تاکہ ہوشیار کر دے ام القریٰ اور اس کے اردگرد والوں کو اور جو آخرت پر ایمان رکھتے ہیں وہی اس پر ایمان لائیں گے اور وہی اپنی نماز کی حفاظت کرتے ہیں۔ ۹۱-۹۲

اور اس سے بڑھ کر ظالم کون ہے جو اللہ پر جھوٹ تہمت باندھے یا دعوے کرے کہ مجھ پر وحی آئی ہے درآنحالیکہ اس پر کچھ بھی وحی نہ آئی ہو اور اس سے جو دعوے کرے کہ جیسا کلام خدا نے اتارا ہے میں بھی اتار دوں گا۔ اور اگر تم دیکھ پاتے اس وقت کو جب کہ یہ ظالم موت کی جانکنیوں میں ہوں گے اور فرشتے ہاتھ بڑھائے ہوئے مطالبہ کر رہے ہوں گے کہ اپنی جانیں حوالہ کرو، آج تم ذلت کا عذاب دیے جاؤ گے بوجہ اس کے کہ تم اللہ پر ناحق تہمت جوڑتے تھے اور تم متکبرانہ اس کی آیات سے اعراض کرتے تھے۔ اور بالآخر تم آئے ہمارے پاس اکیلے اکیلے جیسا کہ ہم نے تم کو اول بار پیدا کیا اور جو کچھ ہم نے تم کو دیا تھا سب تم نے پیچھے چھوڑا اور ہم تمھارے ساتھ تمھارے ان سفارشیوں کو بھی نہیں دیکھتے جن کے بارے میں تمھارا گمان تھا کہ وہ تمھارے معاملہ میں ہمارے شریک ہیں۔ تمھارا رشتہ بالکل ٹوٹ گیا اور جو چیزیں تم گمان کیے بیٹھے تھے وہ سب ہوا ہو گئیں۔ ۹۳-۹۴

۱۴۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖٓ اِذْ قَالُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰى بَشَرٍ مِّنْ شَيْءٍ ۗ قُلْ مَنْ اَنْزَلَ الْكِتٰبَ الَّذِيْ جَآءَ بِهٖ مُوْسٰى نُوْرًا وَّهُدًى لِّلنَّاسِ تَجْعَلُوْنَهٗ قَرَاطِيْسَ تُبْدُوْنَهَا وَتُخْفُوْنَ كَثِيْرًا ۚ وَعُلِّمْتُمْ مَّا لَمْ تَعْلَمُوْٓا اَنْتُمْ وَلَآ اٰبَآؤُكُمْ ۭ قُلِ اللّٰهُ ۙ ثُمَّ ذَرْهُمْ فِيْ خَوْضِهِمْ يَلْعَبُوْنَ (۹۱)

یہود کی ایک شرارت

مَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖٓ اِذْ قَالُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰى بَشَرٍ مِّنْ شَيْءٍ اوپر ہم اشارہ کر چکے ہیں کہ یہ قول کہ "اللہ نے کسی بشر پر کوئی چیز نہیں اتاری ہے" یہود کا ہے۔ اگرچہ ان کے ذہن میں تو بات یہ رہی ہوگی کہ اب موسیٰ کی کتاب اور ان کی شریعت کے بعد کسی نئی کتاب و شریعت کی ضرورت باقی نہیں رہی لیکن یوں صاف صاف بات کہنے میں عربوں کی قومی حمیت کے بھڑکنے کا، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، اندیشہ تھا اس وجہ سے انھوں نے اس پہلو کو بچاتے ہوئے کہہ دیا کہ خدا نے کسی پر بھی کچھ نہیں اتارا ہے کہ اپنا مقصد بھی حاصل ہو جائے اور کسی کو کوئی بدگمانی بھی نہ ہو۔ یہاں جواب میں ان کے قول کا ظاہری اور باطنی دونوں ہی پہلو ملحوظ ہے۔

خلق کی ہدایت کا سامان کرنا خدا کی صفات کا لازمی تقاضا ہے

پہلے ان کے قول کے ظاہر الفاظ پر گرفت فرمائی اور اس کی تمہید یوں اٹھائی کہ انھوں نے یہ بات کہہ کر خدا کی قدردانی کا کچھ اچھا ثبوت نہیں دیا۔ اگر یہ بات اُمّی عرب کہتے تو ان کے لیے کچھ عذر ہو سکتا تھا کہ کتاب و شریعت سے ناآشنا لوگ ہیں اس وجہ سے ایک عامیانہ بات کہہ گزرے۔ لیکن جب یہ بات ان لوگوں نے کہی جو تمام نبیوں اور رسولوں کے وارث اور تمام کتاب و شریعت کے حامل ہونے کے مدعی ہیں تو ثابت ہوا کہ خداشناسی کے ان مدعیوں نے خدا کو بہت کم پہچانا ہے۔ ورنہ سوچنے کی بات ہے کہ جس خدا نے انسان کے اندر ودیعت کردہ ہر طلب اور ہر تقاضے کا بہتر سے بہتر جواب مہیا کیا آخر وہ اس کے سب سے قوی داعیہ — طلب ہدایت — ہی کی تسکین و تسلی کا سامان کیوں نہ کرتا؟ اس نے ہمیں پیاس دی تو اس کی تسکین کے لیے زمین کے اندر بھی پانی کی سوتیں جاری کر دیں اور آسمان سے بھی اپنی رحمت کی گھٹائیں برسائیں پھر اس خدا کے متعلق یہ کہنا کہ اس نے کسی پر اپنی ہدایت و شریعت نہیں اتاری، ایک ایسی بات ہے جو وہی کہہ سکتے ہیں جو نہ خدا کی صفتوں سے واقف ہوں اور نہ اس کے ان افضال و عنایات سے جن کے مورد پشتہا پشت سے وہ خود رہ چکے ہیں۔

یہود کا ایک مسکت جواب

قُلْ مَنْ اَنْزَلَ الْكِتٰبَ الَّذِيْ جَآءَ بِهٖ مُوْسٰى نُوْرًا وَّهُدًى لِّلنَّاسِ۔ تمہید کے بعد اب یہ ان سے سوال ہے کہ اگر خدا نے کسی بشر پر کوئی چیز نہیں اتاری تو یہ بتائیں کہ وہ کتاب کس نے اتاری جس کو موسیٰ لے کر آئے اور جو لوگوں کے لیے روشنی اور ہدایت بن کر نازل ہوئی۔ اس کے بعد تَجْعَلُوْنَهٗ قَرَاطِيْسَ تُبْدُوْنَهَا وَتُخْفُوْنَ كَثِيْرًا (جس کو تم ورق ورق کر کے کچھ کو ظاہر کرتے ہو اور زیادہ کو چھپاتے ہو) فرما کر

ان کی اس ناقدری کا بھی اظہار فرما دیا جو انھوں نے اس کتاب کی کی اور اس سے ضمناً ان کے مذکورہ بالا قول کے باطنی پہلو کا بھی ایک جواب ہو گیا کہ اگر انھوں نے یہ بات یہ پیش نظر رکھ کر کہی ہے کہ اب موسیٰ کی کتاب کے بعد کسی اور کتاب و شریعت کی ضرورت نہیں ہے تو ان کو یہ کہنے کا بھی حق نہیں ہے اس لیے کہ انھوں نے اس کتاب کی جو قدر کی ہے وہ یہ ہے کہ اس کو ورق ورق کر رکھا ہے، اس کے کچھ حصہ کو تو یہ ظاہر کرتے ہیں اور زیادہ حصے کو چھپاتے ہیں تو جو چیز روشنی اور ہدایت بن کر آئی تھی اس کے ساتھ انھوں نے جب یہ سلوک کیا تو آخر خدا اپنی مخلوق کو تاریکی میں بھٹکنے کے لیے کس طرح چھوڑے رکھتا اور وہ روشنی و ہدایت ان کے لیے کیوں نہ نازل فرماتا جو ان کو تاریکی سے نکالے اور گمراہی سے نجات دے۔

یہود کی اخفائے کتاب کی سازش

'قراطیس'، قرطاس کی جمع ہے 'قرطاس' لکھنے کے صحیفہ اور ورق کو کہتے ہیں، عام اس سے کہ وہ کسی چیز سے بھی بنایا گیا ہو۔ اس سے وہ تمام چیزیں مراد ہوں گی جو اس زمانے میں لکھنے کے کام آتی تھیں۔ یہ بات یہاں ملحوظ رہے کہ یہود نے تورات اس شکل میں جمع نہیں کی تھی جس شکل میں مسلمانوں نے قرآن کو بابین الدفتین جمع کیا بلکہ انھوں نے اس کو مختلف اجزا میں تقسیم کر لیا تھا اور ہر جزو کو الگ الگ قلمبند کیا تھا اس طرح ان کو اس کی ان تعلیمات اور پیشین گوئیوں کے چھپانے کا آسانی سے موقع مل جاتا تھا جن کو وہ اپنی خواہشات اور مصالح کے خلاف پاتے۔ جب ایک کتاب کے اجزا الگ الگ کراسوں کی شکل میں ہوں اور اس پر اجارہ داری بھی مخصوص ایک گروہ کی ہو تو وہ بڑی آسانی سے یہ کر سکتا ہے کہ اس کے جس جزو کو چاہے اپنے مخصوص حلقے سے باہر کے لوگوں کے علم میں نہ آنے دے۔ قرآن نے یہود پر کتاب الٰہی کے اخفا کا جو جرم عاید کیا ہے اس کی ایک نہایت سنگین شکل یہ بھی تھی اور قرآن کے انداز بیان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس طرح کتاب الٰہی کا زیادہ حصہ یہود نے چھپا لیا تھا، صرف اس کا تھوڑا حصہ وہ ظاہر کرتے تھے اس لیے کہ تُبْدُوْنَهَا وَتُخْفُوْنَ كَثِيْرًا کے الفاظ سے یہ بات صاف نکلتی ہے کہ جو حصہ چھپایا جاتا تھا وہ زیادہ تھا، اس کے معنی لازماً یہ بھی ہوئے کہ جو حصہ ظاہر کیا جاتا تھا وہ تھوڑا تھا۔ اپنی روشنی اور ہدایت اللہ تعالیٰ اس لیے عطا فرماتا ہے کہ لوگ اس سے رہنمائی حاصل کریں نہ اس لیے کہ وہ ڈھانک کے رکھی جائے۔ حضرت مسیحؑ اور بعض دوسرے نبیوں نے بھی یہود کے اس اخفائے کتاب پر ان کی سرزنش کی ہے کہ تم کو چراغ اس لیے دیا گیا تھا کہ اس کو طاق پر رکھو کہ پورے گھر میں روشنی پھیلے لیکن تم نے اس کو پیمانے کے نیچے ڈھانک کے رکھا ہے۔

'وَعُلِّمْتُمْ مَّا لَمْ تَعْلَمُوْٓا اَنْتُمْ وَلَآ اٰبَآؤُكُمْ' یہ جملہ بھی معناً اوپر کے استفہامیہ جملہ ہی پر عطف ہے یعنی وہ کون ہے جس نے موسیٰ کو کتاب دی جس کے ذریعہ سے تم کو وہ باتیں بتائی اور سکھائی گئیں جن کا علم نہ تم کو تھا اور نہ تمھارے باپ دادا کو تھا۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ان تمام احسانات سے واقف ہوتے ہوئے اگر کہتے ہو کہ اللہ نے کسی بشر پر کوئی چیز نہیں اتاری تو یہ دیدہ دلیری کی آخری حد ہے۔

'قُلِ اللّٰہُ، ثُمَّ ذَرْھُمْ فِیْ خَوْضِھِمْ یَلْعَبُوْنَ'، یعنی اگر یہ بھول گئے ہیں تو انھیں یہ بتا دو کہ یہ سب کچھ اللہ ہی کا کیا ہوا ہے اور بتا دینے کے بعد ان کو ان کے حال پر چھوڑ دو کہ جس کھیل میں یہ لگے ہوئے ہیں وہ کھیل لیں تا آنکہ خدا ان کے باب میں اپنا فیصلہ صادر فرما دے۔

وَھٰذَا کِتٰبٌ اَنْزَلْنٰہُ مُبٰرَکٌ مُّصَدِّقُ الَّذِیْ بَیْنَ یَدَیْہِ وَلِتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰی وَمَنْ حَوْلَھَا ط وَالَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَۃِ یُؤْمِنُوْنَ بِہٖ وَھُمْ عَلٰی صَلَاتِھِمْ یُحَافِظُوْنَ (۹۲)

قرآن کا مرتبہ ومقام

'وَھٰذَا کِتٰبٌ اَنْزَلْنٰہُ مُبٰرَکٌ مُّصَدِّقُ الَّذِیْ بَیْنَ یَدَیْہِ'، اوپر کا جواب تو، جیسا کہ ہم نے عرض کیا، ان کے قول کے ظاہری پہلو کو سامنے رکھ کر تھا۔ اب یہ ان کے ذہن کے اندر چھپے ہوئے خیال کو سامنے رکھ کر جواب دیا جا رہا ہے کہ تورات کے بعد اللہ تعالیٰ نے یہ کتاب کیوں نازل فرمائی ؟ اس کے نزول سے کیا کمی پوری ہوئی ؟ اوپر والی آیت میں ضمناً یہ اشارہ ہو چکا ہے کہ تورات پر ناز کرنے والے مدعیوں نے تورات کے ساتھ کیا سلوک کیا لیکن وہ ایک ضمنی جواب تھا۔ اب یہ قرآن کی مستقل حیثیت اور مستقل ضرورت واضح فرمائی گئی ہے کہ یہ کتاب کوئی ایسی کتاب نہیں ہے جو ان کے علم میں پہلی بار آئی ہو۔ یہ تو وہ کتاب مبارک ہے جس کی بشارت ابراہیم کو دی گئی اور جس کی پیشین گوئی موسیٰ اور مسیح سب نے کی ہے۔ یہ اسی بشارت براہیمی کا ظہور اور انہی پیشینگوئیوں کی تصدیق ہے جو پہلے سے موجود ہیں۔ یہاں قرآن کے لیے 'مبارک' اور 'مصدق' کے الفاظ اس سند کو ظاہر کر رہے ہیں جو پچھلے صحیفوں میں اس کی موجود ہے۔ ہم بقرہ اور آل عمران کی تفسیر میں حوالے نقل کر آئے ہیں۔ 'مبارک' کا لفظ اس عالم گیر برکت کی طرف اشارہ کر رہا ہے جس کی بشارت حضرت ابراہیم کو دی گئی تھی کہ اس کا ظہور حضرت اسمٰعیل کی نسل سے پیدا ہونے والے نبی خاتم (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ذریعے سے ہوگا۔ پیدائش باب ۲۲ میں ہے۔

> "خداوند فرماتا ہے، اس لیے کہ تو نے ایسا کام کیا اور اپنا بیٹا اپنا اکلوتا ہی بیٹا دریغ نہ رکھا میں نے قسم کھائی کہ میں تجھے برکت پر برکت دوں گا .... اور تیری نسل سے زمین کی ساری قومیں برکت پائیں گی کیونکہ تو نے میری بات مانی۔"

ہم بقرہ کی تفسیر میں واضح کر چکے ہیں کہ یہاں زمین کی ساری قوموں کے لیے جس برکت کی بشارت ہے وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اور قرآن کے نزول سے پوری ہوئی۔

'مصدق' کے لفظ پر ہم ایک سے زیادہ مقامات پر بحث کر کے بتا چکے ہیں کہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ یہ قرآن ان پیشین گوئیوں کا مصداق ہے جو اس کے متعلق پچھلے صحیفوں میں موجود ہیں۔ چنانچہ تثنیہ باب ۱۸ کے حوالہ سے حضرت موسیٰؑ کی پیشین گوئی اور یوحنا باب ۱۶ کے حوالہ سے حضرت عیسیٰؑ کی پیشینگوئی تفسیر سورہ بقرہ میں نقل ہو چکی ہے۔ ان پیشینگوئیوں سے اس کتاب کی خصوصیات پر بھی روشنی پڑتی ہے اور وہ ضرورت بھی واضح ہوتی ہے جس کے لیے اللہ تعالیٰ نے اس کتاب کے اتارنے کا پہلے سے وعدہ فرمایا۔

قرآن اہل عرب کے لیے انذار اور بشارت ہے

'وَلِتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰی وَمَنْ حَوْلَهَا' اس کا عطف اس مفہوم پر ہے جو پہلے جملہ سے نکلتا ہے یعنی اس کو ہم نے ایک تو اس مقصد سے اتارا کہ یہ اس عالم گیر رحمت و برکت کی بشارت ہو جس کی پیشین گوئی پہلے سے آسمانی صحیفوں میں موجود ہے۔ دوسرے اس لیے کہ تم اس کے ذریعے سے ام القریٰ اور اس کے اردگرد کے لوگوں پر اللہ کی حجت تمام اور انھیں اچھی طرح آگاہ کر دو کہ انھوں نے اس کتاب کو اور تمھاری رسالت کو اگر قبول نہ کیا تو وہ اللہ کے فیصلہ کن عذاب کی زد میں آجائیں گے۔

ام القریٰ کی دینی و سیاسی اہمیت

قرآن کی یہ ضرورت قریش کے تعلق سے واضح کی گئی ہے اور یہ ضرورت بھی ایک ایسی ضرورت تھی جس کا پورا ہونا ضروری تھا۔ قریش بنی اسمٰعیل کے سربراہ تھے اور ان کی مرکزی آبادی مکہ تھی۔ بنی اسمٰعیل کتاب و نبوت سے ناآشنا امی لوگ تھے۔ حضرت ابراہیمؑ سے اللہ تعالیٰ نے وعدہ فرمایا تھا کہ اسمٰعیل کی نسل سے وہ ایک رسول اٹھائے گا جس سے تمام دنیا کی قومیں برکت پائیں گی۔ آنحضرتؐ کی بعثت سے یہ وعدہ پورا ہوا۔ اللہ تعالیٰ کی سنت یہ ہے کہ جس قوم کے اندر رسول کی بعثت ہوتی ہے وہ قوم اگر اس کو قبول کر لیتی ہے تو وہ قوموں کی امامت کے منصب پر سرفراز ہوتی ہے اور اگر اس کو رد کر دیتی ہے تو چونکہ اس پر اللہ کی حجت پوری ہو چکتی ہے، وہ تباہ کر دی جاتی ہے۔ اس اتمام حجت کے لیے اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بنی اسمٰعیل کے اندر مبعوث فرمایا۔ رسولوں کے باب میں سنت اللہ یہ بھی ہے کہ وہ جس قوم کے اندر بھیجے جاتے ہیں خاندانی اعتبار سے اس کے اشراف میں سے ہوتے ہیں اور وہ اپنی دعوت و انذار میں اول مخاطب قوم کے اعیان و اکابر ہی کو بناتے ہیں اسی وجہ سے آنحضرتؐ کی بعثت مکہ میں ہوئی جو اہل عرب کا دینی و سیاسی مرکز اور قریش کا مستقر تھا۔ اسی اعتبار سے اس کو یہاں ام القریٰ کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔

صالحین اہل کتاب اور ان کی علامت

'وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ' الایۃ۔ یہ اشارہ صالحین اہل کتاب کی طرف ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اہل کتاب میں سے جو لوگ آخرت پر ایمان رکھتے ہیں وہی لوگ اس کتاب پر ایمان لائیں گے رہے وہ لوگ جن کے اندر سرے سے آخرت کا کوئی خوف ہی باقی نہیں رہ گیا ہے ان سے کسی خیر کی امید نہ رکھو۔ یہ لوگ اسی طرح کی کج بحثیوں میں پڑے رہیں گے جن میں پڑے ہوئے ہیں۔ 'وَهُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ' یہ خوف آخرت رکھنے والوں کی شناخت بتا دی کہ جن کے اندر آخرت کا خوف موجود ہے وہی ہیں جو اپنی نمازوں کی حفاظت کرتے ہیں۔ بعینہٖ یہی مضمون بقرہ کے شروع میں بھی گزر چکا ہے اور قرآن کے دوسرے مقامات میں بھی بیان ہوا ہے۔

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ قَالَ اُوْحِيَ اِلَيَّ وَلَمْ يُوْحَ اِلَيْهِ شَيْءٌ وَّمَنْ قَالَ سَاُنْزِلُ مِثْلَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ ۭ وَلَوْ تَرٰٓى اِذِ الظّٰلِمُوْنَ فِيْ غَمَرٰتِ الْمَوْتِ وَالْمَلٰۗىِٕكَةُ بَاسِطُوْٓا اَيْدِيْهِمْ ۚ اَخْرِجُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ۭ اَلْيَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُوْنِ بِمَا كُنْتُمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ غَيْرَ الْحَقِّ وَكُنْتُمْ عَنْ اٰيٰتِهٖ تَسْتَكْبِرُوْنَ ۝ وَلَقَدْ جِئْتُمُوْنَا فُرَادٰى كَمَا خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّتَرَكْتُمْ مَّا

خَلَقْنٰكُمْ وَرَآءَ ظُهُوْرِكُمْ ۚ وَمَا نَرٰى مَعَكُمْ شُفَعَآءَكُمُ الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ اَنَّهُمْ فِيْكُمْ شُرَكٰٓؤُا ۚ لَقَدْ تَّقَطَّعَ بَيْنَكُمْ وَضَلَّ عَنْكُمْ مَّا كُنْتُمْ تَزْعُمُوْنَ (۹۳-۹۴)

مشرکین مکہ کی ہفوات کا جواب

'وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا' اہل کتاب کے مفسدین کے بعد مشرکین مکہ کے لیڈروں کی طرف توجہ فرمائی اور جو ہفوات وہ قرآن کی نسبت بکتے تھے ان کا مختصراً حوالہ دینے کے بعد ان کے انجام کی طرف ان کو توجہ دلائی۔ ان کی باتیں چونکہ بالکل لایعنی محض ان کے کبر و غرور کا مظاہرہ تھیں اس وجہ سے ان باتوں کے جواب کے بجائے اصل ضرب ان کے کبر و غرور پر لگائی۔ ان کے ذکر کا آغاز ان کے سب سے بڑے ظلم یعنی شرک کے ذکر سے فرمایا، شرک کی نسبت ہم دوسرے مقام میں واضح کر چکے ہیں کہ اس کا ارتکاب کر کے انسان اپنے رب کا بھی سب سے بڑا حق تلف کرتا ہے اور خود اپنے نفس کی بھی سب سے بڑی توہین کرتا ہے۔ اس وجہ سے یہ سب سے بڑا ظلم ہے۔ پھر مزید یہ کہ اللہ کے اوپر یہ جھوٹا افترا ہے اس لیے کہ مشرک محض اپنے جی سے کسی چیز کو خدا کا شریک ٹھہراتا ہے اور دعویٰ یہ کرتا ہے کہ خدا نے اس کو اپنا شریک قرار دیا ہے حالانکہ اس دعوے کی اس کے پاس کوئی دلیل نہیں ہوتی۔

قریش کے لیڈروں کی ایک دھونس

'اَوْ قَالَ اُوْحِيَ اِلَيَّ وَلَمْ يُوْحَ اِلَيْهِ شَيْءٌ وَّمَنْ قَالَ سَاُنْزِلُ مِثْلَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ' اس افترا پر مزید افترا یہ کہ قریش کے بعض اکابر یہ کہتے کہ جس وحی کا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) دعویٰ کرتے ہیں اس طرح کی وحی تو ان پر بھی آتی ہے اگر وہ چاہیں تو اسی طرح کا کلام وہ بھی پیش کر سکتے ہیں اس سے ان کا مقصود محض اس اثر کو اپنے عوام کے دلوں سے زائل کرنا ہوتا جو ان پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اس بات سے پڑتا کہ جو کلام آپ پیش کر رہے ہیں وہ آپ کا اپنا کلام نہیں ہے بلکہ یہ اللہ کی وحی ہے جو وہ اپنے ایک فرشتے کے ذریعے سے آپ پر نازل فرماتا ہے۔ ان مفتریوں نے جواب میں یہ کہنا شروع کر دیا کہ یہ کوئی ایسی چیز نہیں جس کا تجربہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہی کو ہوتا ہو، اس طرح کی وحی ہم پر بھی آتی ہے۔ ہم بھی چاہیں تو اپنی وحی پیش کر سکتے ہیں لیکن ہم چونکہ اس طرح کی چیزوں کو کوئی اہمیت نہیں دیتے اس وجہ سے کوئی دعویٰ لے کر نہیں اٹھے۔ دوسری جگہ ان کی یہی بات یوں نقل ہوئی ہے۔ 'وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا قَالُوْا قَدْ سَمِعْنَا لَوْ نَشَآءُ لَقُلْنَا مِثْلَ هٰذَآ ۙ اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ' ۳۱ انفال (اور جب ان کو ہماری آیتیں پڑھ کر سنائی جاتی ہیں، کہتے ہیں بس کرو، سن لیا، اگر ہم چاہتے تو ہم بھی اسی طرح کا کلام پیش کر دیتے، یہ ہے کیا، یہ تو بس اگلوں کا فسانہ ہے) یہ عام قاعدہ ہے کہ جب کوئی صداقت ظاہر ہوتی ہے تو جن لوگوں کے پندار پر اس کی زد پڑتی ہے اور وہ اپنے آپ کو اس کے مقابل میں بے بس محسوس کرتے ہیں تو اسی طرح کی دھونس سے وہ اپنا بھرم قائم رکھنے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ ان کے دام فریب میں پھنسے ہوئے عوام ان کی صلاحیتوں سے مایوس ہو کر اس صداقت کو اختیار نہ کر لیں۔ لیکن اس قسم کی نمائشی اور ادعائی شہ زوری اصل حقیقت کے مقابل میں کیا کام دے سکتی ہے اور کتنے دن کام دے

سکتی ہے۔ بالآخر ان زبان کے سورماؤں کو میدان چھوڑ کے بھاگنا پڑتا ہے۔

رعونت کی پاداش میں ذلت کا عذاب

'وَلَوْ تَرٰٓى اِذِ الظّٰلِمُوْنَ فِىْ غَمَرٰتِ الْمَوْتِ الاٰیۃ' شرط کا جواب، اس طرح کے مواقع میں حذف ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کے حذف سے اس کی ہولناکی کی جو تصویر چشم تصور کے سامنے آتی ہے وہ اس کے اظہار کی صورت میں نہیں آسکتی۔ اوپر ہم اشارہ کر چکے ہیں کہ قرآن کے متعلق یہ باتیں قریش کے متمردین کہتے تھے۔ فرمایا کہ آج یہ لوگ اللہ کی کتاب کے باب میں اس رعونت کا اظہار کر رہے ہیں لیکن وہ وقت بھی آنے والا ہے جب یہ موت کی سکرات میں گرفتار ہوں گے اور فرشتے ہاتھ بڑھا بڑھا کر ان سے مطالبہ کر رہے ہوں گے کہ لاؤ، اپنی جانیں حوالہ کرو، اب وقت آگیا کہ تم کو تمھارے افترا اور آیاتِ الٰہی سے تمھارے متکبرانہ اعراض کی پاداش میں تم کو ذلت کا عذاب چکھایا جائے۔ ذلت کا عذاب اس لیے کہ انھوں نے اللہ کے رسول اور اس کی کتاب کے مقابل میں رعونت اور تکبر کا اظہار کیا۔ تَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ غَيْرَ الْحَقِّ سے ان کے قول 'اوحی الی' اور ان کے شرک کی طرف اشارہ ہے۔ كُنْتُمْ عَنْ اٰيٰتِهٖ تَسْتَكْبِرُوْنَ میں استکبار کا لفظ اعراض کے مفہوم پر بھی مشتمل ہے اس وجہ سے یہاں اس کا صلہ 'عن' کے ساتھ آیا ہے۔ اللہ کی کتاب سے اعراض کے مختلف اسباب ہو سکتے ہیں، سب سے زیادہ مہلک اعراض وہ ہے جو غرور اور رعونت کے سبب سے ہو۔ یہاں اسی اعراض کا ذکر ہے اور یہ ابلیس کی خاص وراثت ہے۔ قریش کے لیڈروں پر یہ بات بڑی شاق تھی کہ خدا کی طرف سے کوئی نعمت یا عزت ان کے سوا کسی اور کو حاصل ہو۔ اسی وجہ سے وہ کہتے تھے کہ اگر خدا کسی کو اپنا رسول بنانے والا ہوتا تو مکہ یا طائف کے کسی سردار کو بناتا۔ اسی غرور کا مظاہرہ ان کی ان باتوں سے بھی ہوا جو اوپر نقل ہوئی ہیں۔

'وَلَقَدْ جِئْتُمُوْنَا فُرَادٰى الاٰیۃ' یہاں غائب کو حاضر کے اسلوب میں کر دیا ہے تاکہ 'وَلَوْ تَرٰٓى' میں ان کے جس انجام بد کا حوالہ دیا ہے اس کی ہولناکی نگاہوں کے سامنے آجائے۔ گویا قیامت آگئی اور ان سے خطاب کر کے کہا جا رہا ہے کہ دیکھ لو جس طرح تم دنیا میں بے سروسامان گئے تھے اسی طرح بے سروسامان آج ہمارے حضور میں حاضر ہو گئے، نہ تمھارے ساتھ وہ مال و متاع اور وہ لاؤ لشکر ہے جس کے بل پر تم اتراتے تھے اور نہ وہ شرکاء و شفعاء ہی ہیں جن کو تم ہمارا ساجھی گمان کیے بیٹھے تھے اور جن سے یہ توقع رکھتے تھے کہ وہ ہمارے مقابل میں تمھارے کام آئیں گے۔ 'خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ' میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ انسان جب دنیا میں آتا ہے تو ایک مضغۂ گوشت اور عملاً تمام صلاحیتوں سے خالی ہوتا ہے، پھر اللہ تعالیٰ اس کی تمام صلاحیتوں کو پروان چڑھاتا ہے اور اس کو ان وسائل و ذرائع اور ان اموال و املاک کا مالک بناتا ہے جو اس کے لیے مقدر ہوتے ہیں تاکہ وہ دیکھے کہ خدا کی یہ نعمتیں پا کر وہ اس کا شکر گزار بندہ بنتا ہے یا اکڑنے والا اور اترانے والا بن جاتا ہے۔ پھر ایک دن آتا ہے کہ وہ اسی طرح خالی ہاتھ خدا کے حضور میں حاضر کیا جاتا ہے، ان چیزوں میں سے کوئی ایک چیز بھی اس کے ساتھ نہیں جاتی جن کے ب

پردہ یہاں اکڑتا تھا۔

لَقَدْ تَّقَطَّعَ بَيْنَكُمْ میں فاعل میرے نزدیک حذف ہے یعنی لَقَدْ تَقَطَّعَ الْحَبْلُ بَيْنَكُمْ وَضَلَّ عَنْكُمْ مَّا كُنْتُمْ تَزْعُمُوْنَ۔ اس میں اشارہ شرکاء و شفعا کی طرف ہے یعنی یہ سب ہوا ہو جائیں گے۔

۱۵۔ آگے کا مضمون ـــــ آیات ۹۵-۱۰۸

اوپر کا مجموعۂ آیات توحید کے مضمون پر ختم ہوا تھا۔ اسی مضمون کے تعلق سے آگے توحید کے دلائل کی مزید وضاحت ہوئی۔ یہ دلائل توحید کے آفاقی دلائل ہیں جو بیان اس طرح ہوئے ہیں کہ ان سے معاد اور رسالت پر بھی روشنی پڑ رہی ہے۔ گویا وہ پورا مضمون ایک نئے اسلوب سے سامنے آگیا ہے جو اس سورہ میں زیر بحث ہے نیز کائنات کی نشانیوں پر غور کرنے کے لیے اس صحیح نقطۂ نظر کی طرف بھی اس سے رہنمائی ہو رہی ہے جو اوپر حجت ابراہیمیؑ کے سلسلہ میں واضح ہوا ہے۔ پھر اسی تعلق سے قریش کو مخاطب کر کے ان کو مناسب حال تنبیہ کی گئی ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے آپ کو تسلی دی گئی ہے، مسلمانوں کو مخاطب کر کے مقتضائے وقت کے مناسب ہدایات دی گئی ہیں۔ غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ شروع سے سورہ اسی انداز پر چل رہی ہے۔ مرکزی مضمون، توحید، معاد، رسالت، بار بار مختلف اسلوبوں سے سامنے آتا ہے اور بار بار مخاطبین کے اعتراضات اور ان کے رویے کے تعلق سے کلام تردید یا توضیح یا تسکین یا موعظت کی طرف مڑ جاتا ہے لیکن سررشتۂ کلام کہیں ہاتھ سے جانے نہیں پاتا۔ اس روشنی میں آگے کی آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۹۵-۱۰۸

اِنَّ اللّٰهَ فَالِقُ الْحَبِّ وَالنَّوٰى ۭ يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَمُخْرِجُ الْمَيِّتِ مِنَ الْحَيِّ ۭ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ ۹۵ فَالِقُ الْاِصْبَاحِ ۚ وَجَعَلَ الَّيْلَ سَكَنًا وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ حُسْبَانًا ۭ ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ ۹۶ وَهُوَ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ النُّجُوْمَ لِتَهْتَدُوْا بِهَا فِيْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ ۭ قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ۹۷ وَهُوَ الَّذِيْٓ اَنْشَاَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ فَمُسْتَقَرٌّ وَّمُسْتَوْدَعٌ ۭ قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّفْقَهُوْنَ ۹۸ وَهُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ مِنَ

السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجْنَا بِهٖ نَبَاتَ كُلِّ شَیْءٍ فَاَخْرَجْنَا مِنْهُ خَضِرًا
نُّخْرِجُ مِنْهُ حَبًّا مُّتَرَاكِبًا ۚ وَمِنَ النَّخْلِ مِنْ طَلْعِهَا قِنْوَانٌ دَانِيَةٌ
وَّجَنّٰتٍ مِّنْ اَعْنَابٍ وَّالزَّيْتُوْنَ وَالرُّمَّانَ مُشْتَبِهًا وَّغَيْرَ مُتَشَابِهٍ ۗ
اُنْظُرُوْٓا اِلٰى ثَمَرِهٖٓ اِذَآ اَثْمَرَ وَيَنْعِهٖ ۗ اِنَّ فِیْ ذٰلِكُمْ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ
يُّؤْمِنُوْنَ ﴿٩٩﴾ وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ الْجِنَّ وَخَلَقَهُمْ وَخَرَقُوْا لَهٗ
بَنِيْنَ وَبَنٰتٍۢ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۗ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يَصِفُوْنَ ﴿١٠٠﴾ بَدِيْعُ ع ١٢ ١٨
السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۗ اَنّٰى يَكُوْنُ لَهٗ وَلَدٌ وَّلَمْ تَكُنْ لَّهٗ صَاحِبَةٌ ۗ
وَخَلَقَ كُلَّ شَیْءٍ ۚ وَهُوَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِيْمٌ ﴿١٠١﴾ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ ۚ
لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ خَالِقُ كُلِّ شَیْءٍ فَاعْبُدُوْهُ ۚ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ
وَّكِيْلٌ ﴿١٠٢﴾ لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ ۚ وَهُوَ
اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ ﴿١٠٣﴾ قَدْ جَآءَكُمْ بَصَآئِرُ مِنْ رَّبِّكُمْ ۚ فَمَنْ اَبْصَرَ
فَلِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ عَمِیَ فَعَلَيْهَا ۗ وَمَآ اَنَا عَلَيْكُمْ بِحَفِيْظٍ ﴿١٠٤﴾ وَكَذٰلِكَ
نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ وَلِيَقُوْلُوْا دَرَسْتَ وَلِنُبَيِّنَهٗ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ﴿١٠٥﴾
اِتَّبِعْ مَآ اُوْحِیَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ وَاَعْرِضْ عَنِ
الْمُشْرِكِيْنَ ﴿١٠٦﴾ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَآ اَشْرَكُوْا ۗ وَمَا جَعَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ
حَفِيْظًا ۚ وَمَآ اَنْتَ عَلَيْهِمْ بِوَكِيْلٍ ﴿١٠٧﴾ وَلَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ
مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَيَسُبُّوا اللّٰهَ عَدْوًۢا بِغَيْرِ عِلْمٍ ۗ كَذٰلِكَ زَيَّنَّا لِكُلِّ اُمَّةٍ
عَمَلَهُمْ ۖ ثُمَّ اِلٰى رَبِّهِمْ مَّرْجِعُهُمْ فَيُنَبِّئُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿١٠٨﴾

ترجمۂ آیات ۹۵-۱۰۸

بے شک اللہ ہی دانے اور گٹھلیوں کو پھاڑنے والا ہے۔ وہ برآمد کرتا ہے زندہ کو مردہ سے اور وہی برآمد کرنے والا ہے مردہ کو زندہ سے، بس وہی اللہ ہے تو تم کہاں اوندھے ہوئے جاتے ہو! وہی برآمد کرنے والا ہے صبح کا اور اس نے رات سکون کی چیز بنائی اور سورج اور چاند اس نے ایک حساب سے رکھے۔ یہ خدائے عزیز و علیم کی منصوبہ بندی ہے اور وہی ہے جس نے تمھارے لیے ستارے بنائے تاکہ تم ان سے خشکی اور تری کی تاریکیوں میں رہنمائی حاصل کرو۔ ہم نے اپنی نشانیاں ان لوگوں کے لیے تفصیل سے بیان کر دی ہیں جو جاننا چاہیں اور وہی ہے جس نے تم کو پیدا کیا ایک ہی جان سے پھر ہر ایک کے لیے ایک مستقر اور ایک مدفن ہے، ہم نے اپنی نشانیاں ان لوگوں کے لیے تفصیل سے بیان کر دی ہیں جو سمجھیں۔ اور وہی ہے جس نے آسمان سے پانی برسایا، پھر ہم نے اس سے ہر چیز کے انکھوے نکالے، پھر ہم نے اس سے سرسبز شاخیں ابھاریں جن سے ہم تہ بہ تہ دانے پیدا کر دیتے ہیں اور کھجور کے گابھے سے لٹکتے ہوئے گچھے اور انگوروں کے باغ اور زیتون اور انار، باہم گرملتے جلتے بھی اور ایک دوسرے سے مختلف بھی۔ ہر ایک کے پھل کو دیکھو جب وہ پھلتا ہے اور اس کے پکنے کو دیکھو جب وہ پکتا ہے۔ بے شک ان کے اندر نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو ایمان لانا چاہیں۔ ۹۵-۹۹

اور انھوں نے جنوں میں سے خدا کے شریک ٹھہرائے حالانکہ خدا ہی نے ان کو پیدا کیا اور اس کے لیے بے سند بیٹے اور بیٹیاں تراشیں، وہ پاک اور برتر ہے ان چیزوں سے جو یہ بیان کرتے ہیں۔ وہ آسمانوں اور زمین کا موجد ہے۔ اس کے اولاد کہاں سے آئی جب کہ اس کی کوئی بیوی نہیں اور اس نے ہر چیز پیدا کی اور وہ ہر چیز سے باخبر ہے۔ وہی

اللہ تمھارا رب ہے۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہی ہر چیز کا خالق ہے تو اسی کی بندگی کرو اور وہی ہر چیز پر نگران ہے۔ اس کو نگاہیں نہیں پاتیں لیکن وہ نگاہوں کو پالیتا ہے، وہ بڑا باریک بین اور بڑا باخبر ہے۔ ۱۰۰-۱۰۳

اب تمھارے پاس تمھارے رب کی طرف سے بصیرت بخش آیتیں آچکی ہیں تو جو بصیرت سے کام لے گا اپنے ہی کو نفع پہنچائے گا اور جو اندھا بنا رہے گا اس کا وبال اسی پر آئے گا، اور میں تم پر کوئی نگران مقرر نہیں ہوں۔ اور اسی طرح ہم اپنی دلیلیں مختلف اسلوبوں سے پیش کرتے ہیں تاکہ ان پر حجت قائم ہو اور تاکہ وہ بول اٹھیں کہ تم نے اچھی طرح پڑھ کر سنا دیا اور تاکہ ہم اس کو اچھی طرح واضح کر دیں ان لوگوں کے لیے جو جاننا چاہیں۔ ۱۰۴-۱۰۵

تم بس اس چیز کی پیروی کرو جو تمھارے رب کی طرف سے تم پر وحی کی جا رہی ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، اور مشرکوں سے اعراض کرو۔ اور اگر اللہ چاہتا تو یہ شرک نہ کر پاتے اور ہم نے تم کو ان پر نگران نہیں مقرر کیا ہے اور نہ تم ان کے ضامن ہو۔ ۱۰۶-۱۰۷

اور اللہ کے سوا یہ جن کو پکارتے ہیں ان کو گالی نہ دیجیو کہ وہ تجاوز کر کے بے خبرانہ اللہ کو گالیاں دینے لگیں۔ اسی طرح ہم نے ہر گروہ کی نگاہوں میں اس کا عمل کھبا رکھا ہے۔ پھر ان کے رب ہی کی طرف ان سب کا پلٹنا ہے تو وہ انھیں اس سے آگاہ کرے گا جو وہ کرتے رہے ہیں۔ ۱۰۸

۱۶۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

اِنَّ اللّٰهَ فَالِقُ الْحَبِّ وَالنَّوٰى ؕ يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَمُخْرِجُ الْمَيِّتِ مِنَ الْحَيِّ ؕ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ ۝ فَالِقُ الْاِصْبَاحِ ۚ وَجَعَلَ الَّيْلَ سَكَنًا وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ حُسْبَانًا ؕ ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ

الْعَلِيْمِ ۝ وَهُوَ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ النُّجُوْمَ لِتَهْتَدُوْا بِهَا فِيْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ ۭ قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ (۹۵-۹۷)

ایک ایک ذرہ توحید کا شاہد ہے

اِنَّ اللّٰهَ فَالِقُ الْحَبِّ وَالنَّوٰى، حَبّ، اور نوٰی، دانے اور گٹھلی کو کہتے ہیں۔ پہلے چھوٹی چیزوں سے آیات الٰہی کے بیان کا آغاز کیا ہے، پھر کائنات کی بڑی چیزوں کی طرف توجہ دلائی ہے۔ فرمایا کہ ایک چھوٹے سے دانے اور چھوٹی سی گٹھلی پر بھی خدا کے سوا کسی اور کو یہ اختیار حاصل نہیں کہ ان کو پھاڑ کر ان کے اندر سے انکھوے نکالے، پھر ان کو پودے اور درخت بنا دے۔ یہ خدا ہی کی قدرت اور اس کی حکمت ہے کہ وہ ایک ایک بیج اور ایک ایک گٹھلی کے اندر صلاحیتیں ودیعت فرماتا ہے، پھر ان صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کے لیے زمین، آسمان، ابر، ہوا، گرمی اور سردی، خزاں اور بہار سب کو امر فرماتا ہے کہ سب مل کر اس کی پرورش میں اپنا اپنا حصہ ادا کریں۔ گویا اس زمین میں نشوونما پانے والا ایک ایک دانہ اپنے وجود سے اس بات کی شہادت دے رہا ہے کہ اسی کے تصرف سے وہ وجود میں آیا ہے جس کے تصرف میں یہ پوری کائنات ہے۔ اگر اس کائنات کی خدائی مختلف خداؤں اور دیوتاؤں میں بٹی ہوئی ہوتی اور وہ سب اپنے اپنے دائروں اور علاقوں میں خود مختار ہوتے تو اس دنیا کا نظام چلنا تو الگ رہا رائی کا ایک دانہ بھی اپنی صلاحیتیں اجاگر نہیں کر سکتا تھا۔

خدا کے قانون سے کوئی باہر نہیں

يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَمُخْرِجُ الْمَيِّتِ مِنَ الْحَيِّ بعینہٖ یہی ٹکڑا، معمولی فرق کے ساتھ، آل عمران کی آیت ۲۷ میں گزر چکا ہے۔ وہاں ہم بقدر ضرورت اس کی شرح کر چکے ہیں۔ یہ بے جان چیزوں سے زندگی کے اظہار اور پھر زندگی کے اوپر موت اور فنا کے طاری ہونے کی ایک جامع تعبیر ہے جس کا مشاہدہ ہم اس کائنات کے ہر گوشے میں برابر کر رہے ہیں۔ آم کی بے جان گٹھلی اور گیہوں کے بے جان دانہ سے ہرا بھرا درخت اور لہلہاتا ہوا پودا پیدا ہو جاتا ہے اور پھر اسی سبز و شاداب درخت اور لہلہاتے ہوئے پودے پر زردی، خشکی اور مردنی طاری ہونی شروع ہوتی ہے یہاں تک کہ ایک دن وہ ختم ہو جاتا ہے یہی مشاہدہ ہم انسانوں اور حیوانوں میں کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ قوموں اور ملتوں کے اندر بھی موت اور زندگی، عروج اور زوال کی یہی داستان برابر دہرائی جا رہی ہے۔ ایک قوم پردۂ عدم سے نکلتی ہے ساری دنیا پر چھا جاتی ہے اور پھر وہی قوم ایک دن آتا ہے کہ پردۂ عدم میں جا چھپتی ہے۔ موت اور زندگی کے اس قانون سے کسی کے لیے مفر نہیں۔ اگر خدا کے سوا کسی اور کا بھی اس کائنات میں مالکانہ و خود مختارانہ تصرف ہے تو کسی ایک ہی گوشہ میں وہ اس قانون کو باطل کیوں نہیں کر دیتا اور اگر خدا سرے سے ہے ہی نہیں بلکہ یہ سب کچھ مجرد مادے یا کسی اندھی بہری طاقت کا بروز ہے تو اس کا تقاضا تو یہ تھا کہ یہ بروز قائم و دائم رہے، نہ اس میں کبھی انقطاع ہو، نہ اس کے رخ میں کوئی تبدیلی واقع ہو، نہ اس پر کوئی تغیر طاری ہو۔

زبان کا ایک نکتہ

یہاں زبان کا ایک نکتہ بھی قابل لحاظ ہے۔ پہلے تو فرمایا يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ لیکن دوسرے

ٹکڑے میں اسلوب بدل کر فرمایا مُخْرِجُ الْمَيِّتِ مِنَ الْحَيِّ مردہ سے زندہ کو نکالنے کے لیے فعل استعمال فرمایا جو صرف تصویر حال کا فائدہ دیتا ہے لیکن زندہ سے مردہ کو برآمد کرنے کے لیے فاعل کا صیغہ استعمال فرمایا جس کے اندر عزم اور فیصلہ کا مفہوم بھی مضمر ہوتا ہے۔ اس اختلاف کی وجہ ہماری سمجھ میں یہ آئی ہے کہ زندگی حاصل ہو جانے کے بعد کوئی جاندار بھی اپنی زندگی موت کے حوالے کرنے پر راضی نہیں ہوتا لیکن قدرت کا قانون ایسا اٹل ہے کہ وہ بہرحال اس کو موت میں تبدیل کر ہی کے رہتا ہے۔ یہ نہایت واضح ثبوت ہے اس بات کا کہ خدا کے سوا اس کائنات میں کسی کا کوئی دخل نہیں۔ اگر ہے کسی کا تو وہ اپنی محبوب زندگی کو موت کے پنجہ سے کیوں نہیں بچا لیتا؟ یہی مضمون سورۂ واقعہ میں یوں بیان ہوا ہے فَلَوْلَآ اِنْ كُنْتُمْ غَيْرَ مَدِيْنِيْنَ تَرْجِعُوْنَهَآ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۔۔۔۔ اگر تم کسی کے محکوم نہیں ہو تو اپنی حلق میں آئی ہوئی جان کو واپس کیوں نہیں لوٹا لیتے، اگر تم سچے ہو)۔

عام طور پر لوگوں نے اس آیت کو انڈے اور مرغی اور مرغی اور انڈے کی حکایت تک محدود رکھا ہے لیکن اوپر کی تفصیل سے یہ بات واضح ہوئی کہ یہ تعبیر ہے قدرت کے ان قوانین کی جو اس نے بے جان چیزوں کے اندر زندگی کے اور جاندار چیزوں کے اندر موت کے ودیعت کیے ہیں، جن کو صرف قدرت ہی بروئے کار لاتی ہے اور جن کی گرفت سے کوئی آزاد نہیں ہے۔

ایک قدم صحیح دوسرا قدم غلط

ذٰلِكُمُ اللّٰهُ فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ آگے فرمایا ہے ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ (وہی اللہ تمہارا رب ہے) اگر اس جملے کی تفسیر اس دوسرے جملے کی روشنی میں کی جائے تو ماننا پڑے گا کہ یہاں خبر محذوف ہے اور اگر اسی کو پورا جملہ مانا جائے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ یہ سب اللہ ہی کا کرشمہ قدرت ہے تو تم کہاں اوندھے ہوئے جاتے ہو؟ یہ واضح رہے کہ اہل عرب اللہ کو نہ صرف مانتے تھے بلکہ ہر چیز کا خالق بھی اسی کو مانتے تھے لیکن اس کے ساتھ ساتھ شرک میں بھی مبتلا تھے اس لیے فرمایا کہ فکر سلیم کے لیے سیدھی راہ تو یہ ہے کہ جب یہ سارا تصرف اللہ ہی کا ہے تو بندہ صرف اسی کی عبادت و اطاعت کرے لیکن تمہاری عقل کہاں اوندھی ہوئی جاتی ہے کہ ایک قدم صحیح اٹھا کر پھر دوسرے رخ پر مڑ جاتے ہو اور پائی ہوئی حقیقت کو گم کر دیتے ہو۔

ایک اشارہ دلیل معاد کی سمت میں

یہ آیت اگرچہ واضح طور پر تو بیان توحید ہی کے سیاق میں ہے لیکن اس میں ایک لطیف اشارہ معاد کی طرف بھی ہو گیا۔ اس لیے کہ جب ہم ہر قدم پر مردہ سے زندہ کو ظاہر ہوتے دیکھتے ہیں تو اس بات پر تعجب کی کیا وجہ ہے کہ مر جانے اور گل سڑ جانے کے بعد خدا ہمیں دوبارہ اٹھا کھڑا کرے گا؟ گٹھلی اور دانہ زمین میں سڑ گل کر اگر از سر نو زندہ ہو سکتے ہیں تو ہم زمین میں دفن ہو جانے کے بعد آخر اللہ کے حکم سے دوبارہ کیوں نہیں زندہ ہو سکتے؟

فَالِقُ الْاِصْبَاحِ ۚ وَجَعَلَ الَّيْلَ سَكَنًا وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ حُسْبَانًا ۭ ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ (٩٦)

فَالِقُ الْاِصْبَاحِ ۚ وَجَعَلَ الَّيْلَ سَكَنًا یعنی وہی خدا جس کی شانیں زمین کے اندر دفن ہونے والے دانہ اور گٹھلی کے اندر یوں نمایاں ہوتی ہیں ذرا نگاہ اُٹھا کر اس کی شانیں آسمان میں بھی دیکھو۔ وہ جس طرح گٹھلی کو پھاڑ کر اس کے اندر سے درخت پیدا کر دیتا ہے اسی طرح پردۂ شب کو چاک کر کے اس کے اندر سے صبح نمودار کر دیتا ہے۔ پھر فرمایا کہ اس نے شب کو تمھارے لیے سکون بخشنے والی اور تمھاری کلفت کو دور کرنے والی بنایا، تم اس میں دن کی ماندگی دور کرتے ہو اور تمھارے قویٰ اور اعصاب اس میں از سرِ نو میدانِ عمل میں اترنے کے لیے تازہ دم ہوتے ہیں۔ اس سے یہ اشارہ خود بخود نکل آیا کہ وہ رات کے بعد صبح اس لیے پیدا کرتا ہے کہ تم اس میں اپنی طلب و جستجو کی سرگرمیوں میں مصروف ہو سکو اور اپنی معاش کے لیے جد و جہد کر سکو۔ اسی مضمون کو دوسری جگہ یوں بیان فرمایا وَجَعَلْنَا نَوْمَكُمْ سُبَاتًا ۚ وَجَعَلْنَا الَّيْلَ لِبَاسًا ۚ وَجَعَلْنَا النَّهَارَ مَعَاشًا (سورہ نبا ۹ - ۱۱) (اور ہم نے تمھاری نیند کو تمھارے لیے رافع کلفت بنایا، شب کو تمھارے لیے پردہ پوش بنایا اور دن کو حصولِ معاش کی سرگرمیوں کے لیے بنایا) مطلب یہ ہے کہ صبح اور شام، دن اور رات کی اس نوعیت پر غور کرو، تمھاری عقل یہ بات باور کرتی ہے کہ صبح کا لانے والا کوئی اور ہے، شام کا لانے والا کوئی اور، دن کا پیدا کرنے والا کوئی اور ہے، رات کا پیدا کرنے والا کوئی اور، یا یہ بات قبول کرتی ہے کہ صبح اور شام، رات اور دن سب اللہ ہی کے حکم سے آتے جاتے ہیں۔ اگر دن کا خالق کوئی اور، رات کا خالق کوئی اور ہوتا تو ان دونوں میں یہ موافقت و سازگاری کون پیدا کرتا کہ رات تمھارے لیے راحت کا بستر بچھاتی اور میٹھی نیند کے لیے سکون فراہم کرتی ہے اور دن تمھارے لیے سرگرمیوں کے میدان گرم کرتا اور معاش و معیشت کی راہیں کھولتا ہے۔

زمین کے بعد ایک نظر آسمان کی طرف

وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ حُسْبَانًا ۚ دن اور رات کے بعد اب یہ رات اور دن کے اندر ظاہر ہونے والی دو بڑی نشانیوں سورج اور چاند کو لیا۔ فرمایا کہ ان کو دیکھو، ان کے لیے قدرت کا ٹھہرایا ہوا ایک ضابطہ اور ایک نظام الاوقات ہے، مجال نہیں ہے کہ سرِ مُو اس سے تجاوز کر سکیں۔ انھی سے دن مہینے، سال معین ہوتے ہیں، انھی سے موسموں کا تغیر وجود میں آتا ہے۔ پھر یہ ہیں تو آسمان میں لیکن پوری وفاداری اور پابندی کے ساتھ، بلا کسی تمنائے ستائش اور پروائے صلہ کے رات دن خدمت میں سرگرم ہیں زمین والوں کی۔

ایک بے مثال منصوبہ بندی

ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ اوپر کی بیان کردہ نشانیوں سے جو حقیقت سامنے آتی ہے، یہ اسی کا بیان ہے اور انداز بیان ایسا ہے جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ ہر اس شخص کے دل کی آواز ہے جو اس نظامِ کائنات پر عقلِ سلیم اور قلبِ سلیم سے غور کرتا ہے۔ جس کی عقلِ سلیم ہے وہ جب اس نظام اور اس کی بے پایاں برکات پر غور کرتا ہے تو بے تحاشا اس کی زبان سے یہ گواہی نکلتی ہے کہ یہ ساری منصوبہ بندی خدائے عزیز و علیم ہی کی ہے۔

کائنات میں خدا کی شانیں

کائنات میں توحید کے شواہد

اس چھوٹے سے فقرے کے اندر کئی حقیقتیں مضمر ہیں۔

ایک یہ کہ یہ سورج اور چاند خدائی میں کوئی دخل نہیں رکھتے بلکہ اس کارخانۂ کائنات میں ان کی حیثیت صرف کل پرزوں کی ہے جن کو ایک عزیز و علیم نے ان کے مقام میں فٹ کیا ہے اور یہ اپنی مفوضہ خدمت پوری پابندی کے ساتھ انجام دے رہے ہیں۔

دوسری یہ کہ یہ کارخانہ متضاد قوتوں اور مختلف دیوتاؤں کی کوئی رزمگاہ نہیں ہے بلکہ اس کے اضداد کے اندر حیرت انگیز سازگاری ہے اور ان کی یہ باہمی سازگاری اس بات کی شاہد ہے کہ ایک ہی خدائے قاہر و قیوم اور ایک ہی رب عزیز و علیم کا ارادہ اور اس کی مشیت اس پر کارفرما ہے اور اس کی ہر حرکت اور اس کا ہر سکون اسی کی مشیت کے تابع ہے۔

تیسری یہ کہ یہ کارخانہ کسی کھلنڈرے کا کھیل تماشہ نہیں ہے بلکہ اس کے ہر گوشے سے اس کے صانع کی قدرت، حکمت اور اس کے علم کی شہادت مل رہی ہے جو اس بات کا ثبوت فراہم کر رہی ہے کہ اس کے پیچھے ایک عظیم غایت و مقصد ہے جس کا ظہور میں آنا لابدی ہے۔ اس وجہ سے ضروری ہے کہ اس کے بعد ایک روز جزا و سزا آئے جس میں اس کی حکمت واضح ہو۔

چوتھی یہ کہ یہ دنیا کسی کباڑیے کی دکان یا کوئی مال گودام نہیں ہے جس میں کسی چیز کا بھی کوئی قرینہ نہ ہو بلکہ اس میں نہایت حیرت انگیز پلاننگ ہے، ہر چیز کے لیے اس کی متعین جگہ ہے، ہر حرکت اور گردش کے لیے معین محور و مدار ہیں، ہر عمل کے ظہور کے لیے لگے بندھے ضابطے قاعدے ہیں، ہر آزادی اور ہر پابندی کے لیے معلوم و معروف حدود و قیود ہیں۔ اس سے صاف یہ اشارہ نکلتا ہے کہ اس جہان کے خالق کی مرضی انسانوں کے لیے بھی یہی ہے کہ وہ شتر بے مہار کی زندگی نہ گزاریں بلکہ اس کی ہدایات اور اس کے احکام کے تحت زندگی بسر کریں تاکہ ان کی زندگی اس پورے کارخانہ سے ہم آہنگ ہو۔ یہی راہ فلاح و سعادت کی راہ ہے۔ سورۂ رحمان میں ہم آیت اَلشَّمْسُ وَالْقَمَرُ بِحُسْبَانٍ کے تحت اس نکتہ کی مزید وضاحت کریں گے۔ وہاں قرآن نے اسی آفاقی شہادت سے رسالت کی ضرورت پر استشہاد کیا ہے۔

لفظ 'تقدیر' کا مفہوم

اس آیت میں 'تقدیر' کا لفظ وہی مفہوم رکھتا ہے جو پلاننگ (PLANNING) کا مفہوم ہے۔ عزیز کی صفت خدا کی بے نہایت قدرت اور سب پر اس کی بالاتری کو اور 'علیم' کی صفت اس کے محیط کل علم کے ساتھ ساتھ اس کی بے نہایت حکمت کو ظاہر کرتی ہے۔ اس لیے کہ علم، حکمت کو بھی مقتضی ہے۔ اس سے یہ بات بھی نکلتی ہے کہ خدا اس نظام کائنات کا کوئی جزو نہیں ہے بلکہ وہ سب سے بالاتر ہے۔ اس کی قدرت، اس کا علم اور اس کی حکمت سب کو اپنے احاطہ میں لیے ہوئے ہے۔

وَهُوَ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ النُّجُوْمَ لِتَهْتَدُوْا بِهَا فِیْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰیٰتِ لِقَوْمٍ

یَعْلَمُوْنَ (۹۷)

ستاروں کی خدمت گزاری

سورج اور چاند کے بعد ستاروں کی طرف متوجہ کیا کہ دیکھ لو، یہ خود اپنی خدمت گزاری سے شہادت دے رہے ہیں کہ خالق نے ان کو تمہاری خدمت پر مقرر کیا ہے۔ جب تم خشکی اور تری کا سفر کرتے ہو تو سمندروں اور بیابانوں میں یہ روشنی کے میناروں اور برجیوں کی طرح تمہاری کشتیوں اور تمہارے قافلوں کو سمتیں اور راستے بتاتے ہیں۔ اب یہ کیسی بے وقوفی کی بات ہے کہ وہ خود تو اپنے عمل سے بتا رہے ہیں کہ تمہارے خالق نے ان کو تمہاری خدمت میں لگا رکھا ہے اور تم ان کو خدا کی خدائی میں شریک مان کر ان کے بت کھڑے کر کے ان کی پرستش شروع کر دو۔ پھر یہ دیکھو کہ یہ ہیں تو آسمان میں لیکن شمع برداری کی خدمت وہ تم زمین والوں کی انجام دے رہے ہیں، سو جو کہ زمین کا خدا الگ ہوتا اور آسمانوں کے دیوتا الگ ہوتے تو آسمان کے ستاروں کو کیا پڑی تھی کہ وہ زمین والوں کو رستہ بتانے کے لیے ساری رات دیدبانوں میں کھڑے کھڑے اپنی نیندیں خراب کرتے؟ یہ صورتِ حال تو صاف شہادت دے رہی ہے کہ زمین و آسمان سب پر ایک ہی خدا کی حکمرانی ہے اور اسی نے ان ستاروں کو تمہاری خدمت کے لیے مسخر کیا ہے تاکہ تم اپنے رب کے شکرگزار بنو اور اسی کی عبادت کرو۔

یہاں یہ بات ذہن میں رہے کہ عرب شعرا اپنے بیابانی سفروں کی جو داستان بیان کرتے ہیں اس میں ستاروں کا ذکر ان کی رہنمائی کے پہلو سے بھی کرتے ہیں اور رات کے مختلف حصوں کے اوقات بتانے کے لیے بھی انہی کا حوالہ دیتے ہیں۔ گویا وہ ان سے گھڑیوں کا کام بھی لیتے تھے اور رہنما برجیوں کا بھی۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ بعض ستاروں کی پرستش بھی کرتے تھے۔ 'شعریٰ' کا حوالہ تو قرآن میں بھی آیا ہے جو موسم بہار میں طلوع ہوتا تھا۔ اسی طرح دوسرے ستارے بھی جو نکھتروں سے تعلق رکھتے تھے، ان کے معبود تھے بعض سعد سمجھے جاتے تھے، بعض نحس۔

حقیقت کے طالبوں کے لیے ہر قدم پر نشانیاں موجود ہیں

قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰیٰتِ لِقَوْمٍ یَّعْلَمُوْنَ لفظ 'ایت' کے مختلف معانی پر ہم دوسرے مقام میں بحث کر چکے ہیں۔ یہاں یہ نشانی کے معنی میں ہے اور چونکہ ہر نشانی اس چیز کی دلیل ہوتی ہے جس کی وہ نشانی ہوتی ہے اس وجہ سے اس کے معنی دلائل کے ہوں گے اور چونکہ یہاں زیر بحث خدا اور اس کی توحید اور ضمناً معاد و رسالت ہے اس وجہ سے یہاں مراد انہی کے دلائل ہوں گے۔ چونکہ اللہ تعالیٰ کی ہر نشانی اپنے اندر گوناگون پہلو رکھتی ہے اس وجہ سے یہ تو بتا دیا ہے کہ ہم نے نشانیوں کی تفصیل کر دی ہے لیکن یہ نہیں واضح فرمایا کہ کس چیز کی نشانیاں واضح فرمائی ہیں۔ یہ چیز مخاطب کے فہم پر چھوڑ دی ہے کہ اس کے اندر علم کی طلب و جستجو ہو گی تو وہ ان میں اپنی ہر جستجو کا جواب پا جائے گا۔

یہاں لفظ 'آیات' کے استعمال میں ایک لطیف اشارہ بھی ہے۔ منکرین قریش کے متعلق اوپر بھی بیان ہو چکا ہے اور اس مجموعۂ آیات کے خاتمہ پر بھی ذکر آئے گا کہ وہ قرآن پر ایمان لانے کے لیے یہ شرط

ٹھہراتے کہ پیغمبر کوئی نشانی دکھائیں تو وہ ایمان لائیں گے۔ نشانی سے مراد وہ کوئی محسوس معجزہ لیتے تھے۔ ان کی اسی ذہنیت کو پیشِ نظر رکھ کر فرمایا کہ اگر نشانیوں کی طلب ہے تو عقل و دل کو مطمئن کرنے والی نشانیاں یہ ہم نے بیان کر دی ہیں لیکن یہ کارآمد ان کے لیے ہیں جو علم کے طالب ہیں جن کے اندر علم کی طلب نہیں ہے وہ دنیا جہان کے معجزے دیکھ کر بھی اندھے ہی بنے رہتے ہیں۔

فعل ارادہ فعل کے مفہوم میں

'لِقَوْمٍ يَعْلَمُوْنَ' ہم دوسری جگہ واضح کر چکے ہیں کہ فعل ارادۂ فعل کے لیے بھی آتا ہے اس وجہ سے 'لِقَوْمٍ يَعْلَمُوْنَ' کا مطلب یہ ہوگا کہ ان کے لیے جو جاننا چاہیں۔ یہ بات واضح رہے کہ ہم اپنی زبان میں بھی جب بولتے ہیں، اُن کے لیے جو مانیں، ان کے لیے جو سمجھیں، ان کے لیے جو غور کریں، تو فعل ارادۂ فعل ہی کے لیے استعمال کرتے ہیں۔

وَهُوَ الَّذِيْٓ اَنْشَاَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ فَمُسْتَقَرٌّ وَّمُسْتَوْدَعٌ ۭ قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّفْقَهُوْنَ (۹۸)

توحید کی دلیل خود انسان کی خلقت میں

خارجی عالم کی نشانیوں کی طرف توجہ دلانے کے بعد اب یہ انسان کی خود اس کی خلقت اور اس کے اردگرد جو سامانِ معاش و معیشت فراہم فرمایا ہے، اس کی طرف توجہ دلائی۔ فرمایا کہ وہی خدا ہے جس نے تمھیں ایک ہی جان سے پیدا کیا اور نسلِ انسانی کا ایک وسیع گھرانا آباد کر دیا۔ یہاں 'اَنْشَاَ' کا لفظ استعمال ہوا ہے جس کے معنی صرف پیدا کرنے کے نہیں ہیں بلکہ اس کے اندر نشوونما بخشنے، پروان چڑھانے اور فروغ دینے کا مفہوم بھی پایا جاتا ہے۔ 'ایک ہی جان' سے مراد آدم ہیں جن کو تمام آسمانی مذاہب میں نسلِ انسانی کی اصل کی حیثیت سے تسلیم کیا گیا ہے۔ اہلِ عرب بھی اس حقیقت کو تسلیم کرتے تھے۔ فرمایا کہ یہ خدا ہی ہے جس نے تمھیں ایک ہی جان سے پیدا کیا، اسی کی جنس سے اس کا جوڑا بنایا، پھر مردوں اور عورتوں کی ایک دنیا پیدا کر دی۔ ان میں شکلوں، صورتوں، زبانوں، لہجوں کا اگرچہ اختلاف ہے، لیکن جبلّی تقاضوں اور فطری داعیات کے لحاظ سے اتفاق ہے جو اس بات کی دلیل ہے کہ سب کا خالق اور پروردگار ایک ہی ہے جس نے ایک ہی درخت سے یہ سارے برگ و بار پیدا کیے ہیں۔ عورت اور مرد میں بظاہر تضاد و اختلاف ہے لیکن ان دونوں کے اندر ایک دوسرے کے ساتھ سازگاری کے جو ظاہری و باطنی محرکات و اسباب جمع ہیں وہ زبانِ حال سے شہادت دے رہے ہیں کہ دونوں کا خالق و مربّی ایک ہی ہے جس نے ایک مشترک مقصد کے لیے ان کو وجود بخشا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ غور کرو کہ یہ ایک ہی خدا کا پیدا کیا ہوا اور ایک ہی آدم و حوا کا گھرانا ہے یا مختلف خداؤں کی پیدا کی ہوئی منتشر بھیڑ جس کے ہر گروہ کے خدا بھی الگ الگ ہیں اور ان میں سے ہر ایک کا باوا آدم بھی جدا گانہ ہے۔

قرآن نے اسی وحدتِ الٰہ اور وحدتِ آدمؑ کے عقیدے پر انسانی معاشرے کی بنیاد رکھی ہے اور ان لوگوں کو فساد فی الارض کا مجرم قرار دیا ہے جو معاشرے کی اس بنیاد کو ڈھانے کی کوشش کریں۔ اس

مسئلہ پر تفصیل کے ساتھ ہم سورۂ نساء کی تفسیر میں بحث کر آئے ہیں۔ اس کی پہلی آیت اس عقیدے کو یوں پیش کرتی ہے۔

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ
خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ
مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا
كَثِيْرًا وَّنِسَآءً ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْ
تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ
كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيْبًا (١- نساء)

اے لوگو، تم اپنے اس خداوند سے ڈرو جس نے تم کو ایک ہی جان سے پیدا کیا، اور اسی کی جنس سے پیدا کیا اس کے جوڑے کو اور پھر ان دونوں سے پھیلا دیے بے شمار مرد اور بے شمار عورتیں، اور اس اللہ سے ڈرو جس کے واسطے سے تم ایک دوسرے سے طالب مدد ہوتے ہو اور رحمی رشتوں کا احترام کرو۔ بے شک اللہ تم پر نگران ہے۔

مستقر اور مُستودَع کا مفہوم

'فَمُسْتَقَرٌّ وَّمُسْتَوْدَعٌ'، 'مُسْتَقَرٌّ' کے معنی قرار و سکونت کی جگہ کے ہیں اور 'مُسْتَوْدَعٌ' اس جگہ کو کہتے ہیں جہاں کوئی چیز بطور ودیعت و امانت حفاظت سے رکھی جائے۔ قرینہ دلیل ہے کہ یہاں 'مستقر' سے جگہ ہے جہاں پیدا ہونے کے بعد انسان رہتا بستا ہے۔ 'وَلَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ' (بقرہ: اور تمہارے لیے زمین میں ایک وقتِ خاص تک رہنے بسنے کی جگہ اور کھانا برتنا ہے) 'مُستودَع' سے مراد وہ جگہ ہے جہاں مرنے کے بعد وہ دفن کیا جاتا ہے۔ دنیا میں آنے کے بعد انسان یہ دونوں ہی چیزیں پاتا ہے۔ جتنی زندگی اس کے لیے مقدر ہوتی ہے اتنے دن وہ گزارتا ہے اور جو رزق اس کے لیے مقدر ہوتا ہے اس سے متمتع ہوتا ہے اور اس کا یہ جینا اور خدا کے بخشے ہوئے رزق سے متمتع ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ وہ خدا کی نگرانی اور اس کے علم میں ہے۔ پھر جب اس دنیا میں اس کی مدتِ حیات ختم ہو جاتی ہے تو وہ اپنی جان، جان آفرین کے سپرد کرتا ہے اور جہاں کہیں بھی دفن ہوتا ہے خدا ہی کی زمین میں دفن ہوتا ہے اور جب خدا کا حکم ہوگا زمین اس امانت کو خدا کے حوالے کر دے گی۔ جس طرح ہر شخص کا 'مستقر' خدا کے علم میں ہوتا ہے، اسی طرح اس کا 'مستودع' بھی اس کے علم میں ہوتا ہے۔ خدا کا علم ہر چیز کو محیط ہے۔ کوئی چیز بھی اس سے مخفی نہیں۔ قرآن مجید میں یہ مضمون دوسرے مقامات میں اس سے زیادہ وضاحت کے ساتھ بیان ہوا ہے مثلاً وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا وَيَعْلَمُ مُسْتَقَرَّهَا وَمُسْتَوْدَعَهَا ۭ كُلٌّ فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ۔ هود (اور نہیں ہے زمین میں کوئی جاندار مگر اللہ ہی اس کو روزی دیتا ہے، اور خدا دنیا میں اس کے مستقر کو بھی جانتا ہے اور مر گئے پر اس کے سپرد کیے جانے کی جگہ کو بھی، ہر چیز ایک واضح رجسٹر میں درج ہے) مطلب یہ ہے کہ پیدا ہونے کے بعد زندگی، رزق اور اسباب و وسائل سب کچھ اسی سے حاصل ہوتا ہے تو کسی غیر کو انسان اپنی امید کا مرجع کیوں بنائے؛ پھر مدفن کے لیے 'مستودع' کا لفظ استعمال کر کے ایک لطیف اشارہ مرنے کے بعد اٹھائے جانے کی طرف بھی فرما دیا کہ انسان جب مرتا ہے تو یہ نہیں ہوتا ہے کہ وہ ختم ہو گیا، بلکہ وہ زمین کی تحویل میں

دے دیا جاتا ہے جہاں سے وہ پھر اٹھایا جائے گا تاکہ وہ اپنی شکر گزاری کا انعام پائے اگر خدا کی بخشی ہوئی نعمتوں کا اس نے حق پہچانا ہے اور اپنی ناشکری کی سزا بھگتے اگر اس نے خدا کی نعمتوں کی ناقدری کی ہے۔ یہ خدا کی رحمت و ربوبیت اور اس کے علم و حکمت کا لازمی تقاضا ہے۔

دیکھتے سب کچھ ہیں لیکن سوجھتا کچھ بھی نہیں

'قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّفْقَهُوْنَ' اس میں وہی بات فرمائی گئی ہے جو اوپر گزر چکی ہے۔ اس کا اعادہ اس بات کی دلیل ہے کہ مخاطب نہایت ضدی ہیں جو بات تو سمجھنا نہیں چاہتے لیکن بہانہ یہ تراش رہے ہیں کہ ان کو کوئی معجزہ نہیں دکھایا جا رہا ہے۔ 'علم' اور 'تفقہ' میں فرق یہ ہے کہ علم عقل و شعور کا فعل ہے اور تفقہ دل کا، چنانچہ قرآن میں جگہ جگہ ارشاد ہوا ہے 'لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا' (ان کے دل ہیں جن سے وہ سمجھتے نہیں) یہ اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ انسان پر خدا کی نشانیاں اس وقت ظاہر ہوتی ہیں جب وہ اپنی عقل اور دل کو استعمال کرتا ہے۔ جب تک وہ محسوسات کا غلام بنا رہتا ہے، اس وقت تک اس کی مثال گدھے کی ہے جو ڈنڈے کی زبان کے سوا دوسری کوئی زبان بھی نہیں سمجھتا۔ یہاں یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ عقل اور دل بھی مشاہدۂ کائنات سے خدا تک اسی صورت میں پہنچتے ہیں جب ان کے اندر محسوسات سے آگے بڑھنے کی ہمت اور حوصلہ ہو۔ اگر وہ صرف محسوسات ہی پر قانع ہو جائیں اور ان کی ساری تگ و دو انہی چیزوں کے لیے رہ جائے جو اس حیات چند روزہ میں کام آنے والی ہیں تو بسا اوقات تل تو ان کو نظر آ جاتا ہے لیکن تل کی اوٹ کا پہاڑ ان سے اوجھل ہی رہتا ہے۔ یہ حب عاجلہ کی بیماری ہے، جس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ دیکھنے کو تو سب کچھ دیکھتے ہیں لیکن سوجھتا کچھ بھی نہیں۔

وَهُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجْنَا بِهٖ نَبَاتَ كُلِّ شَيْءٍ فَاَخْرَجْنَا مِنْهُ خَضِرًا نُّخْرِجُ مِنْهُ حَبًّا مُّتَرَاكِبًا ۚ وَمِنَ النَّخْلِ مِنْ طَلْعِهَا قِنْوَانٌ دَانِيَةٌ وَّجَنّٰتٍ مِّنْ اَعْنَابٍ وَّالزَّيْتُوْنَ وَالرُّمَّانَ مُشْتَبِهًا وَّغَيْرَ مُتَشَابِهٍ ۭ اُنْظُرُوْٓا اِلٰى ثَمَرِهٖٓ اِذَآ اَثْمَرَ وَيَنْعِهٖ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكُمْ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ (۹۹)

قدم قدم پر توحید و معاد کے آثار و دلائل

اب یہ خدا کی رحمت، ربوبیت، قدرت، حکمت، توحید اور معاد کے ان آثار و دلائل کی طرف توجہ دلائی جا رہی ہے جو ہر انسان کو قدم قدم پر نظر آ سکتے ہیں بشرطیکہ وہ ماننا چاہے۔

وَهُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجْنَا بِهٖ نَبَاتَ كُلِّ شَيْءٍ لفظ 'سماء' پر ہم دوسری جگہ لکھ چکے ہیں کہ یہ بادلوں کے لیے بھی آتا ہے اور اس فضائے نیلگوں کے لیے بھی جس کو ہم آسمان کہتے ہیں۔ فرمایا کہ وہی خدا ہے جو آسمان سے بارش برساتا ہے اور اس سے ہر چیز کو روئیدگی بخشتا ہے۔ کلام کا آغاز غائب کے صیغہ سے فرمایا پھر اس کو 'فَاَخْرَجْنَا بِهٖ' متکلم کے صیغہ میں بدل دیا۔ اس میں رافت عنایت اور ربوبیت کا اظہار بھی ہے اور اس حقیقت کی طرف اشارہ بھی کہ آسمان و زمین اور ابر و ہوا سب پر ہماری ہی حکومت ہے، اگر آسمان پر کسی اور کی حکومت ہوتی، نہ کہ زمین پر کسی اور کی تو یہ توافق کہاں سے

ظہور میں آتا کہ آسمان سے پانی برستا اور زمین اپنے خزانے اُگل دیتی۔ پھر اس میں ایک لطیف تلمیح آخرت کی بھی ہے۔ قرآن میں اسی بارش اور اس کے اثر سے مردہ زمین کے از سر نو لہلہا اُٹھنے کو متعدد مقامات میں معاد کی دلیل کے طور پر پیش کیا ہے کہ جب تم ہمیشہ دیکھتے ہو کہ زمین پر ایک تنکا بھی نہیں ہوتا لیکن بارش ہوتی ہے تو اس کے اندر کی دبی ہوئی ہر چیز جاگ پڑتی ہے اور گوشہ گوشہ سبزے سے معمور ہو جاتا ہے تو مرجانے کے بعد جی اٹھنے کو کیوں بعید سمجھتے ہو؟

ربوبیتِ عامہ کے بعد بعض اشارات ربوبیتِ خاصہ کی طرف

'فَاَخْرَجْنَا مِنْهُ خَضِرًا نُّخْرِجُ مِنْهُ حَبًّا مُّتَرَاكِبًا' ربوبیت عامہ کے بعد ربوبیت خاصہ کا بیان ہے جس کا تعلق انسانوں سے ہے۔ پہلے غلّہ کا ذکر فرمایا جو عام ضرورت کی چیز بھی ہے اور اپنی پائیداری کے اعتبار سے ذخیرہ کیے جانے کے لائق بھی۔ فرمایا کہ انہی نباتات میں سے جن کے اندر ہم نے غلّہ پیدا کرنے کی صلاحیت رکھی ہے، سرسبز خوشے اور بالیاں نکالتے ہیں اور اپنی قدرت و حکمت سے ان پر تہ بہ تہ دانے جما دیتے ہیں اور اس طرح تمہارے بوئے ہوئے ایک دانے پر سینکڑوں دانوں کا اضافہ کر کے ہم تمہیں لوٹا دیتے ہیں۔ غور کرو کہ یہ سب کچھ آپ سے آپ ہو رہا ہے، کسی اندھی بہری قوت کا ظہور ہے، یا کسی حکیم و قدیر اور دانا و بصیر پروردگار کی پروردگاری ہے؟ اتنے اجزائے مختلفہ کو اتنی تدبیر، اتنی ندرت اور اتنی حکمت سے استعمال کرنا اور ان کے حاصل کو تمہاری زندگی کے بقا کا ذریعہ بنا دینا ایک رب کریم و کارساز کے سوا اور کس کا کام ہو سکتا ہے؟

'وَمِنَ النَّخْلِ مِنْ طَلْعِهَا قِنْوَانٌ دَانِيَةٌ وَّجَنّٰتٍ مِّنْ اَعْنَابٍ' ان دونوں ٹکڑوں میں فعل محذوف ہے۔ پہلے میں مجہول، دوسرے میں معروف۔ غلّہ کے بعد اب پھلوں کا ذکر فرمایا اور پہلے کھجور کو لیا جس کو اہلِ عرب کے ہاں عام پھل کی حیثیت حاصل تھی۔ کھجور کا ذکر اس طرح فرمایا ہے کہ اس کے درخت، اس درخت کے اندر گابھے کا پیدا ہونا اور پھر اس سے لٹکتے ہوئے بوجھل خوشوں کا ظہور میں آنا، ہر چیز کی طرف توجہ دلا دی ہے تاکہ اس کاری گری پر انسان کی نظر پڑے جو اس کے ابتدائے ظہور سے لے کر اس کی تکمیل اور پختگی تک قدرت اس پر صرف کرتی ہے۔ اسی کاری گری اور صنعت پر غور کرنے سے انسان کو صانع کی معرفت حاصل ہوتی ہے اور وہ اس کی قدرت و حکمت اور اس کی رحمت و ربوبیت کا کچھ اندازہ کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ قدرت کا منشا ان قدرتوں اور حکمتوں کے اظہار سے یہی ہے کہ انسان کو خدا کی معرفت حاصل ہو ورنہ جہاں تک کھجور کی ضرورت مجرد غذا کے لیے ہے اس کی فراہمی کے لیے یہ ضروری نہیں تھا کہ ایک چھوٹی سی گٹھلی سے درجہ بدرجہ ایک تناور درخت بنے، پھر ایک خاص مرحلہ میں پہنچ کر اس کے اندر گابھے اور خوشے پیدا ہوں، پھر ان کے اندر ننھی ننھی کیریاں بیٹھیں، پھر وہ درجہ بدرجہ پھل بنیں، پھر پک کر اور بوجھل ہو کر ان کے خوشے زمین کی طرف لٹک آئیں اور انسان کو زبانِ حال سے دعوتِ شوق دیں۔ یہ سارا اہتمام دل گواہی دیتا ہے کہ اسی لیے ہے کہ انسان پر خدا کی قدرت، اس کی

ربوبیت اور اس کی حکمت کے اسرار ظاہر ہوں لیکن یہ سائنس کا عجیب اندھا پن ہے کہ اس کو حکمت تو نظر آتی ہے لیکن حکیم نظر نہیں آتا، ربوبیت تو اس کو دکھائی دیتی ہے لیکن رب کا سراغ اس کو کہیں نہیں ملتا۔ اور اس سے زیادہ عجیب معاملہ ان لوگوں کا ہے جو دیکھتے ہیں کہ کھجور کے درخت کے پیدا ہونے سے لے کر اس کے پھولنے، پھلنے اور پکنے تک تمام عناصر کائنات نے اس کی دیکھ بھال اور غور و پرداخت میں اپنا اپنا حصہ ادا کیا تب کہیں کھجور کا ایک خوشہ تیار ہوا ہے لیکن پھر بھی وہ اس سفاہت میں مبتلا ہیں کہ یہ کائنات مختلف ارادوں اور بے شمار دیوتاؤں کی ایک رزمگاہ ہے اور ان سے بھی زیادہ عجیب معاملہ ان سادہ لوحوں کا ہے جو ربوبیت اور پروردگاری کے یہ سارے سروسامان دیکھ رہے ہیں، ان سے متمتع اور محظوظ بھی ہو رہے ہیں لیکن سمجھتے ہیں کہ یہ سب کچھ ان کے کھانے پینے، عیش کرنے کے لیے ہے۔ یہ سوال ان کے ذہن میں کبھی نہیں پیدا ہوتا کہ یہ سب کچھ مہیا کرنے والے کی طرف سے ان پر کوئی ذمہ داری بھی عائد ہوتی ہے یا نہیں؟ ان نعمتوں کے باب میں کوئی پرسش کا دن بھی آنے والا ہے یا نہیں؟ گویا دینے والے نے حق تو ان کو سارے بخش دیے لیکن ذمہ داری ان کے اوپر کوئی بھی نہیں ڈالی۔

اشیاء میں تنوع کی حکمت

'وَالزَّيْتُوْنَ وَالرُّمَّانَ مُشْتَبِهًا وَّغَيْرَ مُتَشَابِهٍ' کھجور کے بعد انگور، زیتون اور انار کا ذکر فرمایا۔ مقصود ان کے ذکر سے صرف انہی متعین پھلوں کا ذکر نہیں ہے، ان کا ذکر صرف اس پہلو سے ہوا کہ یہ اہل عرب کے معروف پھل تھے جو ان کو خود اپنے علاقے میں میسر تھے، اصل مقصود یہ بتانا ہے کہ خدا نے تمہاری ربوبیت کا جو سامان کیا ہے تو اس میں صرف روٹی ہی نہیں بلکہ مختلف قسم کے فواکہ اور میوہ جات بھی ہیں۔ پھر فرمایا کہ یہ فواکہ بھی جو دیے تو اس میں بھی اپنی ربوبیت، اپنی رحمت، اپنی فیاضی اور اپنی قدرت و حکمت کی یہ شان دکھائی کہ ایک ایک چیز کی گوناگون اقسام و انواع، ایک دوسری سے ملتی جلتی بھی اور باہمد گر شکل، رنگ، قامت، ذائقہ میں مختلف بھی، تمہارے سامنے چن دیں۔ اب سوچو کہ جس نے یہ سب کچھ کیا ہے وہ رحیم، قدیر، علیم، حکیم اور کریم پروردگار ہے یا نہیں۔ آخر تمہاری زندگی مجرد اپنے بقا کے لیے تو ان پھلوں اور ان تمام تنوعات کی محتاج نہ تھی، تم جینے کو تو خشک روٹی اور پانی سے بھی جی سکتے تھے، پھر اس نے ایسا کیوں کیا کہ تمہارے آگے اتنے گوناگون پھلوں کے انبار لگا دیے جن کی خوشبو، ذائقہ، شکل ہر چیز دل کو لبھانے والی، آنکھوں کو فریفتہ کرنے والی اور دماغ کو مست کرنے والی ہے۔ یہ اس لیے ہے کہ ان میں سے ہر چیز کے اندر انسان اپنے خالق کی صفات کا جلوہ دیکھے اور پھر انھی صفات کے آئینہ میں اپنے ظاہر اور اپنے باطن کو سنوارے اور ان میں سے ہر نعمت اس کے اندر اس جذبۂ شکر و سپاس کو ابھارے جو خدا نے ہر انسان کے اندر ودیعت فرمایا ہے اور جو تمام دین و شریعت کی، جیسا کہ ہم دوسرے مقام میں واضح کر چکے ہیں، بنیاد ہے۔

'اُنْظُرُوْٓا اِلٰى ثَمَرِهٖٓ اِذَآ اَثْمَرَ وَيَنْعِهٖ'، 'اِلٰى ثَمَرِهٖ' میں ضمیر کا مرجع ہیں تو وہ ساری ہی چیزیں جن

کا اوپر ذکر گزرا لیکن ضمیر واحد اس وجہ سے ہے کہ متکلم چاہتا ہے کہ ان میں سے ایک ایک چیز کو الگ الگ لے کر ان کے پیدا ہونے سے لے کر ان کے پکنے تک کے تمام مراحل پر غور کیا جائے۔ غور و فکر کا عمل فطری طور پر یہ تقاضا کرتا ہے کہ ایک وقت میں ایک ہی چیز پر نگاہ جمائی جائے تاکہ قوتِ فکر منتشر نہ ہو جائے یہاں قرآن نے صرف غور و فکر کی دعوت ہی نہیں دی بلکہ اس کا صحیح طریقہ بھی بتا دیا۔ یہ واضح رہے کہ اس اسلوب کی مثالیں قرآن میں بھی ہیں اور کلام عرب میں بھی۔

جمع کے لیے ضمیر واحد اور اس کا فائدہ

'وَيَنْعِهٖ' کے بعد 'اِذَآ اَيْنَعَ' ہمارے نزدیک حذف ہے۔ ہم دوسرے مقام میں عربی زبان کا یہ اسلوب واضح کر چکے ہیں کہ بعض اوقات ایسے مقابل الفاظ حذف کر دیے جاتے ہیں جن کی مذکور الفاظ کے بعد کوئی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ یہاں چونکہ 'اِلٰى ثَمَرِهٖٓ' کے بعد 'اِذَآ اَثْمَرَ' موجود تھا اس وجہ سے 'وَيَنْعِهٖ' کے بعد 'اِذَآ اَيْنَعَ' کہنے کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ مذکور محذوف پر خود دلیل بن گیا۔

ہر ورق معرفت کردگار کا دفتر ہے

فرمایا کہ ان میں سے ایک ایک چیز کو لے کر اس کے پھلنے سے لے کر اس کے پکنے کے مراحل تک ہر مرحلے کو دیکھو اور اس پر غور کرو تو خالق کی قدرت، حکمت، ربوبیت، صناعی، کاریگری، باریک بینی، فیض بخشی اور اس کے حسن و جمال کی اتنی نشانیاں اور اتنی شہادتیں تمہارے سامنے آئیں گی کہ تم ان کو شمار نہیں کر سکو گے تم ایک نشانی اور ایک معجزہ مانگتے ہو، آنکھیں ہوں تو ہر شاخ معجزہ، ہر پھول معجزہ، ہر پھل معجزہ۔ کوئی چھوٹی سی چھوٹی چیز بھی ایسی نہیں ہے جس کے اندر قدرت کے اعجاز کے ہزاروں شاہکار جلوہ نما نہ ہوں۔ ہم اوپر اشارہ کر آئے ہیں کہ یہ دنیا اپنے بقا کے لیے ان تمام عجائب کی نمائش کی محتاج نہ تھی۔ یہ بالکل سادہ اور بے رنگ حالت میں بھی وجود میں آ سکتی اور باقی رہ سکتی تھی لیکن خالق کائنات نے یہ پسند فرمایا کہ ایک ایک پھول اور ایک ایک پتی سے اس کی عظیم قدرت و حکمت اور اس کی بے نہایت رحمت و ربوبیت ظاہر ہو تاکہ انسان اس کی معرفت حاصل کرے۔ لیکن یہ انسان کی عجیب بدقسمتی ہے کہ ایک طرف تو وہ اپنی ذہانت کے مظاہرے کا اتنا شوقین ہے کہ اگر ہڑپہ اور موہنجو داڑو کے مدفون کھنڈروں سے کوئی ٹوٹا ہوا مٹی کا مرتبان بھی اس کو ہاتھ آ جائے تو اس پر کھنچی ہوئی آڑی ترچھی لکیروں سے وہ اس عہد کے آرٹ، اس عہد کے کلچر، اس عہد کی تہذیب، اس دور کے مذہب، اس دور کی سیاست، غرض ہر چیز پر ایک مزعومہ فلسفہ اور ایک فرضی تاریخ تیار کر دے گا، دوسری طرف اس کی بلادت اور بدذوقی کا یہ عالم ہے کہ خالق کائنات نے ایک ایک پتی پر اپنی حکمت کے جو دفاتر رقم فرمائے ہیں نہ ان کا کوئی حرف اس کی سمجھ میں آتا ہے نہ ان سے اسے کوئی رہنمائی حاصل ہوتی ہے۔

'اِنَّ فِيْ ذٰلِكُمْ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ'، فرمایا کہ جو لوگ ایمان لانا چاہیں ان کے لیے ان چیزوں کے اندر بہت سی نشانیاں ہیں۔ ہم اوپر عرض کر چکے ہیں کہ کسی حقیقت کے تسلیم کیے جانے کے لیے تنہا یہ کافی نہیں ہے کہ وہ واضح اور ثابت ہے بلکہ اس کے لیے اول شرط یہ ہے کہ آدمی کے اندر اس کو قبول کرنے کا

ارادہ پایا جاتا ہو۔ دنیا کو گمراہی علم کے مخفی ہونے کے سبب سے زیادہ پیش نہیں آئی ہے بلکہ زیادہ تر عمل کا سچا اور مضبوط ارادہ مفقود ہونے سے پیش آئی ہے۔

آیت ۹۹ کے تحت بیان کردہ نشانیاں

اب آیئے ان نشانیوں پر غور کیجیے جن کی طرف آیت میں اشارہ فرمایا گیا ہے۔

پہلی چیز تو یہ سمجھ میں آتی ہے کہ اتنی حکمتوں سے یہ معمور دُنیا نہ آپ سے آپ وجود میں آئی ہے، نہ یہ کسی اندھی بہری قوت کا کرشمہ ہے بلکہ اس کے ذرّے ذرّے کے اندر بے پایاں قدرت اور بے نہایت حکمت کی جو نشانیاں ہیں وہ زبانِ حال سے شہادت دے رہی ہیں کہ یہ ایک قادر و قیوم اور ایک علیم و حکیم کی بنائی ہوئی دُنیا ہے۔

دوسری چیز یہ نمایاں ہوتی ہے کہ آسمان و زمین، ابر و ہوا، سورج اور چاند، نور اور ظلمت، سردی اور گرمی، بہار اور خزاں ہر چیز پر تنہا اسی قادر و قیوم کی حکمرانی ہے اس لیے کہ ہر چیز اپنے وجود، اپنے نشوونما اور اپنے بلوغ و کمال میں تمام عناصر کائنات کی ایک خاص تناسب کے ساتھ خدمات حاصل کرتی ہے جو بغیر اس کے ممکن نہیں کہ ایک ہی بالاتر ارادہ تمام کائنات پر حاوی ہو اور وہ اپنے محیط کل علم و حکمت کے تحت ان تمام عناصر مختلفہ کے اندر ربط و ہم آہنگی پیدا کرے اور ان کو کائنات کے مجموعی مقصد کے لیے استعمال کرے۔

تیسری چیز یہ سمجھ میں آتی ہے کہ قدرت، علم اور حکمت سے یہ معمور کائنات اپنے ہر گوشے سے پکار پکار کر شہادت دے رہی ہے کہ یہ کسی کھلنڈرے کا کھیل تماشہ نہیں ہے جو محض اس نے اپنا جی بہلانے کے لیے بنایا ہو، جس کے اندر نیکی اور بدی، خیر اور شر، عدل اور ظلم کا کوئی امتیاز نہ ہو۔ اس قدرت، اس علم اور اس حکمت کا لازمی تقاضا ہے کہ ایک ایسا دن آئے جس میں اس کے خالق و مالک کا کامل عدل اور اس کی کامل رحمت ظاہر ہو۔

چوتھی چیز یہ سامنے آتی ہے کہ اس کے اندر رب کریم و رحیم نے ہمارے لیے بغیر ہمارے کسی استحقاق کے، محض اپنے فضل و رحمت سے جو نعمتیں اور لذتیں مہیا فرمائی ہیں اور جن سے ہم متمتع ہو رہے ہیں، یہ ہم پر ہمارے رب کی شکر گزاری اور اسی کی عبادت و اطاعت کا حق واجب کرتی ہیں۔ جس کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ ایک ایسا دن آئے جس میں اس حق کی بابت ہم سے پرسش ہو۔ جس نے یہ حق ادا کیا ہو وہ انعام پائے اور جس نے ناشکری کی ہو وہ اس کی سزا بھگتے۔

پانچویں حقیقت یہ واضح ہوتی ہے کہ جس پروردگار کی پروردگاری کا یہ عالم ہے کہ اس نے ہمارے اندر جو طلب اور جو داعیہ بھی ودیعت فرمایا اس کا ہمارے گرد و پیش میں بہتر سے بہتر جواب مہیا فرمایا۔ بھوک دی تو غذا مہیا فرمائی، پیاس دی تو پانی کے دریا بہا دیے، ذائقہ بخشا تو ذوق کی ضیافت کے نت نئے سامان کیے، ذوق نظر بخشا تو کائنات کے گوشے گوشے کو اپنی قدرت کی نیرنگیوں کی جلوہ گاہ بنا دیا، یہ

کس طرح ممکن ہے کہ ایسی فیض بخش اور بابرکت ذات جو ہماری مادی ضرورتوں کا اس سیر چشمی اور فیاضی سے اہتمام کرے، ہماری اس جستجو کا کوئی جواب نہ پیدا کرے جو اس نے ہماری روح اور ہمارے دل کے اندر اپنی ہدایت کے لیے ودیعت فرمائی ہے؟ یہ چیز لازم ٹھہراتی ہے کہ جس طرح اس نے ہماری جسمانی بھوک اور پیاس کے لیے غذا اور پانی کا انتظام فرمایا ہے اسی طرح ہماری اس روحانی تشنگی کے بجھانے کا بھی اہتمام فرمائے۔ یہ چیز رسالت کے سلسلۂ رشد و ہدایت کی ضرورت کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔

وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ الْجِنَّ وَخَلَقَهُمْ وَخَرَقُوْا لَهٗ بَنِيْنَ وَبَنٰتٍۢ بِغَيْرِ عِلْمٍ ؕ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يَصِفُوْنَ ۝ بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ اَنّٰى يَكُوْنُ لَهٗ وَلَدٌ وَّلَمْ تَكُنْ لَّهٗ صَاحِبَةٌ ؕ وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ ۚ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۝ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ ۚ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ فَاعْبُدُوْهُ ۚ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ وَّكِيْلٌ ۝ لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ ۫ وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ ۚ وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ ۝ (۱۰۰-۱۰۳)

جنات کو خدائی میں شریک بنانے کا عقیدہ

'وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ الْجِنَّ وَخَلَقَهُمْ' یعنی کائنات کی ایک ایک چیز تو خدا اور اس کی صفات سے متعلق وہ شہادتیں فراہم کر رہی ہے جو اوپر مذکور ہوئیں لیکن ان لوگوں کی خرد باختگی اور سفاہت کا یہ عالم ہے کہ یہ جنات کو بھی خدا کا شریک بنائے بیٹھے ہیں۔ اہل عرب جن چیزوں کو خدا کا شریک مانتے تھے ان میں ملائکہ، جنات، کواکب سب ہی شامل تھے۔ لیکن یہاں سب سے پہلے جنات کا ذکر کر کے قرآن نے شرک کے انتہائی گھنونے پن کو واضح کیا ہے کہ کہاں خدا کی وہ شانیں جو بیان ہوئیں اور کہاں ان بوالفضولوں کی یہ بوالفضولی کہ پیپل تلے کی بھتنی اور شیطان کو بھی خدا کا شریک بنا دیا گیا ہے۔ یہ بات یہاں ملحوظ رہے کہ اہل عرب جنات کی پرستش اسی قسم کے تصورات کے تحت کرتے تھے جس قسم کے تصورات کے تحت عام طور پر حال کی مشرک قومیں بھوت پریت کی پرستش کرتی ہیں۔ فلاں وادی کا جن، فلاں درخت کی بھتنی، فلاں ٹیلے کا بھوت، اس قسم کے توہمات ان کے اندر پھیلے ہوئے تھے اور عام طور پر ان کی آفتوں سے محفوظ رہنے کے لیے ان کو چڑھاوے، نذریں، قربانیاں پیش کی جاتیں اور ان کی جے پکاری جاتی۔ بعض جن تو اتنے خطرناک سمجھے جاتے کہ ان کو راضی رکھنے کے لیے، جیسا کہ آگے آیت ۱۳۷ کے تحت ذکر آئے گا، اولاد تک کی قربانی کی جاتی۔ غالباً یہ ظالمانہ حرکت وہ لوگ کرتے رہے ہوں گے جو اس وہم میں مبتلا ہوتے ہوں گے کہ اگر فلاں جن کو خوش کرنے کے لیے اپنے کسی بیٹے کی قربانی نہ دی تو وہ ان کی ساری اولاد کو تباہ کر دے گا۔ اس قسم کا وہم دنیا کی وحشی قوموں میں عام رہا ہے۔

شرک کی کوئی دلیل نہیں

'وَخَلَقَهُمْ' میں 'و' حالیہ ہے اور اس کی حیثیت کلام کے بیچ میں جملہ معترضہ کی ہے۔ یہ بات اتنی گھنونی تھی کہ بلا تاخیر اس کی تردید فرما دی کہ یہ لوگ جنوں کو خدا کا شریک بناتے ہیں حالانکہ خدا ہی نے ان کو پیدا کیا ہے۔ خلاہی کی پیدا کی ہوئی کوئی چیز آخر اس کی خدائی میں شریک کیسے بن سکتی ہے؟ یہ واضح رہے کہ اہل عرب ساری کائنات کا خالق خدا ہی کو مانتے تھے۔ اس اعتبار سے ان کا یہ عقیدہ اصل عقیدے سے

صرف تضاد ہی نہیں رکھتا تھا بلکہ یہ تضاد نہایت بھونڈے قسم کا تھا۔ آخر خدا اپنی دنیا پیدا کر کے اس کو اپنے ہی پیدا کیے ہوئے جنوں کے رحم و کرم پر کیسے چھوڑ سکتا ہے۔

وَخَرَقُوْا لَهٗ بَنِيْنَ وَبَنٰتٍۭ بِغَيْرِ عِلْمٍ۔ 'خَرَقَ الْكَذِبَ' کے معنی جھوٹ گھڑنے اور جھوٹ تراشنے کے ہیں۔ اہلِ عرب فرشتوں کو خدا کی بیٹیوں کا درجہ دیتے تھے اور اس وہم کی بنا پر ان کی مورتیں بنا کر دیویوں کی حیثیت سے ان کی پوجا کرتے تھے۔ اگرچہ یہاں اصلاً زیرِ بحث مشرکین عرب ہی کے توہمات ہیں لیکن بیٹیوں کے ساتھ بیٹوں کا ذکر کر کے قرآن نے کلام میں وسعت پیدا کر دی ہے اور اس طرح ان قوموں کے عقائد کی بھی تردید ہو گئی ہے جو خدا کے لیے بیٹے مانتی تھیں جن کی ایک مثال عیسائی ہیں۔ 'بِغَيْرِ عِلْمٍ' کا مطلب یہ ہے کہ یہ باتیں وہ بغیر کسی دلیل عقلی و نقلی کے مانتے ہیں۔ دوسری جگہ ہے 'بِغَيْرِ سُلْطٰنٍ اَتٰىهُمْ' جہاں تک خدا کا تعلق ہے وہ تو عقل و فطرت کا بدیہی تقاضا ہے۔ خدا کو مانے بغیر نہ اس کائنات کا معمہ حل ہوتا نہ عقل و فطرت کو اطمینان حاصل ہوتا۔ یہاں تک تو بات ٹھیک ہے اور یہ موحد و مشرک دونوں کے ہاں مسلم ہے۔ رہی یہ بات کہ اس کائنات میں کسی اور کی بھی حصہ داری ہے تو یہ چیز دلیل کی محتاج ہے اور یہ دلیل فراہم کرنا اس فریق کی ذمہ داری ہے جو اس کا مدعی ہے۔ یہ دلیل دو قسم کی ہو سکتی ہے۔ یا تو خود خدا کی طرف سے کوئی قابلِ اطمینان شہادت موجود ہو کہ اس نے فلاں اور فلاں کے لیے اپنی اس کائنات میں حصہ داری تسلیم کی ہے یا ان کو وہ اپنے بیٹے یا بیٹیاں مانتا ہے یا عقل و فطرت کے اندر ان کے حق میں کوئی دلیل موجود ہو۔ اگر ان دونوں چیزوں میں سے کوئی چیز بھی موجود نہ ہو تو آخر کیا شامت آئی ہوئی ہے کہ مفت میں کسی کو خدا یا شریکِ خدا مان کر اس کی غلامی کا پٹا بھی اپنی گردن میں ڈال لیجیے۔ خدا کوئی تفریح کی چیز نہیں ہے۔ اس کو تو اس لیے مانا جاتا ہے کہ اس کے مانے بغیر چارہ نہیں۔ آخر دوسروں کے ماننے کے لیے کیا مجبوری ہے کہ ان کو مانئے۔ بلا دلیل تو آدمی اپنی گز بھر زمین میں کسی کی حصہ داری تسلیم کرنے کے لیے آمادہ نہیں ہوتا تو آخر خدا کی خدائی اور اس کے اختیار و اقتدار میں کسی کو کس طرح حصہ دار مان لے۔

خلاف شان صفات کی نفی

'سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يَصِفُوْنَ' 'سُبْحٰنَهٗ' کے لفظ پر ہم دوسری جگہ بحث کر چکے ہیں۔ یہ تنزیہہ کا کلمہ ہے، یعنی خدا ان باتوں سے پاک، بری اور بالا ہے جو یہ مشرکین اس کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ یہ بظاہر تو صرف ایک تنزیہی کلمہ ہے لیکن غور کیجیے تو اس کے اندر توحید کی بہت بڑی دلیل بھی ہے۔ عقل و فطرت کا یہ بدیہی تقاضا ہے کہ کسی چیز کی طرف کوئی ایسی صفت منسوب نہ کی جائے جو اس کی ثابت، مسلم اور بدیہی صفات کے ضد یا منافی ہو۔ اگر ایسا کیا جائے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اپنی ہی مانی ہوئی ایک حقیقت اپنے ہی دوسرے مفروضہ سے باطل ہو جاتی ہے۔ اگر ایک شخص بادشاہ ہے تو اس کی طرف غلامی کی صفات منسوب نہیں ہو سکتیں۔ فرشتہ ہے تو اس کو شیطان کی صفات سے ملوث نہیں کیا جا سکتا۔ اسی طرح جو ذات خالق، مالک، قدیر، علیم اور کریم و رحیم ہے اس کو ان صفات سے متصف کرنا جو مخلوق کی صفات ہیں اس کی

ان تمام صفات کی نفی کے ہم معنی ہے جن کا ماننا از روئے عقل و فطرت واجب ہے اور جن کی نفی سے انسان ان تمام تاریکیوں میں پھر گھر جاتا ہے جن سے ان صفات کے علم کی روشنی ہی نے اس کو نکالا تھا۔ اگر خدا کو خدا ماننے کے بعد بھی جنات اور فرشتوں کو اس کا شریک قرار دے دیا گیا اور اس کو بیٹوں بیٹیوں کا باپ بنا دیا گیا تو پھر وہ خدا کہاں رہا؟ پھر تو اس کے کفو و ہم سر بھی پیدا ہو گئے، اس کی ذات برادری کے شریک بھی نکل آئے اور اس کے مدمقابل اور حریف بھی اُٹھ کھڑے ہوئے۔

'بَدِیْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ، 'بدیع' کے معنی ہیں عدم سے وجود میں لانے والا۔ یعنی خدا آسمانوں اور زمین اور تمام کائنات کو عدم سے وجود میں لانے والا ہے۔ جب کچھ نہ تھا تب خدا تھا۔ یہ ایک مسلم حقیقت ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اس کائنات کی ہر چیز خدا کی مخلوق ہے تو کسی مخلوق کو بیٹوں بیٹیوں کا درجہ کس طرح حاصل ہوا؟ اور وہ خدا کی خدائی میں شریک کس راہ سے ہوئے؟

مشرکین کی حماقت

'اَنّٰی یَکُوْنُ لَهٗ وَلَدٌ وَّلَمْ تَكُنْ لَّهٗ صَاحِبَةٌ' یعنی خدا کے لیے اولاد ماننا ایک اس سے بھی بڑی حماقت کے لیے راہ کھولتا ہے۔ وہ یہ کہ خدا کے لیے (نعوذ باللہ) بیوی بھی مانی جائے۔ یہ خیریت تھی کہ مشرکین عرب اپنی تمام مشرکانہ خرافات کے باوجود خدا کے لیے کوئی بیوی نہیں مانتے تھے۔ قرآن نے اسی پر یہ سوال اٹھایا ہے کہ جب خدا کے کوئی بیوی نہیں اور تم بھی اس کے لیے کسی بیوی کے قائل نہیں تو پھر یہ اس کے بیٹے بیٹیاں تم نے کہاں سے کھڑے کر دیے؟ پھر تو جو بھی ہو گا، فرشتے ہوں یا جنات یا انسان، سب خدا کی مخلوق ہوئے اور جب مخلوق ہوئے تو سب کو مخلوق ہی کے درجے میں رکھو، ان میں سے کسی کو بیٹے بیٹیاں قرار دے کر خدا کی ذات اور اس کی خدائی میں کیوں شریک بنائے دے رہے ہو۔

محیط کل علم شرک کے منافی ہے

'وَخَلَقَ كُلَّ شَیْءٍ وَّهُوَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ' یہ شرک اور شرکاء کی کلی نفی کی دلیل ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب خدا ہی نے ہر چیز کو پیدا کیا ہے اور اس کا علم ہر چیز کو محیط ہے تو آخر وہ ضرورت کیا ہے جس کے لیے ان شرکاء کا سہارا ڈھونڈھا گیا ہے؟ یہ تصور کرنے کی تو کوئی گنجائش نہیں ہے کہ خدا نے پیدا کرنے کو تو کر دیا لیکن اس کو ہر چیز اور ہر شخص کی خبر نہیں ہے۔ جس نے پیدا کیا ہے وہ لازماً ہر چیز کو جانتا بھی ہے۔ اسی بات کو دوسری جگہ فرمایا ہے 'اَلَا یَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ'، ملک ۱۴ (کیا وہ نہیں جانے گا جس نے پیدا کیا)۔ یہاں یہ بات یاد رہے کہ اہل عرب فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں مان کر ان کی جو پوجا کرتے تھے تو اس لیے نہیں کہ وہ ان کو خالق مانتے تھے بلکہ صرف اس لیے کہ یہ خدا کے چہیتے ہیں اور یہ اپنے پرستاروں کی ضروریات، ان کے مسائل اور ان کی آرزوؤں سے خدا کو باخبر کرتے اور اس سے منواتے ہیں۔ فرمایا کہ اس نے پیدا کیا ہے تو وہ اپنی مخلوق کی ہر چیز سے واقف بھی ہے تو اس کو چھوڑ کر کسی اور کے دروازے پر جانے کی کیا ضرورت ہے۔

'ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الایہ' فرمایا کہ وہی خدا جس نے تمھیں پیدا کیا ہے وہی تمھارا رب بھی ہے

پھر اس کا کیا تک ہے کہ خالق تو اس کو مانو اور رب دوسروں کو بناؤ۔ وہی خالق ہے تو اسی کی بندگی کرو اور وہ ہر چیز پر نگران ہے تو امید ہو یا بیم دونوں کا مرجع اسی کو بناؤ۔

خدا کے لیے پیکر محسوس تراشنے کی ممانعت

لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ یعنی اگر تم یہ خیال کرتے ہو کہ خدا نظر تو نہیں آتا تو یہ چیز مایوس ہونے کی نہیں۔ تمھاری نگاہیں تو بے شک اس کو پکڑنے سے قاصر ہیں لیکن وہ تمھاری نگاہوں کو پا لیتا ہے۔ جو اسے دیکھنا چاہتا ہے وہ تو اگرچہ اس کو نہیں دیکھ پاتا لیکن وہ ڈھونڈنے والے کو دیکھ لیتا ہے۔ حدیث میں ہے کہ اعبد ربك كانك تراه فان لم تكن تراه فانه يراك (اپنے رب کی بندگی اس طرح کرو گویا تم اُسے دیکھ رہے ہو، اگر تم اسے نہیں دیکھ رہے ہو تو وہ بہرحال تمھیں دیکھ رہا ہے) یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ شرک و بت پرستی کے محرکات میں سے ایک اہم محرک ابتدا سے یہ بھی رہا ہے کہ ناد انوں نے خدا کو کسی پیکر محسوس میں دیکھنا چاہا ہے۔ اسی چیز نے انسان اور خدا کے درمیان واسطوں اور وسیلوں کو جنم دیا۔ جب خدا کہیں آنکھوں سے نظر نہیں آیا تو ناسمجھ لوگوں نے ان چیزوں کے پیکر تراش کر ان کی پرستش شروع کر دی جن کو وہ خدا کی ذات یا صفات کا مظہر یا اس کا اوتار سمجھے۔ چنانچہ زمانۂ حال کے ہندو فلسفی بت پرستی کے جواز کی نئی توجیہ اب یہی پیش کرتے ہیں اور مجھے حیرت ہوتی ہے کہ ہمارے ہاں جن صوفیوں نے تصورِ شیخ کی بدعت اختیار کی ہے وہ بھی اپنی اس بدعت کی تائید میں یہی دلیل پیش کرتے ہیں کہ انسان چونکہ پیکرِ محسوس کا خوگر ہے اس وجہ سے تصورِ شیخ، تصورِ الٰہی کا ذریعہ ہے۔ قرآن نے یہاں یہی غلط فہمی رفع فرمائی ہے کہ خدا دیکھنے اور چھونے کی چیز نہیں ہے۔ اس سے قرب و بُعد دل کے واسطہ سے پیدا ہوتا ہے۔ اگر انسان اس کو یاد رکھے تو وہ خدا سے قریب ہوتا ہے اگر بھول جائے تو دُور ہو جاتا ہے۔ اگر آدمی کی نگاہ اس کو نہیں دیکھتی تو اس سے کوئی فرق نہیں پیدا ہوتا، اس کی نگاہیں آدمی کو ہر جگہ اور ہر وقت دیکھتی ہیں اور انسان کے اعتماد کے لیے یہ بس ہے۔

وَهُوَ اللَّطِيفُ الْخَبِيرُ، یہ اوپر کی بات کی دلیل صفاتِ الٰہی سے بیان فرمائی کہ وہ بڑا باریک بین اور بڑی خبر رکھنے والا ہے۔ کوئی چیز کتنے ہی پردوں میں ہو اس کی نگاہیں اس تک پہنچ جاتی ہیں اور کوئی چیز کتنی ہی مخفی ہو وہ اس سے ہر آن و ہر لحظہ باخبر ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ اس کے لیے ان مزعومہ وسایط و وسائل کی ضرورت نہیں۔ تم اس کے طالب بنو وہ خود تمھیں پا لے گا۔ تمھاری نگاہیں بے شک اس کو پانے سے قاصر ہیں لیکن اس کی نگاہیں تمھاری نگاہوں کو پا لینے سے قاصر نہیں ہیں۔ وہ ہر جگہ سے ان کو پا لیتی ہیں۔

قَدْ جَآءَكُمْ بَصَآئِرُ مِنْ رَّبِّكُمْ ۚ فَمَنْ اَبْصَرَ فَلِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ عَمِيَ فَعَلَيْهَا ۗ وَمَآ اَنَا عَلَيْكُمْ بِحَفِيْظٍ ۝ وَكَذٰلِكَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ وَلِيَقُوْلُوْا دَرَسْتَ وَلِنُبَيِّنَهٗ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ (۱۰۴-۱۰۵)

قَدْ جَآءَكُمْ بَصَآئِرُ مِنْ رَّبِّكُمْ، لفظ 'بَصِيْرَة' قرآن میں سوجھ بوجھ کے معنی میں بھی استعمال ہوا ہے

اور سوجھ بوجھ پیدا کرنے والے دلائل و براہین کے معنی میں بھی۔ یہاں یہ اسی دوسرے معنی میں ہے اور مراد اس سے قرآن حکیم اور اس کی آیات ہیں جو آنکھوں کے پردے ہٹا دینے والی ہیں بشرطیکہ کوئی آنکھیں کھولنا چاہے۔

'فَمَنْ اَبْصَرَ فَلِنَفْسِهٖ وَمَنْ عَمِیَ فَعَلَیْهَا وَمَآ اَنَا عَلَیْكُمْ بِحَفِیْظٍ' یعنی ان سے فائدہ اٹھا کر جو اپنی بصیرت کی آنکھیں کھولے گا تو اس کا فائدہ اسی کو پہنچے گا اور جو بدستور اندھا بنا رہے گا تو اس کا خمیازہ خود ہی بھگتے گا، اس کی کوئی ذمہ داری پیغمبر پر نہیں ہے۔

گفتۂ او گفتۂ اللہ بود

آیت کے آخری الفاظ 'وَمَآ اَنَا عَلَیْكُمْ بِحَفِیْظٍ' اس بات پر دلیل ہیں کہ اس آیت کی وحی براہِ راست لسانِ نبوت پر ہے۔ یوں ارشاد نہیں ہوا کہ ان لوگوں سے کہہ دو بلکہ کہنے کی بات پیغمبر نے خود براہ راست فرما دی۔ وحی کی یہ قسم روحِ نبوت کے غایت قرب و اتصال کی دلیل ہوتی ہے گویا منبع فیض کا فیضان خود زبان رسالت سے چھلک پڑتا ہے۔ 'گفتۂ او گفتۂ اللہ بود' شاید اسی حقیقت کی تعبیر ہے۔ وحی کی اقسام و انواع پر انشاء اللہ ہم کسی دوسرے مقام پر بحث کریں گے۔ مولانا فراہیؒ نے اس پر اپنے مقدمۂ تفسیر میں ایک نہایت لطیف بحث فرمائی ہے۔

'وَكَذٰلِكَ نُصَرِّفُ الْاٰیٰتِ' 'تصریفِ آیات' کی وضاحت مختلف مقامات میں ہو چکی ہے یعنی اللہ کی نشانیوں کو مختلف پہلوؤں اور گوناگوں اسلوبوں سے واضح کرنا۔ یہاں 'كَذٰلِكَ' کا اشارہ توحید، معاد اور رسالت کے انہی دلائل کی طرف ہے جو اوپر تفصیل سے بیان ہوئے ہیں۔

لفظ 'درس' کی تحقیق

'وَلِیَقُوْلُوْا دَرَسْتَ' 'دَرَسَ' کے اصل معنی تو گھسنے اور مٹانے کے ہیں۔ 'دَرَسَ الرَّسْمَ' کے معنی ہوں گے 'نشان کو مٹا دیا'۔ آدمی جب کسی چیز کو کثرت سے بار بار پڑھتا ہے، بالخصوص جب اس پر انگلی رکھ کے ایک ایک حرف کو متعین کرتے ہوئے پڑھتا ہے، جیسا کہ مذہبی صحیفوں کی تلاوت کے لیے رواج ہے تو بالعموم وہ نسخے گھس جاتے ہیں۔ اس وجہ سے لفظ 'درس' کسی کتاب کو اچھی طرح بار بار کرات و مرات پڑھنے کے لیے استعمال ہونے لگا۔ لغت میں اس بات کو یوں تعبیر کرتے ہیں 'دَرَسَ الْكِتٰبَ، اقبل علیه یحفظه'۔

کسی کتاب کو پڑھنا خود اپنے لیے بھی ہو سکتا ہے اور دوسروں کو سنانے کے لیے بھی ہو سکتا ہے۔ چنانچہ قرآن میں قرأت اور تلاوت کے الفاظ بھی ان دونوں ہی مفہوموں میں استعمال ہوئے ہیں 'وَلِیَقُوْلُوْا' کا معطوف علیہ محذوف ہے۔ اس قسم کے حذف کی متعدد مثالیں پیچھے گزر چکی ہیں۔ آیت کا مطلب یہ ہوا کہ ہم اپنی آیتیں مختلف اسلوبوں اور پہلوؤں سے پیش کر رہے ہیں تاکہ وہ سمجھنا چاہیں تو سمجھیں اور اگر اپنی روش پر اڑے رہنا چاہیں تو کم از کم اس بات کے تو وہ قائل ہو جائیں کہ تم نے اچھی طرح پڑھ کے سنا دیا۔ نیز اس لیے ہم ان کی اچھی طرح وضاحت کر رہے ہیں کہ جو علم کے طالب ہیں وہ ان سے علم حاصل

کریں۔ یہ امر یہاں واضح رہے کہ اللہ تعالیٰ جب اپنا کوئی رسول بھیجتا ہے تو اس کے ذریعے سے وہ مخاطب قوم پر اپنی حجت تمام کر دیتا ہے۔ یہاں تک کہ ان کے دل پکار اٹھتے ہیں کہ رسول نے احقاقِ حق کا حق ادا کر دیا، زبان سے وہ اس کا اقرار کریں یا نہ کریں۔ یہاں 'لِيَقُولُوا' سے یہی دل کا اقرار مراد ہے۔ دل کے اقرار کے باوجود زبان و عمل سے جو قوم رسول کی تکذیب پر اڑی رہتی ہے، سنتِ الٰہی یہ ہے کہ وہ قوم ہلاک کر دی جاتی ہے۔

اِتَّبِعْ مَآ اُوْحِيَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ وَاَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ ۝ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَآ اَشْرَكُوْا ۭ وَمَا جَعَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا ۚ وَمَآ اَنْتَ عَلَيْهِمْ بِوَكِيْلٍ (۱۰۶-۱۰۷)

پیغمبر کی طرف التفات

یہ پیغمبر کی طرف التفات ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تم وحی الٰہی پر جمے اور اپنے موقفِ حق پر ڈٹے رہو۔ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے اور ان مشرکین کی مخالفت کی کوئی پروا نہ کرو۔ ان سے اعراض کرو اور یہ بات یاد رکھو کہ اگر اللہ اپنے دین کے معاملہ میں جبر کو پسند کرتا ہوتا تو ان میں سے کوئی بھی شرک پر قائم نہ رہ سکتا۔ وہ سب کو توحید و اسلام کی صراطِ مستقیم پر چلا دیتا لیکن اس کی حکمت کا تقاضا یہی ہوا کہ وہ لوگوں کو اس معاملے میں اختیار دے کر آزمائے کہ کون توحید کی راہ اختیار کرتا ہے، کون شرک کی؟ تو جب حکمتِ الٰہی نے یہ چاہا ہے تو تم ان کے معاملے میں کیوں پریشان ہو؟ تمھاری ذمہ داری حق کو واضح طور پر پہنچا دینے کی ہے اور یہ فرض تم انجام دے رہے ہو۔ تم ان کے ایمان کے ذمہ دار بنا کر نہیں بھیجے گئے ہو کہ بہ ایمان نہ لائے تو اس کی پرسش تم سے ہو اور نہ تم ان کے ایمان کے ضامن بنے ہو کہ کل کو ان کے باب میں خدا کے ہاں جواب دہی کرنی ہے۔ تم اپنا فرض انجام دو۔ جو ان کی ذمہ داری ہے وہ ان پر چھوڑ دو۔ اگر وہ اپنی ذمہ داری ادا نہ کریں گے تو اس کا خمیازہ خود بھگتیں گے۔

لفظ 'وکیل' کے مختلف معانی پر ہم دوسرے مقام پر گفتگو کر چکے ہیں۔ یہاں یہ ضامن کے مفہوم میں ہے۔ یعنی نہ خدا نے تم کو ان پر داروغہ مقرر کیا، نہ تم ان کے ضامن بنے تو تم کیوں پریشان ہو؟

وَلَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَيَسُبُّوا اللّٰهَ عَدْوًۢا بِغَيْرِ عِلْمٍ ۭ كَذٰلِكَ زَيَّنَّا لِكُلِّ اُمَّةٍ عَمَلَهُمْ ۠ ثُمَّ اِلٰى رَبِّهِمْ مَّرْجِعُهُمْ فَيُنَبِّئُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (۱۰۸)

مسلمانوں کو مشرکین کے معبودوں کو برا بھلا کہنے کی ممانعت

'وَلَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَيَسُبُّوا اللّٰهَ عَدْوًۢا بِغَيْرِ عِلْمٍ' یہ مسلمانوں کو اسی طرح کی ایک برمحل ہدایت ہے جس طرح کی ہدایت سورۂ نساء کی آیت ۸۶ اور ۱۴۸ میں گزر چکی ہے جس طرح مذکورہ آیات سے اوپر منافقین کے رویہ پر شدت کے ساتھ تنقید ہوئی تو ساتھ ہی مسلمانوں کو ان سے سلام کلام قطع کرنے اور تعیّن اشخاص کے ساتھ ان کو برا بھلا کہنے کی ممانعت کر دی گئی کہ مبادا یہ بات اصول کے حدود سے نکل کر ذاتیات کے دائرے میں داخل ہو جائے، اسی طرح یہاں اوپر شرک اور مشرکین پر جو سخت تنقید ہوئی ہے اس کا تقاضا یہ ہوا کہ مسلمانوں کو ہدایت کر دی جائے کہ شرک کی تردید یہ رنگ نہ اختیار کرنے پائے

کہ زیادہ پرجوش مسلمان ان چیزوں کو سخت سست کہنا شروع کر دیں جن کو یہ مشرکین پوجتے ہیں۔ یہ ہدایت اس وجہ سے ضروری تھی کہ یہ دَور، جیسا کہ آیات سے واضح ہے، بحث کی گرماگرمی کا تھا اور بحث کی گرماگرمی میں حدود کا احترام بالعموم ملحوظ نہیں رہتا در آنحالیکہ مسلمانوں پر، جیسا کہ سورۂ مائدہ آیت ۸ سے واضح ہے، واجب ہے کہ وہ دشمن کے ساتھ بھی معاملہ کرنے میں سرِمو حدود سے تجاوز نہ کریں۔ اس ہدایت کا دوسرا اہم پہلو یہ ہے کہ دعوت کے نقطۂ نظر سے بابرکت اور نتیجہ خیز طریقہ یہی ہے کہ بات اصول و عقائد ہی تک محدود رہے تاکہ مخاطب کے اندر کسی بیجا عصبیت کا جذبۂ جاہلی ابھرنے نہ پائے۔ اگر توحید کا تقاضائے عقل و فطرت ہونا اور شرک کا بالکل بے ثبات و بے بنیاد ہونا ثابت ہو جائے تو ان مزعومہ معبودوں کی خدائی آپ سے آپ ختم ہو جاتی ہے، ان کو سب و شتم کا ہدف بنانے کی سرے سے کوئی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی۔ برعکس اس کے اگر بحث کے جوش میں ان چیزوں کو لوگ بُرا بھلا کہنا شروع کر دیتے، جن کی عقیدت پشتہا پشت سے مشرکین کے دلوں میں رچی بسی ہوئی تھی تو اس کا نفسیاتی اثر ان پر یہی پڑ سکتا تھا کہ وہ مشتعل ہو کر نعوذ باللہ خدا کو گالیاں دینے لگتے اور پھر کوئی بات بھی سُننے کے لیے تیار نہ ہوتے۔ عَدْوًا بِغَيْرِ عِلْمٍ میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ہر چند مشرکین، خدا کو خدا مانتے ہیں لیکن اشتعال میں حدود کا ہوش کسے رہتا ہے؟ وہ اندھے ہو کر سارے حدود توڑ کے رکھ دیں گے بالخصوص جب کہ انھیں خدا کی صفات اور اس کے حقوق کا کوئی علم بھی نہیں ہے۔

یوں بھی غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ مشرکین کے معبودوں کو برا بھلا کہنے کا کوئی تک نہیں ہے۔ اگر وہ محض خیالی اور وہمی چیزیں ہیں تو سایہ سے لڑنے کا کیا فائدہ؟ اور اگر وہ فرشتوں، نبیوں اور بزرگوں کے زمرے سے تعلق رکھنے والے ہیں تو ان کو بُرا بھلا کہنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ الغرض یہ چیز دعوت کے نقطۂ نظر سے بھی غلط، عقل و انصاف کے پہلو سے بھی غلط اور سب سے زیادہ اس پہلو سے غلط ہے کہ مشرکین کے جھوٹے خداؤں کو گالیاں دینے والے درحقیقت اپنے سچے خدا کو گالیاں دلوانے کی راہ کھولتے ہیں۔

یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ قرآن میں بتوں کی بے حقیقتی، ان کی ناطاقتی اور ان کی بے بسی کی تصویر جو قرآن میں کہیں کہیں کھینچی گئی ہے وہ اس کے تحت نہیں آتی۔ اوّل تو رد کا جس چیز سے گیا ہے وہ سب و شتم ہے نہ کہ تنقید و توضیح، دوسرے یہاں آیت میں پیش نظر وہ فرضی یا واقعی ہستیاں ہیں جن کو مشرکین معبود مان کر پکارتے تھے۔ اَلَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ کے الفاظ سے یہ بات خود ہی نکل رہی ہے۔

كَذٰلِكَ زَيَّنَّا لِكُلِّ اُمَّةٍ عَمَلَهُمْ۔ مطلب یہ ہے کہ ہر قوم کو اپنی روایات، اپنے رسوم اور اپنے معتقدات عزیز ہوتے ہیں۔ اس وجہ سے ان کی علانیہ تحقیر و توہین سے وہ مشتعل ہوتی ہے۔ اس طرح کی کسی چیز پر تنقید کرتے ہوئے ناقد کو لازماً یہ بات ملحوظ رکھنی چاہیئے کہ معاملے کے وہی پہلو زیر بحث آئیں جو آنے چاہئیں اور اسی انداز میں آئیں جو شائستہ بحث و تنقید کے شایان شان ہے۔ وہ انداز نہیں ہونا چاہیے جو

جذبات کو مجروح کرنے والا اور دلوں کو دکھانے والا ہو۔

فطری تقاضوں کے جائز حدود کی رعایت

یہاں زَیَّنَّا کے فعل کو اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف جو منسوب فرمایا ہے یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ہر قوم کے اندر اپنی مالوفات سے دل بستگی اور اپنی روایات ملی و اجتماعی کے لیے یہ عصبیت ایک حد تک فطری چیز ہے۔ یہ نہ ہو تو قومی و ملی وحدت وجود ہی میں نہیں آسکتی۔ خاندانوں، قوموں، وطنوں کی شیرازہ بندی اسی چیز سے ہوئی ہے۔ یہ معدوم ہو جائیں تو افراد ہوا میں اڑتے ہوئے پتوں کے مانند ہو جائیں۔ اس وجہ سے اس چیز کا ایک مقام ہے جو تقاضائے فطرت ہے اور اس کی رعایت ملحوظ ہونی چاہیے۔ اس سے تعرض اسی حد تک ہونا چاہیے جس حد تک یہ حق کے خلاف ہے اور اس انداز میں ہونا چاہیے جس سے خود اس کا واجبی حق مجروح نہ ہو۔ یاد ہوگا، ہم دوسرے مقام میں بحث کر آئے ہیں کہ قرآن نے باپ دادا کے طریقہ کی بھی اہمیت تسلیم کی ہے۔ بس یہ مطالبہ کیا ہے کہ اس کو ان چیزوں سے پاک کر کے اختیار کیا جائے جو اس میں عقل و فطرت اور تعلیم الٰہی کے خلاف گھس آئی ہوں۔ اسی طرح یہاں مسلمانوں کو آگاہ کیا گیا ہے کہ قوم کے عقائد و اعمال کی تطہیر تو ضروری ہے لیکن یہ کام نہایت حکمت و دانش کے ساتھ ہونا چاہیے۔ ہر قوم کو اپنی روایات سے گہری وابستگی ہوتی ہے اور یہ چیز اس فطرت کے تقاضوں میں سے ہے جو خود خدا نے انسان کے اندر ودیعت کی ہے اس وجہ سے یہ تو ضروری ہے کہ جو خلافِ فطرت چیز فطرت کے اندر گھس آئی ہے وہ اس سے دُور کی جائے لیکن خود فطرت پر کوئی جارحانہ حملہ کرنے کی غلطی نہ کی جائے ورنہ اس سے کام بننے کے بجائے اور بگڑ جایا کرتا ہے۔

ثُمَّ اِلٰی رَبِّہِمۡ مَّرۡجِعُہُمۡ الایۃ' پوری آیت سامنے رکھ کر اس فقرے پر غور کیجیے تو مطلب یہ نکلے گا کہ مسلمانوں کو دعوت کے جوش میں اپنے حدود سے آگے نہیں بڑھنا چاہیے۔ اگر لوگ حق واضح ہو جانے کے باوجود اپنی غلطیوں ہی پر مُصر رہیں گے تو مجرم وہ ٹھہریں گے اور قیامت کے دن خدا کے آگے جواب دہی ان کو کرنی ہوگی، اہل ایمان پر ان کی کوئی ذمہ داری نہیں ہوگی، پھر وہ کیوں ضرورت سے زیادہ مضطرب اور اپنی ذمہ داری کے حدود سے متجاوز ہوں؟ یہ مسلمانوں کو اسی طرح کی تسکین و تسلی ہے جس طرح کی تسکین و تسلی اوپر والی آیت میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو دی گئی ہے۔

۱۷۔ آگے کا مضمون ــــــ آیات ۱۰۹-۱۱۷

اوپر کے مجموعۂ آیات میں، جیسا کہ واضح ہوا، تفصیل کے ساتھ توحید، معاد اور رسالت کے عقلی و فطری دلائل بیان ہوئے ہیں۔ اب آگے یہ فرمایا جا رہا ہے کہ ان سارے دلائل کے بعد بھی ان کا مطالبہ یہی ہے کہ تم کوئی معجزہ دکھاؤ تو وہ ایمان لائیں گے۔ فرمایا کہ ان کو بتا دو کہ یہ چیز میرے اختیار کی نہیں ہے، صرف خدا کے اختیار کی ہے۔ اس کے پاس معجزات کی کمی نہیں ہے۔ وہ ایک سے ایک بڑھ کر معجزے دکھا سکتا

ہے لیکن تم دنیا جہان کے معجزے دیکھنے کے بعد بھی ایمان نہیں لاؤ گے اس لیے کہ ایمان نہ لانے کی اصل علت یہ نہیں ہے کہ نشانیاں اور معجزات موجود نہیں ہیں بلکہ یہ ہے کہ تمھارے دل اور تمھاری آنکھیں الٹ گئی ہیں۔ جس طرح اس کائنات کی بے شمار نشانیاں دیکھ کر تم اندھے ہی بنے رہے اسی طرح اگر اور بہت سے معجزے بھی تمھیں دکھا دیے گئے جب بھی تم اندھے ہی بنے رہو گے۔

اس کے بعد پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دینے کے لیے اس سنت اللہ کی طرف اشارہ فرمایا ہے جو اس دنیا میں جاری ہے اور جس سے ہر نبی اور ہر داعیٔ حق کو لازماً سابقہ پیش آتا ہے۔ وہ سنت اللہ یہ ہے کہ جب کسی نبی یا کسی داعیٔ حق کی دعوتِ حق بلند ہوتی ہے تو اس کی مخالفت کے لیے شیاطین انس و جن بھی لازماً اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ اس سے ایک طرف تو اہل حق کی آزمائش اور ان کے کھرے کھوٹے میں تمیز ہوتی ہے، دوسری طرف اہل باطل کو ڈھیل ملتی ہے کہ وہ اپنا پیمانہ اچھی طرح بھر لیں اور جو کمائی انھیں کرنی ہے کر لیں۔

اس کے بعد پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے اعلان کرایا ہے کہ میرے لیے تو اس قضیہ میں خدا کے سوا کسی اور کو حکم ماننے کی گنجائش نہیں ہے۔ اس نے ایک کتاب اتار کر حق اور باطل کے درمیان واضح فیصلہ کر دیا ہے۔ جو اہل کتاب ہیں وہ جانتے ہیں کہ یہ خدائی کتاب ہے۔ اب جو لوگ اس کی مخالفت کر رہے ہیں وہ شیطان کی پیروی کر رہے ہیں، اور ان کے باب میں خدا کی وہ بات پوری ہو کے رہے گی جو اس نے شیطان کے جواب میں فرمائی تھی کہ جو تیری پیروی کریں گے میں ان سب کو جہنم میں جھونک دوں گا۔

آخر میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے موقف حق پر ڈٹے رہنے کی تاکید اور معاملے کو خدا کے حوالے کرنے کی تلقین ہے ــــ اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۱۰۹-۱۱۲ وَأَقْسَمُوا بِاللَّهِ جَهْدَ أَيْمَانِهِمْ لَئِن جَاءَتْهُمْ آيَةٌ لَّيُؤْمِنُنَّ بِهَا
قُلْ إِنَّمَا الْآيَاتُ عِندَ اللَّهِ وَمَا يُشْعِرُكُمْ أَنَّهَا إِذَا جَاءَتْ
لَا يُؤْمِنُونَ ﴿۱۰۹﴾ وَنُقَلِّبُ أَفْئِدَتَهُمْ وَأَبْصَارَهُمْ كَمَا لَمْ يُؤْمِنُوا
۱۳ ع ۱۰ ۱۹ الجزء بِهِ أَوَّلَ مَرَّةٍ وَنَذَرُهُمْ فِي طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُونَ ﴿۱۱۰﴾ وَلَوْ أَنَّنَا نَزَّلْنَا
إِلَيْهِمُ الْمَلَائِكَةَ وَكَلَّمَهُمُ الْمَوْتَىٰ وَحَشَرْنَا عَلَيْهِمْ كُلَّ شَيْءٍ قُبُلًا
مَّا كَانُوا لِيُؤْمِنُوا إِلَّا أَن يَشَاءَ اللَّهُ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَهُمْ يَجْهَلُونَ ﴿۱۱۱﴾
وَكَذَٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيَاطِينَ الْإِنسِ وَالْجِنِّ يُوحِي

بَعْضُهُمْ إِلَىٰ بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُورًا ۚ وَلَوْ شَاءَ رَبُّكَ مَا
فَعَلُوهُ فَذَرْهُمْ وَمَا يَفْتَرُونَ ﴿١١٢﴾ وَلِتَصْغَىٰ إِلَيْهِ أَفْئِدَةُ الَّذِينَ
لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ وَلِيَرْضَوْهُ وَلِيَقْتَرِفُوا مَا هُمْ مُقْتَرِفُونَ ﴿١١٣﴾
أَفَغَيْرَ اللَّهِ أَبْتَغِي حَكَمًا وَهُوَ الَّذِي أَنْزَلَ إِلَيْكُمُ الْكِتَابَ
مُفَصَّلًا ۚ وَالَّذِينَ آتَيْنَاهُمُ الْكِتَابَ يَعْلَمُونَ أَنَّهُ مُنَزَّلٌ مِنْ
رَبِّكَ بِالْحَقِّ فَلَا تَكُونَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِينَ ﴿١١٤﴾ وَتَمَّتْ كَلِمَتُ
رَبِّكَ صِدْقًا وَعَدْلًا ۚ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمَاتِهِ ۚ وَهُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ﴿١١٥﴾
وَإِنْ تُطِعْ أَكْثَرَ مَنْ فِي الْأَرْضِ يُضِلُّوكَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ ۚ إِنْ
يَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ وَإِنْ هُمْ إِلَّا يَخْرُصُونَ ﴿١١٦﴾ إِنَّ رَبَّكَ هُوَ أَعْلَمُ
مَنْ يَضِلُّ عَنْ سَبِيلِهِ ۚ وَهُوَ أَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِينَ ﴿١١٧﴾

ترجمۂ آیات ۱۰۹-۱۱۷

اور وہ اللہ کی پکی قسمیں کھا کھا کر کہتے ہیں کہ اگر ان کے پاس کوئی نشانی آئی تو وہ ضرور اس پر ایمان لائیں گے۔ کہہ دو کہ نشانیاں تو اللہ ہی کے پاس ہیں۔ اور تمھیں کیا پتہ کہ جب وہ آجائے گی تو وہ ایمان نہیں لائیں گے۔ اور ہم اُن کے دلوں اور ان کی نگاہوں کو اُلٹ دیں گے جس طرح وہ پہلی بار ایمان نہیں لائے، اور ان کو ان کی سرکشی میں بھٹکتے ہوئے چھوڑ دیں گے۔ اور اگر ہم ان کی طرف فرشتے بھی اتار دیتے اور مُردے بھی ان سے باتیں کرنے لگتے اور ساری چیزیں ان کے آگے گروہ در گروہ اکٹھی کر دی جاتیں جب بھی یہ ایمان لانے والے نہ تھے الا آنکہ اللہ چاہے لیکن ان کی اکثریت بطلائے جہل ہے۔ ۱۰۸-۱۱۱

اور اسی طرح ہم نے انسانوں اور جنوں کے اشرار کو ہر نبی کا دشمن بنایا۔ وہ ایک دوسرے کو پُر فریب باتیں القا کرتے ہیں دھوکا دینے کے لیے۔ اور اگر تیرا رب چاہتا تو وہ یہ نہ کر پاتے۔ تو تم ان کو ان کی انہی افترا پردازیوں میں پڑے رہنے دو اور ایسا اس لیے ہے کہ اس کی طرف ان لوگوں کے دل جھکیں جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے اور تاکہ وہ اس کو پسند کریں اور تاکہ جو کمائی انھیں کرنی ہے وہ کر لیں۔ ۱۱۲-۱۱۳

کیا میں اللہ کے سوا کوئی اور حکم ڈھونڈوں درآنحالیکہ وہی ہے جس نے تمھاری طرف کتاب اتاری مفصّل اور جن کو ہم نے کتاب عطا کی وہ جانتے ہیں کہ یہ تیرے رب کی طرف سے اتاری گئی ہے حق کے ساتھ تو تم ہرگز شک میں پڑنے والوں میں سے نہ ہو جیو۔ اور تمھارے رب کی بات پوری ہوئی ٹھیک ٹھیک اور عدل کے ساتھ اور کوئی نہیں جو اس کی باتوں کو بدل سکے اور وہ سننے والا اور جاننے والا ہے اور اس زمین والوں میں سے اکثر ایسے ہیں کہ اگر تم نے ان کی بات مانی تو وہ تمھیں خدا کے راستہ سے گمراہ کر کے چھوڑیں گے۔ یہ محض گمان کی پیروی کرتے ہیں اور اٹکل کے تیر تکّے چلاتے ہیں۔ بے شک تیرا رب خُوب جانتا ہے ان کو جو اس کے رستے سے بھٹکے ہُوئے ہیں اور خوب جانتا ہے ان کو جو ہدایت یاب ہیں۔ ۱۱۴-۱۱۷

۱۸۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ لَئِنْ جَآءَتْهُمْ اٰيَةٌ لَّيُؤْمِنُنَّ بِهَا ۭ قُلْ اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ وَمَا يُشْعِرُكُمْ ۙ اَنَّهَآ اِذَا جَاۗءَتْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝ وَنُقَلِّبُ اَفْـِٕدَتَهُمْ وَاَبْصَارَهُمْ كَمَا لَمْ يُؤْمِنُوْا بِهٖٓ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّنَذَرُهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ۝ وَلَوْ اَنَّنَا نَزَّلْنَآ اِلَيْهِمُ الْمَلٰۗىِٕكَةَ وَكَلَّمَهُمُ الْمَوْتٰى

وَحَشَرْنَا عَلَيْهِمْ كُلَّ شَيْءٍ قُبُلًا مَّا كَانُوا لِيُؤْمِنُوا إِلَّا أَن يَشَاءَ اللَّهُ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَهُمْ يَجْهَلُونَ ○

آنحضرتؐ کے خلاف کفار کا ایک پروپیگنڈا

وَأَقْسَمُوا بِاللَّهِ جَهْدَ أَيْمَانِهِمْ لَئِن جَاءَتْهُمْ آيَةٌ لَّيُؤْمِنُنَّ بِهَا، 'جھد' کے معنی تاحدِ وسع کوشش، بھرپور جد و جہد کے ہیں۔ 'بذل جھدہ' اس نے اپنی پوری کوشش صرف کر دی۔ پورا زور لگا دیا۔ 'اقسموا باللہ جھد ایمانھم' یعنی وہ اللہ کی قسمیں کھا کھا کر پیغمبر کو اور مسلمانوں کو یقین دلاتے ہیں کہ اگر ان کی طلب کے مطابق کوئی معجزہ دکھا دیا جائے تو وہ ضرور مان لیں گے کہ یہ معجزہ خدا کی طرف سے، اس کا دکھانے والا خدا کا رسول اور اس کی پیش کی ہوئی کتاب خدا کی کتاب ہے۔ ظاہر ہے کہ اس زور شور کے ساتھ قسمیں کھا کھا کے یقین دلانے سے اصل مقصود ان کا وہ تو تھا نہیں جو وہ ظاہر کرتے تھے بلکہ یہ ان کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف ایک پراپیگنڈا تھا۔ وہ اس سے ایک طرف تو اپنے ان ہم قوموں کو مطمئن کرنا چاہتے تھے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت سے متاثر ہو رہے تھے کہ ہم نے ایک شرط بدی ہے جو نہایت معقول ہے، اگر یہ شرط محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پوری کر دیں تو ہم ایمان لانے کے لیے تیار ہیں۔ دوسری طرف وہ نیک دل مسلمانوں کے دل پر یہ اثر ڈالنا چاہتے تھے کہ جب یہ سچے رسول ہیں تو آخر اس شرط کے مان لینے میں کیا مانع ہے، کیوں نہیں اس کو مان کر میدان جیت لیتے؟

کفار کو جواب اور مسلمانوں کو تسلی سنت الٰہی کی روشنی میں

'قُلْ إِنَّمَا الْآيَاتُ عِندَ اللَّهِ وَمَا يُشْعِرُكُمْ أَنَّهَا إِذَا جَاءَتْ لَا يُؤْمِنُونَ' یہ جواب ہے ان کی بدی ہوئی شرط کا اور دیکھیے کتنا نازک موقع ہے لیکن جواب وہی دیا گیا جو بالکل صحیح جواب ہے۔ ذرا بھی اس میں اس اندیشے کا دخل نہیں ہے کہ اس کو سن کر حریف تالی پیٹ دے گا کہ یہ لو فتح ہماری رہی۔ خود پیغمبر کی زبان مبارک سے اعلان کرایا کہ جس قسم کے معجزات کا تم مطالبہ کر رہے ہو، یہ معجزات تو خدا ہی کے پاس ہیں، وہ چاہے تو ظاہر فرمائے، نہ چاہے تو نہ ظاہر فرمائے۔ اس معاملے میں مجھے کوئی اختیار نہیں۔ یہ ٹھیک ٹھیک امر واقعی کا بیان ہے۔ پیغمبرؐ کا اصلی فریضہ انذار و تبشیر ہے۔ لوگوں کی طلب کے مطابق معجزے دکھانا نہ اس کے اختیار میں ہے، نہ اس کے فرائض منصبی میں داخل ہے۔

'وَمَا يُشْعِرُكُمْ' میں ضمیر خطاب جمع کی ہے اور روئے سخن عام مسلمانوں کی طرف ہے۔ قدرتی طور پر بحث کی اس گرماگرمی کے دور میں ان کے اندر یہ شدید خواہش پیدا ہوئی ہو گی کہ جب بات اسی شرط پر آ کر ٹکی ہے کہ ان کی طلب کے مطابق کوئی معجزہ دکھا دیا گیا تو یہ مان لیں گے تو ان کو کوئی معجزہ دکھا ہی دیا جائے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تمھیں کیا معلوم کہ ان کے ایمان نہ لانے کا اصل سبب کیا ہے۔ تم سمجھتے ہو کہ ان کو کوئی معجزہ دکھا دیا جائے تو یہ مان لیں گے حالانکہ اس وقت بھی یہ نہیں مانیں گے بلکہ بدستور اپنی ضد پر اڑے ہی رہیں گے اس لیے کہ ان کے ایمان نہ لانے کی جو اصل علت ہے وہ بدستور اس معجزے کے دیکھ لینے کے بعد بھی باقی رہے گی۔

نشانیوں سے ہدایت پانے کے بارے میں سنت الٰہی

'وَنُقَلِّبُ أَفْئِدَتَهُمْ وَأَبْصَارَهُمْ كَمَا لَمْ يُؤْمِنُوا بِهِ أَوَّلَ مَرَّةٍ' یہ اس سنت اللہ کا بیان ہے جس کے

تحت کسی کو ایمان نصیب ہوتا ہے اور کوئی اس سے محروم رہتا ہے۔ اس سنت اللہ کی وضاحت اس کتاب میں مختلف مقامات میں ہو چکی ہے۔ اس کائنات میں بھی اور انسان کے اپنے وجود کے اندر بھی خالق کائنات نے اپنی جو ان گنت نشانیاں پھیلا دی ہیں جو لوگ ان پر غور کرتے اور اس غور و فکر سے جو بدیہی نتائج ان کے سامنے آتے ہیں ان کو حرزِ جاں بناتے ہیں، ان کو ایمان کی دولت نصیب ہوتی ہے۔ اس کے برعکس جو لوگ یہ تمام نشانیاں دیکھنے کے باوجود اندھے بہرے بنے اور اپنی خود پرستیوں میں مگن رہتے ہیں، قرآن اور پیغمبر کی بار بار تذکیر کے بعد بھی اپنی آنکھیں نہیں کھولتے، اللہ تعالیٰ ان کے دلوں اور ان کی آنکھوں کو الٹ دیا کرتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ صحیح فکر و نظر کی صلاحیت سے محروم ہو جایا کرتے ہیں۔ پھر بڑی سے بڑی نشانی اور بڑے سے بڑا معجزہ بھی ان پر اثر انداز نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ کا قانون یہ ہے کہ جو لوگ سیدھے دیکھنے کے بجائے الٹے دیکھتے اور سیدھی راہ اختیار کرنے کے بجائے الٹی راہ چلتے ہیں ان کے دل اور ان کی فکر بھی کج کر دی جاتی ہے۔ پھر وہ اصول کی طرح ہر چیز کو بس اپنے مخصوص زاویہ ہی سے دیکھتے ہیں۔ اسی سنت اللہ کی طرف فَلَمَّا زَاغُوْا اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ میں اشارہ فرمایا ہے۔ یہاں اسی معروف سنت اللہ کا حوالہ دیتے ہوئے فرمایا ہے کہ یہ کیسے باور کرتے ہو کہ اگر ان کو ان کی طلب کے مطابق کوئی معجزہ دکھا دیا گیا تو یہ مومن بن جائیں گے۔ آخر وہ تمام نشانیاں جو آفاق و انفس میں موجود ہیں، جن کی طرف قرآن نے انگلی اٹھا اٹھا کر اشارہ کیا اور ان کے مضمرات و دلائل واضح کیے جب ان میں سے کوئی چیز بھی ان کے دلوں اور ان کی نگاہوں کے زاویے کو درست کرنے میں کارگر نہ ہو سکی تو آخر کوئی نئی نشانی کس طرح ان کی کایا کلپ کر دے گی؟ جو حجاب آج ہے وہ کل کس طرح دُور ہو جائے گا اور جو اندھا پن آج دیکھنے سے مانع ہے وہ اس نشانی کے ظہور کے وقت کہاں چلا جائے گا؟ جس طرح آج تک وہ ساری نشانیوں کو جھٹلا رہے ہیں اسی طرح اس نشانی کو بھی جھٹلا دیں گے اور جو قلب ماہیت ان کے دلوں اور ان کی آنکھوں کی آج دیکھتے ہو وہ قلب ماہیت اس وقت بھی اپنا عمل کرے گی۔ یہ قلب ماہیت چونکہ اللہ تعالیٰ کی مقرر کردہ سنت کے نتیجہ کے طور پر ظہور میں آتی ہے اس وجہ سے جس طرح بعض مواقع میں فعل 'اضلال' کو اپنی طرف منسوب فرمایا ہے اسی طرح یہاں تقلیب قلوب و ابصار کو اپنی طرف منسوب فرمایا۔ 'بہٖ' میں ضمیر کا مرجع قرآن ہے۔

'وَنَذَرُهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ' اس سے معلوم ہوا کہ اصل چیز جو ان کے ایمان نہ لانے کا سبب ہے وہ ان کا طغیان اور ان کی سرکشی ہے۔ وہ اللہ کی نعمتوں کو اپنی قوت و قابلیت کا کرشمہ سمجھے بیٹھے ہیں اور پیغمبر کی دعوت ان کے غرورِ نفس اور ان کے پندارِ سیادت پر شاق گزر رہی ہے۔ ان کے اس غرور کی سزا ان کو یہ ملی ہے کہ ان کے دل اور ان کی آنکھیں خدا نے اُلٹ دی ہیں اور ان کو اسی غرور میں بھٹکنے کے لیے چھوڑ رہا ہے۔

وَلَوْ اَنَّنَا نَزَّلْنَآ اِلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةَ وَكَلَّمَهُمُ الْمَوْتٰى وَحَشَرْنَا عَلَيْهِمْ كُلَّ شَيْءٍ قُبُلًا مَّا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْٓا اِلَّآ

مصدر بھی ہو سکتا ہے جس کے معنی کسی شے کو سامنے سے آتے دیکھنے کے ہیں اور 'قبیل' کی جمع بھی ہو سکتا ہے جس کے معنی گروہ اور جماعت کے ہیں۔ قرآن میں ان دونوں معنوں کے لیے نظیر موجود ہے۔ پہلے معنی کے لیے نظیر سورہ کہف میں ہے۔ وَمَا مَنَعَ النَّاسَ اَنْ يُّؤْمِنُوْٓا اِذْ جَآءَهُمُ الْهُدٰى وَيَسْتَغْفِرُوْا رَبَّهُمْ اِلَّآ اَنْ تَاْتِيَهُمْ سُنَّةُ الْاَوَّلِيْنَ اَوْ يَاْتِيَهُمُ الْعَذَابُ قُبُلًا ۵۵۔ (ہدایت آچکنے کے بعد لوگوں کو ایمان لانے اور اپنے رب سے مغفرت چاہنے سے نہیں روکا مگر اس چیز نے کہ ان کے بارے میں بھی خدا کی وہی سنت ظاہر ہو جائے جو اگلوں کے بارے میں ظاہر ہو چکی ہے یا یہ کہ ان پر عذاب سامنے سے در آتا ہوا آ جائے) دوسرے معنی کے لیے نظیر سورۂ بنی اسرائیل میں ہے اَوْ تَاْتِيَ بِاللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ قَبِيْلًا ۹۲ (یا تم لاؤ اللہ کو اور فرشتوں کو گروہ در گروہ) زیر بحث آیت میں اگرچہ بنتے دونوں معنی ہیں لیکن میں نے 'حشرنا' اور 'کل شیء' کی رعایت سے ترجمے میں ترجیح دوسرے معنی کو دی ہے۔

ایمان کے لیے اصلی حجاب

یہ اوپر والے مضمون ہی کی تاکید ہے۔ فرمایا کہ اگر ہم ان پر فرشتے اتار دیتے، جیسا کہ یہ کہتے ہیں، یا قبروں سے مردے نکل کر ان سے باتیں کرنے لگتے، جیسا کہ یہ مطالبہ کرتے ہیں، یا پردۂ غیب کی ساری ہی چیزیں ان کے سامنے گروہ در گروہ لا کھڑی کرتے جب بھی یہ ایمان لانے والے نہ تھے اس لیے کہ وہ طغیان جس نے ان کی آنکھوں پر پٹی باندھ رکھی ہے جب بھی باقی رہتا۔

ایمان کے باب میں سنت الٰہی

اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ يَجْهَلُوْنَ ان کے ایمان لانے کی شکل صرف یہ ہے کہ اللہ یہ چاہے کہ ان کو ایمان و ہدایت بخشے اور اللہ کا کوئی چاہنا بھی اس کی ٹھہرائی ہوئی اور اس کی پسند کی ہوئی حکمت کے خلاف نہیں ہوتا۔ وہ ایمان و اسلام کسی کے دل میں زبردستی نہیں ٹھونستا۔ یہ نعمت وہ ان کو بخشتا ہے جو اس کے قدر دان ہوتے ہیں اور اس کے لیے اپنی وہ صلاحیتیں استعمال کرتے ہیں جو خدا نے ان کے اپنے اندر ودیعت فرمائی ہیں۔ جب وہ ان کو استعمال کرتے ہیں تو اللہ کی طرف سے ان کو مزید توفیق ارزانی ہوتی ہے۔ رہے یہ جو معجزے دیکھ کر ایمان لانا چاہتے ہیں تو یہ اپنی خواہشات و جذبات کے غلبہ سے اندھے ہو رہے ہیں۔ ان کے لیے یہ راہ کیسے کھل سکتی ہے؟

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ يُوْحِيْ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْرًا ۭ وَلَوْ شَاۗءَ رَبُّكَ مَا فَعَلُوْهُ فَذَرْهُمْ وَمَا يَفْتَرُوْنَ ۱۱۲ وَلِتَصْغٰٓى اِلَيْهِ اَفْـِٕدَةُ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ وَلِيَرْضَوْهُ وَلِيَقْتَرِفُوْا مَا هُمْ مُّقْتَرِفُوْنَ (۱۱۲-۱۱۳)

اللہ تعالیٰ کی سنت استدراج

'وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ' کا اشارہ اس مخالفانہ شورش کی طرف ہے جو اس دور میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو زچ کرنے کے لیے قریش کے لیڈروں اور ان کے ہمنواؤں نے برپا کر رکھی تھی۔ فرمایا کہ یہ نہ سمجھو کہ اس صورت حال سے تنہا تمہی کو سابقہ پیش آیا ہے۔ تم سے پہلے جو انبیا گزرے ہیں ان کو بھی اپنے اپنے زمانوں کے شیاطین جن و انس کے ہاتھوں یہی دکھ جھیلنے پڑے ہیں۔

یہ اللہ کی سنت ابتلا ہے جس سے اس کے تمام نبیوں اور رسولوں کو گزرنا پڑا ہے۔ اسی سے راست بازوں کی راست بازی کا امتحان ہوتا ہے اور ان کے جوہر نکھرتے ہیں اور اسی سے اہلِ باطل کو وہ مہلت ملتی ہے جس میں ان کے اندر کا فساد ظہور میں آتا ہے اور وہ اپنے اوپر اللہ کی حجت تمام کرتے ہیں۔ اسی مضمون کو آگے اسی سورہ میں یوں ادا فرمایا ہے۔ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا فِيْ كُلِّ قَرْيَةٍ اَكٰبِرَ مُجْرِمِيْهَا لِيَمْكُرُوْا فِيْهَا ۭ وَمَا يَمْكُرُوْنَ اِلَّا بِاَنْفُسِهِمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ۱۲۳ (اور اسی طرح ہم نے ہر بستی کے اکابر مجرمین کو مہلت دی کہ وہ جو چالیں اس میں چلنا چاہتے ہیں چل لیں، اور وہ نہیں چلتے تھے کوئی چال مگر اپنے ہی ساتھ لیکن ان کو اس کا احساس نہیں ہوا) اہل ایمان کی یہ آزمائش اور اہلِ کفر کے لیے یہ ڈھیل چونکہ اللہ تعالیٰ کے قانونِ ابتلا کے تحت ظہور میں آتی ہے اور انسان کو اس نے اختیار و ارادہ کی جو آزادی بخشی ہے یہ اسی کا ایک لازمی حصہ ہے اس وجہ سے اس کو اللہ تعالیٰ نے منسوب اپنی طرف فرمایا ہے۔

بدعات کا فریب

يُوْحِيْ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْرًا ۔ زُخرف کے معنی ملمع کی ہوئی بات، جھوٹی اور باطل چیز جس پر حق کا رنگ چڑھانے کی کوشش کی گئی ہو۔ یہ صفت ہے جو اپنے موصوف کی طرف مضاف ہوگئی ہے۔ اس سے مراد وہ مشرکانہ بدعات ہیں جو ہر دور کے شیاطین جن وانس نے باہمی گٹھ جوڑ سے ایجاد کیں، پھر ان کے اوپر شریعت الٰہی کا لیبل لگا کر ان کو رواج دیا اور جب انبیاء و مصلحین نے ان کی اصلاح کی دعوت دی تو ان کی مخالفت میں بحث و جدال کا بازار گرم کیا۔ چنانچہ اس موقع پر بھی یہی ہوا جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے توحید کی دعوت دی اور ان کے بتوں اور مشرکانہ عقائد کے تحت ان کی حرام ٹھہرائی ہوئی چیزوں کی بے حقیقتی واضح فرمائی تو شرک کے یہ ائمہ آستینیں چڑھا چڑھا کے لڑنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے اور جس پر ان کا زور چلا اس کو اپنے دامِ فریب میں پھنسانے اور عوام کو یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہم کو ہمارے باپ دادا کے دین اور ابراہیمؑ کی ملت سے ہٹا رہے ہیں۔

یہ بات محتاج وضاحت نہیں ہے کہ شرک اور باطل کا جتنا نظام بھی ہے وہ تمام تر، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، شیاطینِ جن وانس کے باہمی گٹھ جوڑ سے قائم ہے۔ یہ بات تفصیل سے اپنے مقام میں واضح ہو چکی ہے کہ شیطان کو سب سے زیادہ کد عقیدۂ توحید سے ہے اس وجہ سے وہ اس پر ضرب لگانے کے لیے برابر نت نئے حربے اور نئے نئے ڈھنگ ایجاد کرتا رہتا ہے اور انسانوں میں سے جو اس کے ہتھے چڑھ جاتے ہیں ان کے اندر غلط عقائد القا کر کے ان کے واسطے سے خلقِ خدا کو گمراہ کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ آگے اسی بات کی طرف اشارہ فرمایا ہے وَاِنَّ الشَّيٰطِيْنَ لَيُوْحُوْنَ اِلٰٓى اَوْلِيٰۗىِٕهِمْ لِيُجَادِلُوْكُمْ ۚ وَاِنْ اَطَعْتُمُوْهُمْ اِنَّكُمْ لَمُشْرِكُوْنَ ۱۲۱ (انعام) (اور شیاطین اپنے ایجنٹوں کو القا کرتے ہیں تاکہ وہ تم سے جھگڑیں اور اگر تم ان کی بات مانو گے تو تم بھی مشرکوں میں سے ہو جاؤ گے) اس گٹھ جوڑ کی مزید وضاحت آگے کی ایک اور آیت سے بھی ہو رہی ہے۔ فرمایا۔ يَوْمَ يَحْشُرُهُمْ جَمِيْعًا ۚ يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ قَدِ اسْتَكْثَرْتُمْ مِّنَ الْاِنْسِ ۚ وَقَالَ اَوْلِيٰۗؤُهُمْ مِّنَ الْاِنْسِ رَبَّنَا اسْتَمْتَعَ

بَعْضُنَا بِبَعْضٍ وَّبَلَغْنَآ اَجَلَنَا الَّذِیْٓ اَجَّلْتَ لَنَا (۱۲۸- انعام) (اور جس دن خدا ان سب کو جمع کرے گا اور کہے گا اے جنوں کے گروہ تم نے تو انسانوں میں سے بہتوں کو ہتھیا لیا اور جو انسانوں میں سے ان کے ساتھی بنے ہوں گے وہ بولیں گے کہ ہم میں سے ہر ایک نے ایک دوسرے کو استعمال کیا یہاں تک کہ ہم پہنچ گئے اس مدت کو جو تو نے ہمارے لیے ٹھہرائی ہوئی تھی)

اللہ تعالیٰ کا قانونِ امتحان و آزمائش اور اس کی حکمت

وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ مَا فَعَلُوْهُ فَذَرْهُمْ وَمَا يَفْتَرُوْنَ مطلب یہ ہے کہ یہ جو کچھ ہو رہا ہے خدا کی مشیت اور اس کے قانونِ امتحان و آزمائش کے تحت ہو رہا ہے۔ اس نے انسانوں اور جنوں کو نیکی اور بدی دونوں میں سے کسی کو اختیار کرنے کی آزادی بخشی ہے۔ اگر وہ سب کو نیکی ہی کی راہ پر چلانا چاہتا تو یہ بھی کر سکتا تھا لیکن اس کی حکمت نے یہی پسند فرمایا کہ وہ اس معاملے میں جبر کے بجائے لوگوں کو اختیار و انتخاب کی آزادی دے کر ان کا امتحان کرے اور دیکھے کہ کون خدا کی راہ اختیار کرتا ہے اور کون شیطان کی۔ اس قانون کے تحت باطل کے علمبرداروں، شیطان اور اس کے ایجنٹوں کو بھی، اس حیاتِ چند روزہ میں مہلت ملی ہوئی ہے کہ وہ اپنی اس انتخاب کی ہوئی راہ پر چلیں۔ تو تم اپنی راہ چلو اور لوگوں کو اسی راہ کی دعوت دو اور ان لوگوں کو جو تمھاری بات سننا نہیں چاہتے ان کی من گھڑت بدعات میں پڑے رہنے دو۔ یہ اپنا انجام خود دیکھ لیں گے۔ لفظ 'افتراء' پر ہم ایک سے زیادہ مقامات میں بحث کر کے واضح کر چکے ہیں کہ قرآن میں اس سے شرک اور مشرکانہ بدعات مراد ہوتی ہیں۔

وَلِتَصْغٰٓى اِلَيْهِ اَفْـِٕدَةُ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ وَلِيَرْضَوْهُ وَلِيَقْتَرِفُوْا مَا هُمْ مُّقْتَرِفُوْنَ۝ اس کا عطف اس مفہوم پر ہے جو اوپر والے جملے سے نکلتا ہے۔ یعنی ہم نے شیاطین جن و انس کو انبیاء و صالحین کی مخالفت اور بدعات و خرافات کے القا کی یہ مہلت جو اس دنیا میں دی ہے یہ اس لیے دی ہے کہ اس سے ایک طرف حق پرستوں کی حق پرستی کا امتحان ہوتا ہے دوسری طرف باطل پرستوں کو ڈھیل ملتی ہے اور وہ ان شیاطین و اشرار کے ہاتھوں اپنا من بھاتا کھاجا پا کر اس کی طرف راغب ہوتے ہیں، اس کو پسند کرتے ہیں اور اس دنیا میں جو کمائی انھیں کرنی ہے وہ کر لیتے ہیں۔ یہ ڈھیل اس اختیار کا لازمی نتیجہ ہے جو انسان کو بخشا گیا ہے اس وجہ سے یہ سنتِ الٰہی کے تحت ہے۔ ان لوگوں کی صفت یہاں اَلَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ بتائی ہے جس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ شیاطین و اشرار کی یہ دعوت انھی لوگوں کو اپیل کرتی ہے جو آخرت کے اعتقاد سے خالی ہوتے ہیں۔ ان کو مطلوب صرف یہ دنیا اور اس کا عیش ہوتا ہے اور اس کی سند ان شیاطین کے ہاتھوں ان کو مل جاتی ہے۔ 'اقتراف' کے معنی کمائی کرنے کے آتے ہیں۔ قرآن میں یہ اچھے اور برے دونوں معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ یہاں بری کمائی کرنے کے معنی میں ہے۔

اَفَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْتَغِيْ حَكَمًا وَّهُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ اِلَيْكُمُ الْكِتٰبَ مُفَصَّلًا ؕ وَالَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْلَمُوْنَ اَنَّهٗ مُنَزَّلٌ مِّنْ رَّبِّكَ بِالْحَقِّ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ۝ وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا

وَّعَدْلًا ۚ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ ۚ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝ وَاِنْ تُطِعْ اَكْثَرَ مَنْ فِي الْاَرْضِ يُضِلُّوْكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ ۝ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ مَنْ يَّضِلُّ عَنْ سَبِيْلِهٖ ۚ وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ (۱۱۴-۱۱۷)

اصل حکم اللہ اور اس کی کتاب ہے

'اَفَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْتَغِيْ حَكَمًا وَّهُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ اِلَيْكُمُ الْكِتٰبَ مُفَصَّلًا' یہ مشرکین کے مجادلہ کا پیغمبر کی طرف سے جواب ہے کہ تم مجھ سے شرک و توحید اور حلال و حرام کے بارے میں جھگڑ رہے ہو۔ سوال یہ ہے کہ اس جھگڑے میں کہ خدا کی خدائی میں کچھ اور بھی شریک ہیں یا وہی تنہا حکمران ہے، اس نے کیا چیزیں حرام ٹھہرائی ہیں، کیا جائز رکھی ہیں، آخر حکم بننے کا حق کس کو حاصل ہے؟ خدا ہی کو یا کسی اور کو؟ اگر خدا ہی کو یہ حق حاصل ہے اور لاریب اسی کو حاصل ہے تو میرے لیے یہ بات کس طرح جائز ہے کہ میں اس کے سوا کسی اور کو اس معاملے میں حکم مانوں جب کہ اس نے اس جھگڑے کے چکانے کے لیے ایک کتاب بھی تمھاری طرف اتاری ہے جس میں تفصیل کے ساتھ اس نے ہر چیز کا فیصلہ فرما دیا ہے۔ اب ایک طرف یہ مفصل خدائی کتاب ہے، دوسری طرف تمھاری بے سند بدعات ہیں، ان میں سے کس کی بات مانی جانے کے لائق ہے۔

صالحین اہل کتاب کی شہادت

'وَالَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْلَمُوْنَ اَنَّهٗ مُنَزَّلٌ مِّنْ رَّبِّكَ بِالْحَقِّ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ'، اس سے میرے نزدیک مراد، جیسا کہ بقرہ ۱۴۶ اور انعام ۲۰ کے تحت واضح کر چکا ہوں، صالحین اہل کتاب ہیں اور یہ بات بطور ایک شہادت حق کے نقل ہوئی ہے کہ یہ جہلا اگر اس کتاب کے مخالف ہیں تو ان کی پروا نہ کرو جو سچے اہل علم اور حق پسند حامل کتاب ہیں وہ جانتے ہیں کہ یہ خدا کی طرف سے اتری ہے اور یہ حق کے ساتھ اتری ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے یہ چاہا ہے کہ اس کے ذریعہ سے حق و باطل کے درمیان فیصلہ فرما دے۔ 'فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ' میں خطاب باعتبار الفاظ اگرچہ آنحضرتؐ سے ہے لیکن ہم ایک سے زیادہ مقامات میں واضح کر چکے ہیں کہ اس طرح کے مواقع میں روئے سخن دوسروں کی طرف ہوتا ہے۔ صالحین اہل کتاب کی اس شہادت کا ذکر سورۂ قصص میں بھی ہے۔ 'اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِهٖ هُمْ بِهٖ يُؤْمِنُوْنَ ۝ وَاِذَا يُتْلٰى عَلَيْهِمْ قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِهٖٓ اِنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّنَآ اِنَّا كُنَّا مِنْ قَبْلِهٖ مُسْلِمِيْنَ (۵۲-۵۳) اور جن کو ہم نے اس سے پہلے کتاب عطا فرمائی وہ اس پر ایمان لاتے ہیں اور جب یہ ان کو پڑھ کر سنائی جاتی ہے وہ کہتے ہیں ہم اس پر ایمان لائے، بے شک یہ حق ہے ہمارے رب کی طرف سے، ہم پہلے سے مسلم ہیں)' یہ نکتہ یہاں ملحوظ رہے کہ جب کوئی حقیقت اول اول بگڑی ہوئی خلق کے سامنے پیش کی جاتی ہے تو یہ نہیں ہوتا کہ سب لوگ احسنت و مرحبا کہتے ہوئے اس کے خیر مقدم کے لیے اٹھ کھڑے ہوں بلکہ اس کے برعکس اکثریت اس کی مخالفت کے درپے ہو جاتی ہے۔ سوسائٹی کے لیڈر اور قوم کے اشرار تو اس لیے اس کی مخالفت کرتے ہیں کہ اس سے ان کو اپنا مفاد خطرے میں نظر آتا ہے، رہے عوام تو وہ اپنے رسوم و رواج اور اپنے طریقۂ آبا کے بندے ہوتے ہیں اس وجہ سے ہر وہ بات ان کو بری لگتی ہے جو ان کی مالوفات کے خلاف ہو اگرچہ وہ کتنی ہی بڑی حقیقت ہو اور اپنی تائید و تصدیق

میں اپنی پشت پر کتنی ہی واضح حجتیں رکھتی ہو۔ اکثریت کا یہ رویہ بسا اوقات ان لوگوں کو بھی اس حقیقت سے متعلق تذبذب میں ڈال دیتا ہے جو اگرچہ نیک نیت ہوتے ہیں لیکن ابھی ان کی فکر و نظر اتنی پختہ نہیں ہوئی ہوتی ہے کہ مخالفت کی آندھیوں اور اکثریت کے طوفانوں کا مقابلہ کر سکے۔ ایسے ہی لوگوں کی رہنمائی اور دلداری کے لیے اس آیت میں اشارۃً اور آگے والی آیت میں تصریحاً یہ بات بتائی گئی ہے کہ کسی صداقت کی صداقت خود اس کی اپنی کسوٹی پر جانچی جاتی ہے اور اگر اس کے حق میں خارجی شہادت ہی مطلوب ہو تو یہ کافی ہے کہ سنجیدہ، ذی علم اور صاحب کردار لوگ اس کے حق میں شہادت دیں اگرچہ ان کی تعداد کتنی ہی کم ہو۔ سقراط کے متعلق مشہور ہے کہ اس کے بعض ناصحوں نے اس سے کہا کہ تم دیکھ نہیں رہے ہو کہ سارا ایتھنز تمھارے خیالات سے برہم ہے، تم کو ان کی کچھ پروا نہیں ہے؟ اس نے بڑے اطمینان سے جواب دیا کہ مجھے صرف اس ایک انسان کی پروا ہے جو دانش مند ہو۔ اکثریت و اقلیت کی یہ بحث آگے آ رہی ہے۔ یہاں یہ اشارہ کافی ہے۔

ایک سنتِ الٰہی کا ظہور

وَتَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا ۚ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ ۚ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ یہ اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ آج یہ تم تمام شیاطین جن و انس کو جو اپنی اور اپنی دعوت کی مخالفت میں متحد پا رہے ہو تو یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ یہ ٹھیک ٹھیک وہی صورتِ حال ہے جو شیطان اور آدم کے ماجرے میں بیان ہو چکی ہے۔ شیطان نے اولادِ آدم کو گمراہ کرنے کے لیے مہلت مانگی خدا نے اس کو مہلت دی، شیطان نے دھمکی دی کہ میں ذریتِ آدم کی اکثریت کو شرک و بت پرستی میں مبتلا کر کے چھوڑوں گا۔ خدا نے فرمایا کہ اگر تو ایسا کرے گا تو میں تجھ کو اور تیرے سارے پیروؤں کو جہنم میں بھر دوں گا۔ بقرہ کی آیت ۱۶۸ کے تحت اس مضمون کی وضاحت ہو چکی ہے۔ یہاں اس کا حوالہ دینے سے مقصود یہ ہے کہ ان لوگوں نے شیطان کے پھندے میں پھنس کر اپنے باب میں اس کی پیشین گوئی پوری کر دی ہے اور اللہ نے ایسے لوگوں کے باب میں شیطان کو اپنا جو فیصلہ سنایا تھا وہ پورا ہو گیا اور یہ فیصلہ سچائی اور عدل دونوں معیاروں پر پورا ہے۔ خدا نے جو بات فرمائی وہ سچی بھی ہے اور مبنی بر عدل بھی۔ اس لیے کہ خدا نے ان پر اپنی حجت پوری کر دی ہے۔ اس کے باوجود اگر یہ ہدایت الٰہی کی جگہ القائے شیطانی ہی کی پیروی پر بضد ہیں تو یہ اسی انجام کے سزاوار ہیں جس کی خدا نے ان کو خبر دی ہے۔ خدا کے فیصلے اس کی مقررہ سنت کے تحت ہوتے ہیں۔ ان کو کوئی تبدیل نہیں کر سکتا۔ اللہ سمیع و علیم ہے، نہ اس کی کوئی بات بے خبری پر مبنی ہوتی، نہ اس میں کسی خطا یا ناانصافی کا امکان ہے۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ یہ بات مشرکین کے لیے بطورِ تہدید و وعید اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے بطورِ تسلی ارشاد ہوئی ہے لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ پر اسی انعام کی آیت ۳۴ کے تحت جو کچھ لکھا گیا ہے اس پر بھی ایک نظر ڈال لیجیے۔

اکثریت کا غوغا اس کے حق ہونے کی دلیل نہیں ہے

وَاِنْ تُطِعْ اَكْثَرَ مَنْ فِي الْاَرْضِ يُضِلُّوْكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اوپر آیت ۱۱۵ میں جس حقیقت کی طرف اشارہ ہوا تھا، یہ اس کی تصریح ہے اور خطاب اگرچہ بصیغۂ واحد ہے لیکن معناً خطاب عام ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس وقت جو غوغائے عام دعوتِ توحید کی مخالفت اور مشرکانہ بدعات کی حمایت میں برپا ہے اس کی مطلق پروا

نہ کرو۔ یہ کسی دلیل و سند اور کسی علم و حجت پر مبنی نہیں ہے بلکہ تمام تر ظن و گمان کی پیروی پر مبنی ہے۔ یہ محض اٹکل کے تیر تکے چلائے جا رہے ہیں۔ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ، یہ دعویٰ جو کیا جاتا ہے کہ یہ جس طریقہ کی پیروی کر رہے ہیں یہ خدا کا بتایا ہوا اور ابراہیمؑ کی وراثت ہے محض ان کا افترا ہے۔ اللہ اور ملتِ ابراہیمؑ سے اس کو کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ مغالطہ بھی کسی کو نہیں ہونا چاہیے کہ اکثریت اس فتنہ کے ساتھ ہے۔ وہ اکثریت جو علم سے عاری ہو اور محض گمان کے پیچھے بھاگ رہی ہو اس کی بات جو لوگ مانیں گے وہ خدا کی راہ سے بھٹک کے رہیں گے۔ اکثریت کا غوغا اس کے حق ہونے کی دلیل نہیں ہے۔ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ مَنْ يَّضِلُّ عَنْ سَبِيْلِهٖ وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ، یہ خطاب بھی عام ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس بھیڑ کو دیکھ کر کسی غلط فہمی میں مبتلا نہ ہو۔ یہ پتہ اللہ کو ہے کہ کون اس کی راہ سے بھٹکے ہوئے ہیں اور کون ہدایت یاب ہیں۔ پس جن کو خدا راہ یاب بتا رہا ہے ان کی راہ اختیار کرو اور جن کو خدا گمراہ قرار دے رہا ہے ان کی روش سے بچو۔ یہ ہدایت یافتہ گروہ کے لیے بشارت کے ساتھ ساتھ ان لوگوں کے لیے تہدید بھی ہے جو گمراہی کی راہ پر چل رہے ہیں اس لیے کہ جب اللہ ان دونوں گروہوں سے اچھی طرح باخبر ہے تو ان کے ساتھ معاملہ بھی اپنے علم کے مطابق ہی کرے گا۔ ان لوگوں کے دعوے کچھ کام نہیں آئیں گے جو ہیں تو گمراہ لیکن علم بردار بنے ہوئے ہیں ہدایت کے۔

۱۹۔ آگے کا مضمون ـــــ آیات ۱۱۸-۱۴۰:

آگے ان مشرکانہ بدعات کی تردید آ رہی ہے جو مشرکین نے اختیار تو کی تھیں شیطان کے القا سے لیکن دعویٰ یہ کرتے تھے کہ یہ حضرت ابراہیمؑ سے ان کو وراثت میں ملی ہیں۔ قرآن نے ان بدعات کو بے سند اور بے بنیاد قرار دے کر ان کے تحت حرام کردہ چیزیں جائز قرار دے دیں تو انھوں نے یہ ہنگامہ کھڑا کیا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے وہ چیزیں بھی جائز کر دی ہیں جو ہمارے بزرگوں ـــ ابراہیمؑ و اسمٰعیلؑ کے زمانے سے حرام چلی آ رہی تھیں۔ یہ پروپیگنڈا قدرتی طور پر کمزور طبائع پر اثر انداز ہوا۔ ہم بقرہ کی تفسیر میں آیات ۱۶۸-۱۷۱ کے تحت تفصیل سے بیان کر آئے ہیں کہ کھانے پینے کی چیزوں کے معاملے میں اول تو طبیعتیں یوں ہی بڑی حساس ہوتی ہیں اور اگر ان کا تعلق مشرکانہ مذہبی روایات سے ہو تو یہ حس تیز سے تیز تر ہو جاتی ہے۔ اسی وجہ سے قرآن نے یہاں بڑی تفصیل کے ساتھ ان توہمات کی تردید بھی فرمائی اور اصل ملتِ ابراہیم کی وضاحت بھی فرمائی۔ یہ مضمون سورہ کے آخر تک چلا جائے گا۔ بیچ بیچ میں بعض باتیں بطور التفات یا کسی ذیلی شبہ کی تردید و توضیح کے طور پر بھی آئی ہیں لیکن سب بالواسطہ یا بلاواسطہ اسی بحث سے تعلق رکھنے والی ہیں۔ ان کا موقع و محل سلسلہ بیان سے خود واضح ہو جائے گا ـــ اس روشنی میں آگے کی آیات کی تلاوت فرمائیے۔

فَكُلُوْا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ اِنْ كُنْتُمْ بِاٰيٰتِهٖ مُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۱۸﴾ وَمَا آیات ۱۱۸-۱۴۰

لَكُمْ اَلَّا تَاْكُلُوْا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ وَقَدْ فَصَّلَ لَكُمْ
مَّا حَرَّمَ عَلَيْكُمْ اِلَّا مَا اضْطُرِرْتُمْ اِلَيْهِ ؕ وَاِنَّ كَثِيْرًا لَّيُضِلُّوْنَ
بِاَهْوَآئِهِمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ ؕ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِالْمُعْتَدِيْنَ ﴿١١٩﴾ وَذَرُوْا
ظَاهِرَ الْاِثْمِ وَبَاطِنَهٗ ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْسِبُوْنَ الْاِثْمَ سَيُجْزَوْنَ
بِمَا كَانُوْا يَقْتَرِفُوْنَ ﴿١٢٠﴾ وَلَا تَاْكُلُوْا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ
اللّٰهِ عَلَيْهِ وَاِنَّهٗ لَفِسْقٌ ؕ وَاِنَّ الشَّيٰطِيْنَ لَيُوْحُوْنَ اِلٰۤى اَوْلِيٰٓـِٕهِمْ
لِيُجَادِلُوْكُمْ ۚ وَاِنْ اَطَعْتُمُوْهُمْ اِنَّكُمْ لَمُشْرِكُوْنَ ﴿١٢١﴾ اَوَمَنْ ع ١٤ ١١ ١
كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنٰهُ وَجَعَلْنَا لَهٗ نُوْرًا يَّمْشِيْ بِهٖ فِى
النَّاسِ كَمَنْ مَّثَلُهٗ فِى الظُّلُمٰتِ لَيْسَ بِخَارِجٍ مِّنْهَا ؕ كَذٰلِكَ
زُيِّنَ لِلْكٰفِرِيْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿١٢٢﴾ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا فِىْ كُلِّ
قَرْيَةٍ اَكٰبِرَ مُجْرِمِيْهَا لِيَمْكُرُوْا فِيْهَا ؕ وَمَا يَمْكُرُوْنَ اِلَّا بِاَنْفُسِهِمْ
وَمَا يَشْعُرُوْنَ ﴿١٢٣﴾ وَاِذَا جَآءَتْهُمْ اٰيَةٌ قَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ حَتّٰى
نُؤْتٰى مِثْلَ مَاۤ اُوْتِىَ رُسُلُ اللّٰهِ ؔۘ اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ وقف منزل وقف لازم
رِسَالَتَهٗ ؕ سَيُصِيْبُ الَّذِيْنَ اَجْرَمُوْا صَغَارٌ عِنْدَ اللّٰهِ وَعَذَابٌ
شَدِيْدٌۢ بِمَا كَانُوْا يَمْكُرُوْنَ ﴿١٢٤﴾ فَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ يَّهْدِيَهٗ
يَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ ۚ وَمَنْ يُّرِدْ اَنْ يُّضِلَّهٗ يَجْعَلْ صَدْرَهٗ
ضَيِّقًا حَرَجًا كَاَنَّمَا يَصَّعَّدُ فِى السَّمَآءِ ؕ كَذٰلِكَ يَجْعَلُ اللّٰهُ
الرِّجْسَ عَلَى الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿١٢٥﴾ وَهٰذَا صِرَاطُ رَبِّكَ مُسْتَقِيْمًا

قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّذَّكَّرُوْنَ ﴿١٢٦﴾ لَهُمْ دَارُ السَّلٰمِ عِنْدَ
رَبِّهِمْ وَهُوَ وَلِيُّهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿١٢٧﴾ وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ
جَمِيْعًا ۚ يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ قَدِ اسْتَكْثَرْتُمْ مِّنَ الْاِنْسِ ۚ وَقَالَ
اَوْلِيٰٓـُٔوْهُمْ مِّنَ الْاِنْسِ رَبَّنَا اسْتَمْتَعَ بَعْضُنَا بِبَعْضٍ وَّبَلَغْنَآ
اَجَلَنَا الَّذِيْٓ اَجَّلْتَ لَنَا ۭ قَالَ النَّارُ مَثْوٰىكُمْ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اِلَّا
مَا شَاۗءَ اللّٰهُ ۭ اِنَّ رَبَّكَ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ ﴿١٢٨﴾ وَكَذٰلِكَ نُوَلِّيْ بَعْضَ
الظّٰلِمِيْنَ بَعْضًۢا بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿١٢٩﴾ يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ ع ١٥ ٨ ٢
اَلَمْ يَاْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَقُصُّوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِيْ وَيُنْذِرُوْنَكُمْ
لِقَاۗءَ يَوْمِكُمْ هٰذَا ۭ قَالُوْا شَهِدْنَا عَلٰٓى اَنْفُسِنَا وَغَرَّتْهُمُ الْحَيٰوةُ
الدُّنْيَا وَشَهِدُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ اَنَّهُمْ كَانُوْا كٰفِرِيْنَ ﴿١٣٠﴾ ذٰلِكَ
اَنْ لَّمْ يَكُنْ رَّبُّكَ مُهْلِكَ الْقُرٰى بِظُلْمٍ وَّاَهْلُهَا غٰفِلُوْنَ ﴿١٣١﴾ وَلِكُلٍّ
دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا ۭ وَمَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا يَعْمَلُوْنَ ﴿١٣٢﴾ وَرَبُّكَ
الْغَنِيُّ ذُو الرَّحْمَةِ ۭ اِنْ يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ وَيَسْتَخْلِفْ مِنْۢ بَعْدِكُمْ
مَّا يَشَاۗءُ كَمَآ اَنْشَاَكُمْ مِّنْ ذُرِّيَّةِ قَوْمٍ اٰخَرِيْنَ ﴿١٣٣﴾ اِنَّ مَا
تُوْعَدُوْنَ لَاٰتٍ ۙ وَّمَآ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ ﴿١٣٤﴾ قُلْ يٰقَوْمِ اعْمَلُوْا
عَلٰي مَكَانَتِكُمْ اِنِّىْ عَامِلٌ ۚ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۙ مَنْ تَكُوْنُ لَهٗ عَاقِبَةُ
الدَّارِ ۭ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿١٣٥﴾ وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ مِمَّا ذَرَاَ مِنَ
الْحَرْثِ وَالْاَنْعَامِ نَصِيْبًا فَقَالُوْا هٰذَا لِلّٰهِ بِزَعْمِهِمْ وَهٰذَا

لِشُرَكَآئِنَا فَمَا كَانَ لِشُرَكَآئِهِمْ فَلَا يَصِلُ إِلَى اللّٰهِ ۖ وَمَا
كَانَ لِلّٰهِ فَهُوَ يَصِلُ إِلٰى شُرَكَآئِهِمْ ۗ سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ ﴿١٣٦﴾ وَ
كَذٰلِكَ زَيَّنَ لِكَثِيْرٍ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ قَتْلَ اَوْلَادِهِمْ شُرَكَآؤُهُمْ
لِيُرْدُوْهُمْ وَلِيَلْبِسُوْا عَلَيْهِمْ دِيْنَهُمْ ۖ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا فَعَلُوْهُ
فَذَرْهُمْ وَمَا يَفْتَرُوْنَ ﴿١٣٧﴾ وَقَالُوْا هٰذِهٖٓ اَنْعَامٌ وَّحَرْثٌ حِجْرٌ ۖ
لَّا يَطْعَمُهَآ اِلَّا مَنْ نَّشَآءُ بِزَعْمِهِمْ وَاَنْعَامٌ حُرِّمَتْ ظُهُوْرُهَا
وَاَنْعَامٌ لَّا يَذْكُرُوْنَ اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهَا افْتِرَآءً عَلَيْهِ ۗ سَيَجْزِيْهِمْ
بِمَا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ﴿١٣٨﴾ وَقَالُوْا مَا فِيْ بُطُوْنِ هٰذِهِ الْاَنْعَامِ
خَالِصَةٌ لِّذُكُوْرِنَا وَمُحَرَّمٌ عَلٰٓى اَزْوَاجِنَا ۚ وَاِنْ يَّكُنْ مَّيْتَةً
فَهُمْ فِيْهِ شُرَكَآءُ ۗ سَيَجْزِيْهِمْ وَصْفَهُمْ ۗ اِنَّهٗ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ ﴿١٣٩﴾
قَدْ خَسِرَ الَّذِيْنَ قَتَلُوْٓا اَوْلَادَهُمْ سَفَهًا بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّحَرَّمُوْا
مَا رَزَقَهُمُ اللّٰهُ افْتِرَآءً عَلَى اللّٰهِ ۗ قَدْ ضَلُّوْا وَمَا كَانُوْا
مُهْتَدِيْنَ ﴿١٤٠﴾ ع ١٦ ١١ ٣

ترجمۂ آیات ۱۳۶ تا ۱۴۰

پس تم کھاؤ ان چیزوں میں سے جن پر خدا کا نام لیا گیا ہو، اگر تم اس کی آیات پر ایمان رکھنے والے ہو۔ اور تم کیوں نہ کھاؤ ان چیزوں میں سے جن پر خدا کا نام لیا گیا ہو جب کہ اس نے تفصیل سے بیان کر دی ہیں وہ چیزیں جو تم پر حرام ٹھہرائی ہیں اس استثنا کے ساتھ جس کے لیے تم مجبور ہو جاؤ۔ اور بے شک بہتیرے ایسے ہی ہیں جو لوگوں کو کسی علم کے بغیر اپنی بدعات کے ذریعے سے گمراہ کر رہے ہیں۔ تیرا

رب خوب واقف ہے ان حد سے بڑھنے والوں سے۔ اور چھوڑو گناہ کے ظاہر کو بھی اور اس کے باطن کو بھی۔ بے شک جو لوگ گناہ کما رہے ہیں وہ عنقریب اپنی اس کمائی کا بدلہ پائیں گے۔ اور تم نہ کھاؤ ان چیزوں میں سے جن پر خدا کا نام نہ لیا گیا ہو۔ بے شک یہ حکم عدولی ہے اور شیاطین القا کر رہے ہیں اپنے ایجنٹوں کو تاکہ وہ تم سے جھگڑیں اور اگر تم ان کا کہا مانو گے، تم بھی مشرک ہو جاؤ گے۔ ۱۱۸-۱۲۱

کیا وہ جو مردہ تھا تو ہم نے اس کو زندہ کر دیا اور ہم نے اس کو ایک روشنی بخشی جس کو لے کر وہ لوگوں میں چلتا ہے اس کے مانند ہو گا جو تاریکیوں میں پڑا ہوا ہے، ان سے نکلنے والا نہیں ہے؟ اسی طرح کافروں کی نظر میں ان کے اعمال کھبا دیے گئے ہیں اور اسی طرح ہم نے ہر بستی میں اس کے سرغنوں کو ڈھیل دی کہ اس میں اپنی چالیں چل لیں۔ اور چال وہ اپنے ہی ساتھ چلتے تھے لیکن ان کو اس کا احساس نہیں تھا۔ اور جب ان کے پاس آتی کوئی آیت تو کہتے ہم تو ماننے کے نہیں جب تک ہم کو بھی وہی کچھ نہ ملے جو اللہ کے رسولوں کو ملا۔ اللہ ہی خوب جانتا ہے کہ وہ اپنا منصبِ رسالت کس کو بخشے۔ جو لوگ شرارت کر رہے ہیں اللہ کے ہاں ان کو ان کی اس چالبازی کی پاداش میں ذلت اور عذاب شدید نصیب ہو گا۔ اللہ جس کسی کو ہدایت دینا چاہتا ہے اس کا سینہ اسلام کے لیے کھول دیتا ہے اور جس کو گمراہ کرنا چاہتا ہے اس کے سینہ کو بالکل تنگ کر دیتا ہے گویا اسے آسمان میں چڑھنا پڑ رہا ہے۔ اسی طرح اللہ ناپاکی مسلط کر دیتا ہے ان لوگوں پر جو ایمان نہیں لاتے۔ اور یہ تیرے رب کی راہ ہے سیدھی۔ ہم نے اپنی آیتیں تفصیل سے بیان

کر دی ہیں ان لوگوں کے لیے جو یاد دہانی حاصل کریں۔ ان کے لیے ان کے رب کے پاس سکھ کا گھر ہے اور وہ ان کا کارساز ہے ان کے اعمال کے صلہ میں۔ ۱۲۱-۱۲۷

اور اس دن کا دھیان کرو جس دن وہ ان سب کو اکٹھا کرے گا۔ کہے گا اے جنوں کے گروہ تم نے تو انسانوں میں سے بہتوں کو اپنا لیا اور انسانوں میں سے ان کے ساتھی کہیں گے اے ہمارے رب ہم نے ایک دوسرے کو استعمال کیا اور ہم پہنچ گئے اپنی اس مدت کو جو تُو نے ہمارے لیے ٹھہرائی۔ فرمائے گا تمھارا ٹھکانا اب جہنم ہے ہمیشہ کے لیے اس میں رہو مگر جو اللہ چاہے۔ بے شک تیرا رب حکیم و علیم ہے اور اسی طرح ہم مسلط کر دیتے ہیں ظالموں کو ایک دوسرے پر بسبب ان کی کرتوتوں کے۔ اے جنوں اور انسانوں کے گروہ کیا تمھارے پاس تمھیں میری آیتیں سناتے اور تمھارے اس دن کی ملاقات سے تم کو ہوشیار کرتے ہُوئے تم میں سے رسول نہیں آئے۔ وہ بولیں گے ہم خود اپنے خلاف شاہد ہیں اور ان کو دنیا کی زندگی نے دھوکے میں رکھا اور وہ خود اپنے خلاف گواہی دیں گے کہ بے شک وہ کافر رہے۔ یہ اس وجہ سے کہ تیرا رب بستیوں کو ان کے ظلم کی پاداش میں اس حال میں ہلاک کرنے والا نہیں ہے کہ ان کے باشندے بے خبر ہوں۔ اور ہر ایک کے لیے درجے ہیں ان کے عمل کے اعتبار سے اور تیرا رب اس چیز سے بے خبر نہیں ہے جو وہ کرتے رہے ہیں اور تیرا رب بے نیاز، رحمت والا ہے۔ اگر وہ چاہے تم کو فنا کر دے اور تمھارے بعد تمھاری جگہ جس کو چاہے لائے جس طرح اس نے تم کو پیدا کیا دوسروں کی نسل سے۔ جس چیز کا تم سے وعدہ کیا جا رہا ہے وہ آ رہے گی اور تم ہمارے قابو سے باہر نہیں جا سکتے۔ کہہ دو، اے میرے ہم قومو، تم اپنے

طریقے پر چلو، میں اپنے طریقے پر چلتا ہوں، تم جلد جان لوگے کہ انجام کار کی کامیابی کس کا حصہ ہے۔ یقیناً ظالم فلاح پانے والے نہیں ہو سکتے۔ ۱۲۸۔ ۱۳۵

اور خدا نے جو کھیتی اور چوپائے پیدا کیے اس میں انھوں نے اللہ کا ایک حصہ مقرر کیا ہے۔ پس کہتے ہیں یہ حصہ تو اللہ کا ہے، ان کے گمان کے مطابق، اور یہ حصہ ہمارے شرکاء کا ہے۔ تو جو حصہ ان کے شرکاء کا ہوتا ہے وہ تو اللہ کو نہیں پہنچ سکتا اور جو حصہ اللہ کا ہوتا ہے وہ ان کے شرکاء کو پہنچ سکتا ہے۔ کیا ہی برا فیصلہ ہے جو یہ کرتے ہیں۔ اور اسی طرح بہت سے مشرکوں کی نظر میں ان کے شرکاء نے ان کی اولاد کے قتل کو ایک مستحسن فعل بنا دیا ہے تاکہ ان کو تباہ کریں اور تاکہ ان کے دین کو ان کے لیے بالکل گھپلا کر دیں۔ اور اگر اللہ چاہتا تو وہ ایسا نہ کر پاتے تو ان کو چھوڑو اپنے اسی افترا میں پڑے رہیں۔ اور کہتے ہیں فلاں فلاں چوپائے اور فلاں فلاں کھیتی ممنوع ہے، ان کو نہیں کھا سکتے مگر وہی جن کو ہم چاہیں، اپنے گمان کے مطابق۔ اور کچھ چوپائے ہیں جن کی پیٹھیں حرام ٹھہرائی گئی ہیں اور کچھ چوپائے ہیں جن پر خدا کا نام نہیں لیتے، محض اللہ پر افترا کے طور پر۔ اللہ عنقریب ان کو اس افترا کا بدلہ دے گا۔ اور کہتے ہیں فلاں قسم کے چوپایوں کے پیٹ میں جو ہے وہ بس ہمارے مردوں کے لیے خاص ہے اور ہماری عورتوں کے لیے حرام ہے اور اگر وہ مردہ ہو تو اس میں سب شریک ہیں۔ عنقریب اللہ ان کو ان کی اس تشخیص کی سزا دے گا۔ بے شک وہ حکیم و علیم ہے۔ وہ لوگ نامراد ہوئے جنھوں نے محض بے وقوفی سے، بغیر کسی علم کے، اپنی اولاد کو قتل کیا اور اللہ نے ان کو جو روزی بخشی اس کو اللہ پر افترا کر کے حرام ٹھہرایا۔ یہ گمراہ ہوئے اور ہدایت پانے والے نہ بنے۔

۱۳۶۔ ۱۴۰

۲۰۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

فَكُلُوا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ اِنْ كُنْتُمْ بِاٰيٰتِهٖ مُؤْمِنِيْنَ ۝ وَمَا لَكُمْ اَلَّا تَاْكُلُوْا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ وَقَدْ فَصَّلَ لَكُمْ مَّا حَرَّمَ عَلَيْكُمْ اِلَّا مَا اضْطُرِرْتُمْ اِلَيْهِ ؕ وَاِنَّ كَثِيْرًا لَّيُضِلُّوْنَ بِاَهْوَآئِهِمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ ؕ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِالْمُعْتَدِيْنَ ۝ وَذَرُوْا ظَاهِرَ الْاِثْمِ وَبَاطِنَهٗ ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْسِبُوْنَ الْاِثْمَ سَيُجْزَوْنَ بِمَا كَانُوْا يَقْتَرِفُوْنَ (۱۱۸-۱۲۰)

مشرکانہ توہمات کے تحت حرام سمجھے جانے والے چوپایوں کو کھانے کا حکم

ہم اوپر اشارہ کر چکے ہیں کہ جب اسلام نے وہ تمام چوپائے حلال و طیب قرار دے دیے جن کو مشرکین نے اپنے مشرکانہ توہمات کے تحت حرام قرار دے رکھا تھا تو اس کے خلاف انھوں نے بڑا ہنگامہ اٹھایا کہ یہ دیکھو، اس شخص نے اپنے پیرووں کے لیے وہ چیزیں بھی جائز کر دی ہیں جو ہمارے بزرگوں — ابراہیمؑ و اسمٰعیلؑ — کے زمانے سے حرام چلی آ رہی تھیں۔ اس طرح کے معاملات میں، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، عام ذہن بڑا حساس اور ضعیف الاعتقاد ہوتا ہے اس وجہ سے مخالفانہ پروپیگنڈے کا اثر آسانی سے قبول کر لیتا ہے۔ قرآن نے یہاں اسی اثر کو دور کرنے کے لیے فرمایا کہ حرام وہی چیزیں ہیں جو اللہ نے اپنی کتاب میں تفصیل سے بیان کر دی ہیں تو ان مشرکین کی تحریم و تحلیل کی کوئی پروا نہ کرو۔ جو چیزیں شریعت الٰہی میں حلال ہیں ان کے باب میں اس کے سوا کوئی قید نہیں ہے کہ وقت ذبح ان پر خدا کا نام لیا جائے۔ اگر خدا کا نام لیا گیا ہے تو ان کو بے تکلف کھاؤ اور ان مشرکین کے پروپیگنڈے کو کوئی اہمیت نہ دو۔

اِنْ كُنْتُمْ بِاٰيٰتِهٖ مُؤْمِنِيْنَ ۔ اگر تم اللہ کی آیات پر ایمان رکھنے والے ہو، تاکید اور تنبیہ بلکہ ایک قسم کی تہدید بھی ہے۔ یعنی اللہ کی آیات پر ایمان کا یہ لازمی تقاضا ہے کہ خدا کے احکام کے مقابل میں مشرکوں کے بے بنیاد پروپیگنڈے کی کوئی پروا نہ کرو۔ تحریم و تحلیل کا اختیار صرف اللہ کو حاصل ہے۔ اگر کسی اور کے لیے بھی یہ حق تسلیم کر لیا جائے تو یہ خدا کے حقوق میں دوسرے کو حصہ دار بنانا ہے اور یہ شرک ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ مسئلہ صرف ایک چیز کے کھانے اور نہ کھانے کا نہیں ہے بلکہ جن چیزوں کو مشرکانہ توہمات کی بنا پر حرام ٹھہرایا گیا ہے اللہ کی طرف سے ان کی حلت کے اعلان کے باوجود ان سے اجتناب کرنا گویا بالواسطہ شرک کو تسلیم کرنا ہوا اس وجہ سے یہ مسئلہ کفر و ایمان کا مسئلہ بن جاتا ہے۔ توحید کا تقاضا، جیسا کہ آگے بیان آ رہا ہے، یہ ہے کہ آدمی شرک ظاہر اور شرک باطن دونوں سے اپنے آپ کو پاک رکھے۔

جائز چیزوں سے توہمات کی بنا پر احتراز

وَمَا لَكُمْ اَلَّا تَاْكُلُوْا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ وَقَدْ فَصَّلَ لَكُمْ مَّا حَرَّمَ عَلَيْكُمْ اِلَّا مَا اضْطُرِرْتُمْ اِلَيْهِ

مطلب یہ ہے کہ جب خدا کی طرف سے وضاحت ہو چکی کہ حرام کیا کیا چیزیں ہیں تو اب خدا پر ایمان کا دعویٰ رکھنے والوں کے لیے اس معاملے میں تذبذب کی کہاں گنجائش رہ گئی؟ 'تفصیل' سے یہاں اشارہ اس نقطہ تفصیل کی طرف بھی ہے جو اس سے پہلے کی سورتوں میں گزر چکی ہے، مثلاً سورۂ نحل کی آیات ۱۱۴ تا ۱۱۶ میں اور

اس تفصیل کی طرف بھی ہے جو خود اس سورہ میں بیان ہوئی ہے۔ ہر چند یہاں یہ بحث مشرکانہ توہمات و عقائد کے تحت کسی چیز کو حرام سمجھنا ہے، نہ کہ مجرد ذوقی بنیاد پر کسی چیز سے احتراز — لیکن اس تاکید کے ساتھ جو جائز چیزوں کے کھانے پر زور دیا جا رہا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ شرک و توحید کا معاملہ دین میں اتنا اہم ہے کہ اس باب میں شریعت کسی ادنیٰ التباس کی بھی روادار نہیں ہے۔ اگر ذرا بھی اس میں مسامحت برتی جاتی تو یہ بتوں کے اندر نفاق کی پرورش کے لیے ایک پردہ فراہم کر دیتی۔ یہ تاکید گویا ایک مخلص و منافق کے درمیان امتیاز کی ایک کسوٹی کے طور پر تھی۔ جو لوگ اس تاکید کے بعد بھی ان چیزوں کے کھانے سے محترز رہتے جن سے اب تک محترز رہے تھے تو ان کا یہ احتراز ان کے اندر شرک و جاہلیت کے جراثیم کی موجودگی کی شہادت دیتا۔ انبیاء و مصلحین کے طریقہ کار میں اس فرق و امتیاز کی بنیادی اہمیت ہے اور عقل و فطرت کا تقاضا بھی یہی ہے۔

'اِلَّا مَا اضْطُرِرْتُمْ اِلَیْہِ' میں اس استثنا کا بیان ہے جو حرام چیزوں کی ممانعت کے اندر اللہ تعالیٰ نے رکھا ہے۔ حرام چیزیں بھی اس حالت میں انسان کے لیے جائز ہو جاتی ہیں جب اس کو حالتِ اضطرار پیش آ جائے۔ اس حالتِ اضطرار کے حدود و شرائط پر دوسرے مقام میں تفصیل سے ہم بحث کر چکے ہیں۔ یہ بات یہاں یاد رکھنے کی ہے کہ مشرکین اللہ کی حرام ٹھہرائی ہوئی چیزیں تو بے دھڑک بغیر کسی اضطرار کے بھی کھاتے تھے لیکن اپنے مشرکانہ توہمات کے تحت جو چیزیں انھوں نے حرام قرار دے لی تھیں ان کو کسی حالت میں بھی ہاتھ نہیں لگاتے تھے، خواہ ان کی جان ہی پر کیوں نہ آ بنی ہو۔

کسی چیز کو بے سند شریعت قرار دینا بدعت ہے

'وَاِنَّ کَثِیْرًا لَّیُضِلُّوْنَ بِاَھْوَآئِھِمْ بِغَیْرِ عِلْمٍ' 'اھوا' کے لفظ پر ہم دوسری جگہ بحث کر چکے ہیں کہ یوں تو اس کے معنی خواہشات کے ہیں لیکن جس سیاق میں یہ یہاں ہے اس سیاق میں اس سے مراد بدعتیں ہوتی ہیں۔ اس لیے کہ بدعتوں کی بنیاد تمام تر ظن و گمان اور خواہشوں پر ہوتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ان چیزوں کی تحریم یہ منسوب تو خدا کی طرف کرتے ہیں لیکن یہ تمام تر ان کی اپنی بدعات ہیں۔ خدا سے اس چیز کو کوئی تعلق نہیں۔ اس باب میں ان کے پاس خدا کی طرف سے کوئی ثبوت یا سند نہیں ہے، جس کو وہ پیش کر سکیں۔ 'کَثِیْرًا' کے لفظ میں جو پہلو ملحوظ ہے اس کی طرف اوپر آیت ۱۱۶ میں اشارہ گزر چکا ہے۔ قرآن نے یہاں ان کے اس عمل کو 'بِغَیْرِ عِلْمٍ' جو قرار دیا ہے تو یہ ایک چیلنج بھی ہے کہ اگر ان کے پاس کوئی سند یا ثبوت ہے تو اس کو پیش کریں۔ دوسری طرف یہ ان سادہ لوحوں کی غلط فہمی کا ازالہ بھی ہے جو ہمیشہ اپنے بڑوں کی غلط سے غلط بات بھی اس حسن ظن پر مانتے رہتے ہیں کہ ان کے پاس ضرور اس بات کی کوئی نہایت مضبوط دلیل ہو گی، اگرچہ ہم اس سے واقف نہیں ہیں۔

'اِنَّ رَبَّکَ ھُوَ اَعْلَمُ بِالْمُعْتَدِیْنَ' اوپر آیت ۱۱۱ میں فرمایا 'وَھُوَ اَعْلَمُ بِالْمُھْتَدِیْنَ' یہ ٹکڑا بالکل اس کے مقابل میں ہے۔ وہ تسلی کے لیے وارد ہوا ہے، یہ تہدید کے لیے۔

'وَذَرُوْا ظَاھِرَ الْاِثْمِ وَبَاطِنَہٗ' یہ اوپر والی بات ہی کی تاکید ایک اور لطیف و دقیق پہلو سے ہے۔

شرک اور مظاہرِ شرک، دونوں کو چھوڑنے کا حکم

ہر برائی کے دو پہلو ہوتے ہیں۔ ایک اس کا باطنی پہلو، دوسرا اس کا ظاہری پہلو۔ اس بات کو دوسرے الفاظ میں یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ ایک تو اس کی حقیقت ہوتی ہے جس کا مسکن انسان کا نفس اور اس کا دل ہوتا ہے، دوسرے اس کے وہ مظاہر و اشکال ہوتے ہیں جن میں انسانی زندگی کے اندر وہ نمایاں ہوتی ہے۔ مثلاً شرک کی ایک تو حقیقت ہے جو یہ ہے کہ خدا کی ذات یا صفات یا اس کے حقوق میں کسی کو شریک ماننا، دوسرے اس کے مظاہر و اشکال ہیں مثلاً اصنام، انصاب، ازلام، بحیرہ، سائبہ، وصیلہ، حام اور اس نوع کی دوسری چیزیں جو کسی شرکیہ عقیدے یا تصور کا عملی مظہر اور نشان ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان دونوں میں بڑا گہرا ربط ہوتا ہے۔ یہ ایک دوسرے کے سہارے سے پروان چڑھتی اور غذا و قوت حاصل کرتی ہیں۔ اس وجہ سے اگر کسی برائی کا استیصال مقصود ہو تو یہ ضروری ہوگا کہ اس برائی کی حقیقت اور اس کے مظاہر و اشکال دونوں کا استیصال کیا جائے۔ اس کے بغیر اس کا استیصال ناممکن ہے۔ اگر یہ خیال کر کے اشکال و مظاہر سے چشم پوشی برتی جائے کہ جب اصل برائی پر ضرب لگا دی گئی تو اشکال و مظاہر میں کیا رکھا ہوا ہے تو وہ برائی انہی اشکال میں پھر اپنا نشیمن بنا کر اس میں اپنے انڈوں بچوں کی پرورش شروع کر دیتی ہے اور آہستہ آہستہ اس کا پورا کنبہ از سرِ نو آباد ہو جاتا ہے۔

یہاں زیرِ بحث آیت میں اسی حقیقت کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ جس طرح شرک کو چھوڑنا ضروری ہے اسی طرح شرکیہ عقائد و تصورات کی بنا پر جن چیزوں کو مقدس مان کر حرام ٹھہرایا گیا ہے ان کے تقدس اور ان کی حرمت کو بھی ختم کرو اور عام جانوروں کی طرح ان کو بھی خدا کے نام پر ذبح کرو اور بے تکلف ان سے فائدہ اٹھاؤ۔ اگر ان کے باب میں کوئی جھجک طبیعت میں باقی رہتی ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ابھی شرک کی جڑ دل کے اندر باقی ہے۔ اگر جڑ بنیاد باقی نہیں ہے تو آخر یہ اس کی شاخوں کو غذا کہاں سے مل رہی ہے؟ اس حقیقت کی طرف آگے بھی اسی سورہ میں یوں توجہ دلائی ہے وَلَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ ۱۵۱-انعام (اور بے حیائی کی باتوں کے قریب نہ پھٹکو خواہ ظاہری ہوں یا باطنی) اسی اصول کے تحت نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے بعد شرک کے تمام آثار و مظاہر کا یک قلم خاتمہ کر دیا۔ زیرِ بحث آیت میں لفظ اثم اگرچہ عام ہے لیکن قرینہ دلیل ہے کہ یہاں مراد شرک ہی ہے۔

خیر اور مظاہرِ خیر دونوں کی نگہداشت

یہاں یہ امر بھی ملحوظ رہے کہ جو حال برائیوں کا مذکور ہوا بعینہٖ وہی حال بھلائیوں کا بھی ہے۔ ان میں سے بھی ہر ایک کی ایک تو حقیقت ہوتی ہے اور کچھ اس کے اشکال و مظاہر ہوتے ہیں، اور جس طرح برائی کے استیصال کے لیے یہ ضروری ہوتا ہے کہ شر کے ساتھ ساتھ بیجِ شر کا بھی خاتمہ کیا جائے ورنہ وہ برائی ختم نہیں ہوتی اسی طرح کسی بھلائی کے فروغ دینے کے لیے بھی ضروری ہے کہ اس کی حقیقت کے ساتھ اس کے مظاہر و اشکال کو بھی فروغ دیا جائے۔ اگر مظاہر و اشکال کو فروغ نہ دیا جائے تو وہ بھلائی بھی دب دبا کر رہ جاتی ہے۔ اس کو نشو و نما نہیں حاصل ہوتی۔ اس مسئلے پر انشاء اللہ ہم اس کے محل میں گفتگو کریں گے۔ آگے اعراف

کی آیت ۲۳ کے تحت بھی یہ بحث آئے گی۔

اِنَّ الَّذِیْنَ یَکْسِبُوْنَ الْاِثْمَ سَیُجْزَوْنَ بِمَا کَانُوْا یَقْتَرِفُوْنَ' یہ ان لوگوں کو دھمکی ہے جو ان بے اصل بدعات کی حمایت میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں سے بحث و مجادلہ کر رہے تھے۔ فرمایا کہ تم ان تمام بدعات کے ظاہر و باطن دونوں سے اپنے کو پاک کرو۔ رہے یہ لوگ جو اس بس بھری فصل کی کاشت کر رہے ہیں وہ بہت جلد اس کا حاصل اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے۔

وَلَا تَاْکُلُوْا مِمَّا لَمْ یُذْکَرِ اسْمُ اللّٰہِ عَلَیْہِ وَاِنَّہٗ لَفِسْقٌ ؕ وَاِنَّ الشَّیٰطِیْنَ لَیُوْحُوْنَ اِلٰٓی اَوْلِیٰٓـئِہِمْ لِیُجَادِلُوْکُمْ ۚ وَاِنْ اَطَعْتُمُوْہُمْ اِنَّکُمْ لَمُشْرِکُوْنَ (۱۲۱)

ان مباح چیزوں کی تحریم جن پر اللہ کا نام نہ لیا گیا ہو

اوپر والی آیت میں شرکیہ عقائد کے تحت حرام کی ہوئی چیزوں کو کھانے کا حکم دیا ہے جب کہ ان پر اللہ کا نام لیا گیا ہو۔ اس آیت میں اہل عرب کے عقیدے کی رُو سے ان مباح چیزوں کو بھی کھانے کی ممانعت فرما دی جن پر اللہ کا نام نہ لیا گیا ہو۔ مشرکین نے اوپر والی حلت کی طرح اس حرمت پر بھی ہنگامہ اٹھایا اس لیے کہ ان کے ہاں کسی ذبیحہ کی حلت و طہارت کے لیے یہ چیز ضروری نہیں تھی کہ لازماً اس پر اللہ کا نام بھی لیا جائے۔ جس چیز کو وہ حلال و طیب سمجھتے تھے اور ان کے باپ دادا بھی جس کو حلال سمجھتے تھے مسلمانوں کی طرف سے اس کی حرمت کے اعلان سے ان کے مذہبی پندار کو بڑی چوٹ لگی ہو گی اور انھوں نے اپنے عوام کے جذبات مسلمانوں کے خلاف بھڑکانے کے لیے یہ پروپیگنڈا شروع کیا ہو گا کہ یہ لو، یہ نئے دین والے تو ہم کو اور ہمارے باپ دادا سب کو حرام خور قرار دیتے ہیں اس لیے کہ ان کے ہاں وہ جانور جائز ہی نہیں جس پر اللہ کا نام نہ لیا گیا ہو۔ وَاِنَّ الشَّیٰطِیْنَ لَیُوْحُوْنَ اِلٰٓی اَوْلِیٰٓـئِہِمْ لِیُجَادِلُوْکُمْ سے ہمارے نزدیک ان کے اسی غوغا کی طرف اشارہ ہے۔ لیکن قرآن نے ان کے اوپر والے غوغا کی طرح ان کے اس غوغا کی بھی کوئی پروا نہیں کی بلکہ صاف فرمایا کہ اِنَّہٗ لَفِسْقٌ کہ جس جانور پر اللہ کا نام نہ لیا گیا ہو اس کو کھانا فسق ہے اور مسلمانوں کو متنبہ کیا کہ وَاِنْ اَطَعْتُمُوْہُمْ اِنَّکُمْ لَمُشْرِکُوْنَ اگر تم نے ان کے غوغا سے متاثر ہو کر ان کی بات مانی تو تم بھی مشرک ہو کر رہ جاؤ گے۔

ذبح کے وقت اللہ کا نام لینے کی ضرورت

یہاں یہ سوال قابل غور ہے کہ کسی جانور کے ذبح کے وقت اس پر اللہ کا نام لینا اس قدر ضروری کیوں قرار دیا گیا کہ اس کے بغیر اس کا کھانا ہی حرام ہو جائے؟ اس کے بعض وجوہ بالکل واضح ہیں جن کی طرف ہم اشارہ کرنا چاہتے ہیں۔

اوّل یہ کہ اللہ کے نام اور اس کی تکبیر کے بغیر جو کام بھی کیا جاتا ہے وہ، جیسا کہ ہم آیت بسم اللہ کی تفسیر میں واضح کر چکے ہیں، برکت سے خالی ہوتا ہے۔ خدا کی ہر نعمت سے، خواہ چھوٹی ہو یا بڑی، فائدہ اٹھاتے وقت ضروری ہے کہ اس پر اس کا نام لیا جائے تاکہ بندوں کی طرف سے اس کے انعام و احسان کا اعتراف و اقرار ہو۔ اس اعتراف و اقرار کے بغیر کوئی شخص کسی چیز پر تصرف کرتا ہے تو اس کا یہ تصرف

غاصبانہ ہے اور غصب سے کوئی حق قائم نہیں ہوتا بلکہ یہ جسارت اور ڈھٹائی ہے جو خدا کے ہاں مستوجب سزا ہے۔

دوم یہ کہ احترامِ جان کا یہ تقاضا ہے کہ کسی جانور کو ذبح کرتے وقت اس پر خدا کا نام لیا جائے۔ جان کسی کی بھی ہو ایک محترم شے ہے۔ اگر خدا نے ہم کو اجازت نہ دی ہوتی تو ہمارے لیے کسی جانور کی بھی جان لینا جائز نہ ہوتا۔ یہ حق ہم کو صرف خدا کے اذن سے حاصل ہوا ہے اس وجہ سے یہ ضروری ہے کہ جس وقت ہم ان میں سے کسی کی جان لیں صرف خدا کے نام پر لیں۔ اگر ان پر خدا کا نام نہ لیں، یا خدا کے نام کے ساتھ کسی اور کا نام لے لیں یا کسی غیر اللہ کے نام پر ان کو ذبح کر دیں تو یہ ان کی جان کی بھی بے حرمتی ہے اور ساتھ ہی جان کے خالق کی بھی۔

سوم یہ کہ اس سے شرک کا ایک بہت وسیع دروازہ بند ہو جاتا ہے۔ ادیان کی تاریخ پر جن لوگوں کی نظر ہے وہ جانتے ہیں کہ جانوروں کی قربانی، ان کی نذر اور ان کے چڑھاوے کو ابتدائے تاریخ سے عبادات میں بڑی اہمیت حاصل رہی ہے۔ اس اہمیت کے سبب سے مشرکانہ مذاہب میں بھی اس کو بڑا فروغ حاصل ہوا۔ جو قوم بھی کسی غیر اللہ کی عقیدت و نیازمندی میں مبتلا ہوئی اس نے مختلف شکلوں سے اس غیر اللہ کو راضی کرنے کے لیے جانوروں کی بھینٹ چڑھائی۔ قرآن میں شیطان کی جو دھمکی انسانوں کو گمراہ کرنے کے باب میں مذکور ہوئی ہے اس میں بھی، جیسا کہ ہم اس کے مقام میں واضح کر چکے ہیں، اس ذریعۂ ضلالت کا شیطان نے خاص طور پر ذکر کیا ہے۔ اسلام نے شرک کے ان تمام راستوں کو بند کر دینے کے لیے جانوروں کی جانوں پر اللہ تعالیٰ کے نام کا قفل لگا دیا جس کو خدا کے نام کی کنجی کے سوا کسی اور کنجی سے کھولنا حرام قرار دے دیا گیا۔ اگر اس کنجی کے بغیر کسی اور کنجی سے اس کو کھولنے یا اس کو توڑنے کی کوشش کی گئی تو یہ کام بھی ناجائز اور جس جانور پر یہ ناجائز تصرف ہوا وہ جانور بھی حرام۔

اس سے معلوم ہوا کہ اسلام میں صرف یہی چیز ناجائز نہیں ہے کہ کسی جانور کو غیر اللہ کے نام پر ذبح کیا گیا بلکہ یہ بھی ناجائز ہے کہ کسی جانور کو اللہ کا نام لیے بغیر ہی ذبح کر دیا جائے۔ اس سے مستثنیٰ صرف وہ صورت ہو سکتی ہے جس میں بھول چوک کو دخل ہو۔ اور یہ بھول چوک بھی معاف صرف اہل ایمان کے لیے ہے اس لیے کہ ان کے دل اور ارادے میں اللہ کا ایمان اور اس کا نام موجود ہوتا ہے۔ صرف کسی وقتی غفلت سے اس کے اظہار میں سہو ہو جاتا ہے۔

اَوَمَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنٰهُ وَجَعَلْنَا لَهٗ نُوْرًا يَّمْشِيْ بِهٖ فِي النَّاسِ كَمَنْ مَّثَلُهٗ فِي الظُّلُمٰتِ لَيْسَ بِخَارِجٍ مِّنْهَا ؕ كَذٰلِكَ زُيِّنَ لِلْكٰفِرِيْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا فِيْ كُلِّ قَرْيَةٍ اَكٰبِرَ مُجْرِمِيْهَا لِيَمْكُرُوْا فِيْهَا ؕ وَمَا يَمْكُرُوْنَ اِلَّا بِاَنْفُسِهِمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ (۱۲۲-۱۲۳)

اَوَمَنْ كَانَ مَيْتًا الْاٰيَة۔ یہاں 'موت' سے مراد کفر کی زندگی اور 'حیات' سے مراد ایمان کی

زندگی ہے۔ نور سے مراد وہ کتاب ہے جس کا ذکر آیت ۱۱۴۔ ۱۱۹ میں گزرا جو اللہ تعالیٰ نے حق و باطل کے درمیان امتیاز اور حرام و حلال کی تفصیل کے لیے اتاری۔ 'ظلمات' سے مراد وہ ظنون و اوہام اور وہ خواہشات و بدعات ہیں جن کی طرف آیات ۱۱۶ و ۱۱۹ میں اشارہ فرمایا ہے۔

اہل ایمان اور اہل کفر کی تمثیل

یہ اہل ایمان اور ان مشرکین کی تمثیل بیان ہوئی ہے کہ اہل ایمان کو اللہ نے کفر کی موت کے بعد ایمان کی زندگی بخشی ہے اور ان کو اپنی کتاب کی شکل میں ایک نورِ مبین عطا فرمایا ہے جس سے وہ خود بھی روشنی حاصل کر رہے ہیں، دوسروں کو بھی راہ دکھا رہے ہیں۔ کیا یہ لوگ ان لوگوں کے مانند ہو جائیں گے جن کی تمثیل یہ ہے کہ یہ اپنے سابق اوہام اور اپنی بدعات کی تاریکیوں میں بھٹک رہے ہیں اور ان سے نکلنے کا نام نہیں لیتے۔ اس تمثیل کے پیش کرنے سے مقصود مسلمانوں کی حوصلہ افزائی ہے کہ اب تم ان شیاطین جن و انس کی غوغا آرائیوں کی پروا نہ کرو۔ تم کو خدا نے زندگی بخشی ہے تو زندگی کا پیام لے کر آگے بڑھو۔ تمھیں روشنی عطا ہوئی ہے تو اس روشنی میں خود بھی چلو اور دوسروں کو بھی روشنی دکھاؤ۔ اب تمھارے لیے یہ زیبا نہیں کہ اندھیرے میں ٹھوکریں کھانے والوں کی خرافات پر کان دھرو۔

روشنی کا حق

'یَّمْشِیْ بِهٖ فِی النَّاسِ' میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی کو روشنی ملے تو اس کا حق یہ ہے کہ اس سے خود بھی رہنمائی حاصل کرے اور لوگوں میں بھی اس کو لے کر نکلے تاکہ جن کے اندر صلاحیت ہو وہ بھی اس سے فائدہ اٹھائیں۔ روشنی چھپا کر رکھنے کی چیز نہیں ہوتی بلکہ اونچی جگہ سرِ راہ رکھنے کی چیز ہوتی ہے۔ سیدنا مسیحؑ نے اسی حکمت کو یوں سمجھایا ہے کہ جن کے پاس چراغ ہوتا ہے وہ پیمانہ کے نیچے ڈھانپ کے نہیں رکھتا بلکہ اونچی جگہ رکھتا ہے تاکہ اس کا اپنا گھر بھی روشن ہو اور دوسرے بھی اس سے راستہ پائیں۔

اہل کفر پر کفر کے مسلط ہونے کے بارے میں سنتِ الٰہی

'كَذٰلِكَ زُيِّنَ لِلْكٰفِرِيْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ' یعنی یہ اس تاریکی ہی میں پڑے رہنے پر جو بضد ہیں اور تمھاری دکھائی ہوئی روشنی سے وحشت زدہ ہو رہے ہیں اس سے تم دل برداشتہ نہ ہو، قانونِ قدرت یہی ہے کہ جو لوگ جس چیز کو پسند کرتے ہیں ان پر وہی چیز مسلط کر دی جاتی ہے۔ اس مضمون کو آگے آیت ۱۲۵ میں یوں واضح فرمایا ہے كَذٰلِكَ يَجْعَلُ اللّٰهُ الرِّجْسَ عَلَى الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ (اسی طرح اللہ ناپاکی مسلط کر دیتا ہے ان لوگوں پر جو ایمان نہیں لاتے) اس قانونِ الٰہی پر سورۂ بقرہ کی تفسیر میں ہم ختم قلوب کی بحث میں تفصیل سے گفتگو کر چکے ہیں۔

اس سنتِ الٰہی کی مزید وضاحت

'وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا فِيْ كُلِّ قَرْيَةٍ اَكٰبِرَ مُجْرِمِيْهَا لِيَمْكُرُوْا فِيْهَا' 'جَعَلْنَا' یہاں 'اَمْهَلْنَا' کے مفہوم میں ہے اور كَذٰلِكَ کا اشارہ اس صورتِ حال کی طرف ہے جس کا ذکر اوپر آیت ۱۲۱ میں فرمایا ہے۔ یہ اسی سنت اللہ کا بیان کسی قدر مختلف انداز میں ہوا ہے جو اوپر آیت ۱۱۲ میں بیان ہو چکی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ شیاطین جن و انس اس دعوت کی مخالفت میں جو بڑی چوٹی کا زور صرف کر رہے

ہیں یہ کوئی نادر واقعہ نہیں ہے۔ کسی بستی میں جب دعوتِ حق بلند ہوتی ہے تو وہاں جو باطل کے علمبردار ہوتے ہیں اور جن کا اس باطل سے مفاد وابستہ ہوتا ہے اسی طرح اپنی تمام چالوں کے ساتھ اس کو دبانے کے لیے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور اللہ تعالیٰ اپنی سنت کے مطابق ان کو بھی ایک خاص وقت تک ڈھیل دیتا ہے تاکہ جو کمائی وہ کرنا چاہتے ہیں کر لیں۔

'وَمَا يَمْكُرُوْنَ اِلَّا بِاَنْفُسِهِمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ'، یہاں مضارع سے پہلے فعل ناقص محذوف ہے۔ یعنی وہ تو چالیں حق کے خلاف چلتے تھے لیکن یہ چالیں انھیں کے خلاف پڑیں۔ حق کی مخالفت کرنے والے حق کو نہیں بلکہ خود اپنے کو تباہ کرتے ہیں لیکن چونکہ ان کے سامنے ان کا انجام نہیں ہوتا اسی وجہ سے ان کو اس کا احساس نہیں ہوتا۔ یہی حال قریش کے اکابر مجرمین کا ہے۔ یہ بھی انھی کے نقشِ قدم پر چل رہے ہیں اور بالآخر انھی کے انجام کو پہنچیں گے لیکن ان کو اس کا احساس نہیں ہو رہا ہے۔

وَاِذَا جَآءَتْهُمْ اٰيَةٌ قَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ حَتّٰى نُؤْتٰى مِثْلَ مَآ اُوْتِيَ رُسُلُ اللّٰهِ ؕ اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ ؕ سَيُصِيْبُ الَّذِيْنَ اَجْرَمُوْا صَغَارٌ عِنْدَ اللّٰهِ وَعَذَابٌ شَدِيْدٌ ۢ بِمَا كَانُوْا يَمْكُرُوْنَ (۱۲۴)

قریش کی ایک چال اور منصبِ نبوت کا استحقاق

یہ اس چال کی ایک مثال ہے جس کا ذکر اوپر ہوا۔ مطلب یہ ہوا کہ جب ان کے پاس اللہ کی کوئی آیت، عام اس سے کہ وہ کوئی نشانی ہو یا کوئی ہدایت و تنبیہ، آتی تو وہ یہ کہتے کہ ہم تو اس وقت تک ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں جب تک ہمیں بھی وہ رسالت نہ ملے جس کے مدعی یہ رسول لوگ ہیں، آخر ان کو کیا سرخاب کے پر لگے ہوئے تھے کہ انھیں خدا نے اپنا رسول بنایا اور ہمیں نظر انداز کر دیا، درآنحالیکہ پشتہا پشت سے قیادت و سیادت اور دولت و امارت ہمارا حصہ ہے؟ ٹھیک یہی بات، جیسا کہ قرآن میں تفصیل سے بیان ہوئی، قریش کے اکابر کہتے تھے۔ ان کو بھی وہی گھمنڈ تھا جو ان کے پیشرو مستکبرین اور مکذبینِ انبیاء کو تھا کہ اگر خدا کسی کو رسالت ہی دینے والا تھا تو کیا اس تاج کے لیے اس کو انھی (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کا سر موزوں نظر آیا، آخر مکہ یا طائف کے کسی سردار پر اس کی نظر کیوں نہ پڑی؟ ظاہر ہے کہ یہ بات جو وہ کہتے تھے تو محض چالبازی کے طور پر کہتے تھے، اس سے مقصود ان کا محض اپنی انانیت اور خود فریبی کے لیے ایک پردہ فراہم کرنا اور اپنے عوام کو بے وقوف بنانا ہوتا تھا۔ سادہ لوح عوام دنیوی اسباب و وسائل کو بڑی چیز سمجھتے ہیں۔ وہ جن کو دنیا میں بڑا دیکھتے ہیں، سمجھتے ہیں کہ خدا کے نزدیک بھی یہی بڑے ہوں گے۔ اس ذہن کے لوگ آسانی سے اس قسم کے چکروں میں آ جاتے ہیں۔ اسی وجہ سے قرآن نے اس بات کو مکر سے تعبیر کیا ہے یعنی یہ ایک سیاسی اشتعلا تھا۔

قریش کو منہ توڑ جواب

'اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ' یہ ان مستکبرین کو جواب ہے اور گو لفظاً سخت نہیں ہے لیکن معناً بہت سخت ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ منصبِ رسالت ایسی چیز نہیں ہے جس کا اہل ہر کس و ناکس بن جائے

یہ اللہ ہی خوب جانتا ہے کہ یہ تاج وہ کس کے سر پر رکھے۔ یہ مخمل اور زربفت کی جھول نہیں ہے جو بسا اوقات گدھوں پر بھی نظر آ جاتی ہے بلکہ یہ خلعتِ الٰہی اور تشریف آسمانی ہے جو انھیں کو نصیب ہوتی ہے جن کا انتخاب اللہ تعالیٰ فرمائے۔

منصبِ نبوت اور نبی کا مقام

اس ٹکڑے سے جہاں یہ بات نکلتی ہے کہ نبوت و رسالت ایک موہبت ربانی اور ایک عطیۂ الٰہی ہے جو صرف اسی کو حاصل ہوتی ہے جس کو اللہ تعالیٰ اس کے لیے انتخاب فرمائے وہیں یہ بات بھی اس سے نکلتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے لیے انتخاب انھی کو فرماتا ہے جو اپنی اکتسابی صلاحیتوں اور خوبیوں کے اعتبار سے نوع انسانی کے گل سرسبد نخل فطرت کے بہترین ثمر اور کمال انسانیت کے مظہر اتم ہوتے ہیں۔

'سَيُصِيبُ الَّذِينَ أَجْرَمُوا صَغَارٌ عِنْدَ اللَّهِ وَعَذَابٌ شَدِيدٌ بِمَا كَانُوا يَمْكُرُونَ'، 'أَجْرَمُوا' میں اگرچہ ان کے وہ تمام جرائم اور ان کی وہ ساری چال بازیاں شامل ہیں جن کے وہ مرتکب ہوئے لیکن یہاں اس سے ان کے اس استکبار کی طرف خاص اشارہ ہو رہا ہے جس کا اظہار انھوں نے 'لَنْ نُؤْمِنَ حَتَّىٰ نُؤْتَىٰ مِثْلَ مَا أُوتِيَ رُسُلُ اللَّهِ' میں کیا۔ اسی استکبار کے تعلق سے ان کے لیے اللہ تعالیٰ کے ہاں ذلت بھی ہے اور عذاب شدید بھی۔

فَمَنْ يُرِدِ اللَّهُ أَنْ يَهْدِيَهُ يَشْرَحْ صَدْرَهُ لِلْإِسْلَامِ ۖ وَمَنْ يُرِدْ أَنْ يُضِلَّهُ يَجْعَلْ صَدْرَهُ ضَيِّقًا حَرَجًا كَأَنَّمَا يَصَّعَّدُ فِي السَّمَاءِ ۚ كَذَٰلِكَ يَجْعَلُ اللَّهُ الرِّجْسَ عَلَى الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ ۝ وَهَٰذَا صِرَاطُ رَبِّكَ مُسْتَقِيمًا ۗ قَدْ فَصَّلْنَا الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يَذَّكَّرُونَ ۝ لَهُمْ دَارُ السَّلَامِ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۖ وَهُوَ وَلِيُّهُمْ بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ (۱۲۵-۱۲۷)

فَمَنْ يُرِدِ اللَّهُ الآیۃ۔ 'حَرَجٌ' جھاڑیوں سے بھری ہوئی تنگ جگہ کو کہتے ہیں۔ یہاں یہ 'ضَيِّقًا' کے بعد اس کی تاکید مزید کے طور پر آیا ہے۔ 'تصعد' بہ تکلف اور بہ مشقت کسی بلندی پر چڑھنے کے لیے معروف ہے۔ لفظ 'سما' جس طرح آسمان اور بادلوں کے لیے آتا ہے اسی طرح فضا اور اس کی بلندی کے لیے بھی آتا ہے مثلاً كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ أَصْلُهَا ثَابِتٌ وَفَرْعُهَا فِي السَّمَاءِ - ۲۴ ابراہیم (کلمہ طیبہ کی مثال ایک بارآور درخت کی ہے جس کی جڑ زمین میں گہری اتری ہوئی ہو اور اس کی شاخیں فضا میں پھیلی ہوئی ہوں)۔

ایمان سے گریز کی اصلی علت

اب یہ اصل علت بیان ہو رہی ہے ان کے ایمان نہ لانے کی۔ وہ یہ ہے کہ یہ اللہ کی توفیق ہدایت سے محروم ہو گئے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ یہ ساری سخن سازیاں اور تمام چالبازیاں تو محض ظاہر کا پردہ ہیں۔ اصل چیز جو ان کے لیے قبول اسلام میں مانع ہے کفر و شرک کی وہ نجاست ہے جس کے روے پر دے ان کے دلوں پر جم گئے ہیں، جس کے سبب سے ان کو اسلام کا راستہ ایک کٹھن چڑھائی معلوم ہوتا ہے، جس کے تصور سے ان کا سینہ بھنچتا اور دم اکھڑتا ہے گویا ان کو ایک بلند چڑھائی چڑھنی پڑ رہی ہے۔ جن کے دلوں پر یہ نجاست جم جاتی ہے اللہ تعالیٰ ان کے سینے اسلام کے لیے تنگ کر دیتا ہے، جیسا کہ اوپر كَذَٰلِكَ زُيِّنَ لِلْكَافِرِينَ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ۱۲۲ کے الفاظ سے اشارہ فرمایا۔ اسلام کے لیے سینے کھلتے ان کے ہیں جن کے سینے اس قسم کے جھاڑ جھنکاڑ سے صاف ہوتے ہیں۔

یہ چیز چونکہ بالکل سنت الٰہی کے مطابق واقع ہوتی ہے اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اس کو منسوب اپنی طرف فرمایا ہے۔ اس کو اس روشنی میں سمجھنا چاہیے جس روشنی میں اس کی وضاحت ہم اس کتاب میں ایک سے زیادہ مقامات میں کر چکے ہیں۔

وَهٰذَا صِرَاطُ رَبِّكَ مُسْتَقِيْمًا ۭ الاٰیۃ۔ چونکہ اشارہ کے اندر فعل کے معنی پائے جاتے ہیں اس وجہ سے 'مُسْتَقِيْمًا' یہاں 'صراط' سے حال پڑا ہوا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ اسلام ہے تو خدا کی کھولی ہوئی سیدھی راہ، فطرت کی صراط مستقیم، نہ اس میں پیچ و خم ہیں، نہ چڑھائیاں اور گھاٹیاں لیکن جنھوں نے اپنے اوپر اتنی غیر فطری نجاستیں لاد رکھی ہوں ان کو یہ راہ دشوار گزار معلوم ہو رہی ہے۔ قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّذَّكَّرُوْنَ یعنی اس کے دین فطرت اور ملتِ ابراہیم ہونے کے سارے دلائل تفصیل سے ہم نے بیان کر دیے ہیں لیکن دلائل کارآمد ان کے لیے ہوتے ہیں جن کے اندر یاد دہانی حاصل کرنے اور سوچنے سمجھنے کا ارادہ پایا جاتا ہے۔

'لَهُمْ دَارُ السَّلٰمِ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَهُوَ وَلِيُّهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ' یہ صلہ بیان ہوا ہے ان لوگوں کا جن کے سینے اللہ تعالیٰ اسلام کے لیے کھولتا ہے۔ فرمایا کہ ان کے لیے اس اسلام کے صلہ میں دار السلام، سکھ اور چین کا گھر ہوگا اور اللہ ان کا ساتھی ہوگا جب کہ اسلام کے معاندین کے لیے ذلت اور عذاب کا گھر ہوگا۔ اور ان کے ساتھی وہ شیاطین جن و انس ہوں گے جن کے القائے شیطانی کو قبول کر کے یہ گمراہ ہوئے۔ یہ ٹکڑا اوپر والے ٹکڑے 'سَيُصِيْبُ الَّذِيْنَ اَجْرَمُوْا' کے بالکل بالمقابل ہے۔

وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ جَمِيْعًا ۚ يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ قَدِ اسْتَكْثَرْتُمْ مِّنَ الْاِنْسِ ۚ وَقَالَ اَوْلِيٰٓؤُهُمْ مِّنَ الْاِنْسِ رَبَّنَا اسْتَمْتَعَ بَعْضُنَا بِبَعْضٍ وَّبَلَغْنَآ اَجَلَنَا الَّذِيْٓ اَجَّلْتَ لَنَا ۭ قَالَ النَّارُ مَثْوٰىكُمْ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اِلَّا مَا شَاۗءَ اللّٰهُ ۭ اِنَّ رَبَّكَ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ ۝ وَكَذٰلِكَ نُوَلِّيْ بَعْضَ الظّٰلِمِيْنَ بَعْضًۢا بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ۝ يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ اَلَمْ يَاْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَقُصُّوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِيْ وَيُنْذِرُوْنَكُمْ لِقَاۗءَ يَوْمِكُمْ هٰذَا ۭ قَالُوْا شَهِدْنَا عَلٰٓي اَنْفُسِنَا وَغَرَّتْهُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا وَشَهِدُوْا عَلٰٓي اَنْفُسِهِمْ اَنَّهُمْ كَانُوْا كٰفِرِيْنَ ۝ ذٰلِكَ اَنْ لَّمْ يَكُنْ رَّبُّكَ مُهْلِكَ الْقُرٰي بِظُلْمٍ وَّاَهْلُهَا غٰفِلُوْنَ ۝ وَلِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا ۭ وَمَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا يَعْمَلُوْنَ (١٢٨-١٣٢)

ذریتِ ابلیس کی عیاری اور ذریتِ آدم کی سادہ لوحی

'وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ جَمِيْعًا' 'ھُمْ' سے مراد وہی اکابر مجرمین ہیں جن کا ذکر آیات ١٢٣-١٢٤ میں گزرا اور 'جمیعا' کی تاکید اس بات کو ظاہر کر رہی ہے کہ شیاطین انس کے ساتھ ساتھ وہ شیاطین الجن بھی جمع کیے جائیں گے جن کے القا و الہام کی انھوں نے پیروی کی، جیسا کہ اوپر آیت ١١٢ سے ان کا ذکر چلا آ رہا ہے۔ ان سب کو قیامت کے دن اللہ تعالیٰ جمع کر کے شیاطین الجن کو مخاطب کر کے فرمائے گا کہ يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ قَدِ اسْتَكْثَرْتُمْ مِّنَ الْاِنْسِ (اے جنوں کے گروہ تم نے تو انسانوں میں سے بہتوں کو اپنا ہمنوا بنا لیا) ظاہر ہے کہ یہاں 'جنوں کے گروہ' سے مراد جنوں کی پوری امت نہیں ہے بلکہ ان کے اندر کا وہی گروہ مخاطب ہے جس نے اپنے مرشد و پیشوا ابلیس

کی پیروی کی جو خود بھی، جیسا کہ قرآن سے ثابت ہے، جنوں ہی میں سے تھا اور جس نے آدم کو دھوکا دیا اور سجدے کے حکم کی تعمیل سے انکار کرتے ہوئے بڑے فخر سے دعویٰ کیا تھا کہ أَرَأَيْتَكَ هَٰذَا الَّذِي كَرَّمْتَ عَلَيَّ لَئِنْ أَخَّرْتَنِ إِلَىٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ لَأَحْتَنِكَنَّ ذُرِّيَّتَهُ إِلَّا قَلِيلًا۔ ۶۲ بنی اسرائیل (بھلا یہ ہے وہ جس کو تو نے میرے اوپر فضیلت بخشی ہے، اگر تو نے مجھے قیامت تک کے لیے مہلت دی تو میں اس کی ساری ذریت کو چٹ کر جاؤں گا صرف تھوڑے ہی مجھ سے بچ رہیں گے) دوسرے مقام میں ہے لَأَقْعُدَنَّ لَهُمْ صِرَاطَكَ الْمُسْتَقِيمَ ۔ ثُمَّ لَآتِيَنَّهُم مِّن بَيْنِ أَيْدِيهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ وَعَنْ أَيْمَانِهِمْ وَعَن شَمَائِلِهِمْ وَلَا تَجِدُ أَكْثَرَهُمْ شَاكِرِينَ ۱۶-۱۷ اعراف (میں تیری سیدھی راہ پر ان کی گھات میں بیٹھوں گا، پھر میں ان کے آگے سے، ان کے پیچھے سے، ان کے دہنے سے ان کے بائیں سے ان کی راہ ماروں گا اور تو ان میں سے اکثر کو اپنا شکر گزار نہ پائے گا) یہاں اصحابِ ذوق آسانی سے سمجھ سکتے ہیں کہ اسْتَكْثَرْتُم کے لفظ میں نہایت لطیف تلمیح ہے ابلیس کے قول وَلَا تَجِدُ أَكْثَرَهُمْ شَاكِرِينَ اور لَأَحْتَنِكَنَّ ذُرِّيَّتَهُ إِلَّا قَلِيلًا کی طرف۔ یعنی اللہ تعالیٰ ابلیس کے ان فرزندانِ معنوی کو خطاب کر کے فرمائے گا کہ تم نے تو اپنے پیشوا ابلیس کا ظن بڑی کامیابی سے پورا کیا کہ ذریت آدم میں سے بہتوں کو اپنے فتراک ضلالت کا نخچیر بنا لیا اور بڑی سعادت مند نکلی یہ اولادِ آدم کہ اس سادہ لوحی کے ساتھ تمھارے دامِ فریب میں پھنس گئی۔

شیطان کے پیرووں کا اعتراف آخرت میں

قَالَ أَوْلِيَاؤُهُم مِّنَ الْإِنسِ رَبَّنَا اسْتَمْتَعَ بَعْضُنَا بِبَعْضٍ وَبَلَغْنَا أَجَلَنَا الَّذِي أَجَّلْتَ لَنَا، انسانوں میں سے جو لوگ ان شیاطین جن کے ساتھی بنے ہوں گے وہ اس پر بولیں گے کہ اے ہمارے پروردگار، ہم نے ایک دوسرے کی معیت و رفاقت سے دنیا میں خوب حظ اٹھایا یہاں تک کہ اس یوم الحساب کو پہنچ گئے جو تو نے ہمارے لیے مقرر کیا تھا۔ 'حظ اٹھانے' سے مطلب یہ ہے کہ ہم ان کے آلۂ کار بنے، ہم نے ان کی پوجا کی، ان کے تھانوں پر نذریں اور قربانیاں پیش کیں اور ان کے کہے پر حلال کو حرام اور حرام کو حلال بنایا، اسی طرح ہمارے کاہنوں، ساحروں اور سیانوں نے ان کو اپنے مقاصدِ مزعومہ کے لیے طرح طرح سے استعمال کیا، یہاں تک کہ یہ دن آ گیا اور ہمیں اپنے اس عمل کے انجام پر غور کرنے کی توفیق نہ ملی۔ یہ واضح رہے کہ عرب جاہلیت میں جنوں کو عربوں کی مذہبی اور سماجی زندگی میں بڑا دخل ہو گیا تھا، کہانت اور ساحری کی ساری گرم بازاری تو ان کے دم قدم سے تھی ہی، شاعری تک کے متعلق ان کا خیال یہ تھا کہ یہ جنات الہام کرتے ہیں اور ہر بڑے شاعر کے ساتھ کوئی نہ کوئی جن ضرور ہوتا ہے۔ اسی بنا پر وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق بھی یہ کہتے تھے کہ ان کے ساتھ کوئی جن ہے۔ ہر وادی کے الگ الگ جن مانے جاتے تھے اور سفر، حضر، جنگ، صلح اور فتح کے معاملات میں ان کے تصرفات کا بڑا دخل سمجھا جاتا تھا۔

بلاغت کا ایک نکتہ

یہاں بلاغت کلام کا ایک نکتہ قابلِ لحاظ ہے۔ شیاطین انس یہ بات بطور اعتراف جرم اور بقصد اظہار ندامت کہیں گے اور یہ تمہید باندھ کر وہ اللہ تعالیٰ سے معافی کی درخواست کرنا چاہیں گے لیکن اسلوب کلام صاف شہادت دے رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی بات تمہید پوری ہونے سے پہلے ہی کاٹ دے گا اور

ان کو معذرت اور درخواستِ معافی کا موقع دیے بغیر ہی اپنا فیصلہ سنا دے گا کہ اَلنَّارُ مَثْوٰىكُمْ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ، بس اب تمہارا ٹھکانا یہی دوزخ ہے جس میں تمھیں ہمیشہ رہنا ہے، اب باتیں بنانے کی کوشش نہ کرو، عذر، معافی، توبہ اور اصلاح سب کے دروازے بند ہو چکے ہیں۔

آخرت کا خلود مقید بمشیتِ الٰہی ہو گا

یہاں ایک اور چیز بھی قابلِ غور ہے وہ یہ کہ 'خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ' کے بعد 'اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ' کے الفاظ بھی ہیں جس سے بادی النظر میں معلوم ہوتا ہے کہ یہ خلود مقید بمشیتِ الٰہی ہے۔ اسی طرح کا اسلوب سورۂ ہود میں بھی ہے۔ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ (ہود) (وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے جب تک آسمان و زمین قائم رہیں، مگر جو تیرا رب چاہے) اس استثنا کے باب میں ہمارے اربابِ تاویل کو تردد پیش آیا ہے اس لیے کہ اس سے بظاہر یہ بات نکلتی ہے کہ یہ خلود اس معنی میں خلود نہیں ہے جس معنی میں ہم سمجھتے ہیں کہ اس کی کوئی نہایت ہی نہیں ہے بلکہ وہ طولِ مدت کے مفہوم میں ہے، اگرچہ یہ مدت کتنی ہی طویل ہو۔ بعض لوگوں نے اس سے بچنے کے خیال سے 'مَا' کو 'مَنْ' کے معنی میں لیا ہے لیکن اوّل تو یہ عربیت کے خلاف ہے، ثانیاً اس سے بھی مقصد حاصل نہیں ہوتا جو وہ حاصل کرنا چاہتے ہیں اس لیے کہ یہ استثنا بہرحال انہی مستحقینِ خلود ہی میں سے ہو گا جن کا ذکر ہے تو پھر فرق کیا ہوا، خلود تو پھر بھی غیر منتہی خلود کے معنی میں نہیں رہا، اگرچہ انہی کے حد تک سہی جن کو مشیتِ الٰہی اس سے مستثنیٰ قرار دے۔ میرے نزدیک 'مَا شَآءَ اللّٰهُ' اور 'مَا شَآءَ رَبُّكَ' کی قید یہاں اس خلود کے منتہی ہونے کو ظاہر نہیں کرتی بلکہ اس حقیقت کو ظاہر کرتی ہے کہ ان مجرمین کے لیے اس عذابِ نار میں گرفتار ہو جانے کے بعد امید کے سارے دروازے بند ہو جائیں گے، کسی کی سعی، کسی کی سفارش، کسی کا زور، کسی کی فریاد کچھ کارگر نہ ہو گی، اختیار اور ارادے کی ساری حدیں ختم ہو جائیں گی، توبہ اور اصلاح اور حسرت و ندامت کی مہلتیں گزر جائیں گی۔ واحد چیز جو کارفرما ہو گی وہ خدا کی مشیت ہے اور اپنی مشیت کے بھیدوں کو وہی جانتا ہے۔ وہ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ اور حکیم و علیم ہے۔ قرآن سے جو بات نکلتی ہے وہ تو اسی حد تک ہے۔ جن لوگوں نے اس حد سے آگے بڑھ کر اس سے کچھ اور نتائج نکالنے کی کوشش کی ہے ان کے نتائج کو ان کے دلائل کی کسوٹی پر جانچیے۔ قرآن پر ان کی ذمہ داری ڈالنا صحیح نہیں ہے۔ ویسے یہ امر یاد رہے کہ خلود اور ابدیت کے مسائل ایسے نہیں ہیں جن کا احاطہ انسان کا محدود علم کر سکے۔ اگر انسان ان چیزوں کے چکر میں پڑے تو بات متشابہات کے حدود میں نکل جاتی ہے جن میں پڑنے سے ہم کو روکا گیا ہے۔ اس وجہ سے سلامتی کا راستہ یہی ہے کہ جتنی بات خدا نے بتا دی ہے اس کو مانیے اور اس کے آگے کے مراحل کو خدا کے علم کے حوالے کیجیے۔

شیاطین کے تسلط کی علت

'وَكَذٰلِكَ نُوَلِّيْ بَعْضَ الظّٰلِمِيْنَ بَعْضًا' الآیۃ یہ اشارہ ہے اس بات کی طرف جو اوپر 'يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ قَدِ اسْتَكْثَرْتُمْ مِّنَ الْاِنْسِ' کے ٹکڑے میں مذکور ہوئی اور 'وَلّٰى' ، 'تولیۃ فلانا الامر' کے معنی ہیں فلاں کو اس پر حاکم، والی اور قابض بنا دیا اور اس پر مسلط کر دیا۔ مطلب یہ ہے کہ یہ جو شیاطینِ جن نے بے شمار انسانوں پر اپنا تسلط جما لیا تو اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ ان شیاطین کو انسانوں پر اختیار ملا ہوا تھا بلکہ اس کا سبب خود

ان کے اعمال ہوئے ہیں۔ انھوں نے خدا کی ہدایت چھوڑ کر اپنی خواہشات و بدعات کی پیروی کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہ شیطان کے پیرو بن گئے اور اللہ تعالیٰ کا قاعدہ یہ ہے کہ جو لوگ شیاطین کے پیرو بن جاتے ہیں ان پر وہ شیاطین کو مسلط کر دیتا ہے۔ ظالمین سے مراد یہاں کفر و شرک کی راہ اختیار کرنے والے ہیں۔ یہ مضمون پوری تفصیل سے پیچھے بھی گزر چکا ہے اور آگے بھی مختلف شکلوں میں بیان ہوگا۔

سوال بطور قطع عذر

يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ اَلَمْ يَاْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَقُصُّوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِيْ وَيُنْذِرُوْنَكُمْ لِقَآءَ يَوْمِكُمْ هٰذَا ؕ

سوال ان سے بطور قطع عذر کے ہوگا۔ مطلب یہ ہے کہ شامت زدو، کیا تمھارے پاس تمھی میں سے میری آیتیں سناتے اور اس دن کی آمد سے ہوشیار کرتے ہوئے رسول نہیں آئے؟ پھر تم نے آخر اپنی یہ شامت کیوں بلائی؟ رسول نہ آئے ہوتے تو تم کوئی عذر پیش کر سکتے تھے، اب کیا عذر پیش کر سکتے ہو؟ تم نے تو سب کچھ سن اور سمجھ کے اپنی آنکھیں اور اپنے کان بند رکھے۔

جنوں کے رسول انھی کے اندر سے ہوتے ہیں

'رُسُلٌ مِّنْكُمْ' سے یہ بات صاف معلوم ہوتی ہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے اندر انسانوں ہی میں سے رسول بھیجے اسی طرح جنوں کے اندر جنوں میں سے رسول بھیجے۔ انبیا و رُسل کے باب میں اللہ تعالیٰ کی جو سنت ہے اور جو تفصیل سے قرآن میں بیان ہوئی ہے اس کا لازمی اقتضا بھی یہی ہے کہ جنوں کے اندر انھی کے اندر سے رسول آئیں جو ان کی بولی میں، ان کی ضروریات و حالات کے مطابق ان پر اللہ کی حجت تمام کریں۔ اتمام حجت انبیاء و رسل کی بعثت کا اصل مقصد ہوتا ہے جو بغیر اس کے ممکن نہیں کہ ہر گروہ کے اندر ان کی فطرت کے مطابق رسول آئیں۔ انسان اور جن دو مختلف نوعیں ہیں۔ دونوں کے مسائل اگر کل نہیں تو بیشتر الگ الگ ہیں۔ اشتراک ہو سکتا ہے تو عقائد اور اخلاق کے بعض اصولوں میں ہو سکتا ہے، شریعت، قانون، معاشرت کے مسائل تو لازماً الگ الگ ہوں گے۔ پھر رسول جو اسوہ اور نمونہ بن کر آتے ہیں اگر ان کے اندر سے نہ ہوئے تو وہ ان کے لیے اسوہ اور نمونہ کیسے بن سکتے ہیں؟ جب ہم انسانوں کے لیے جنات میں سے کوئی رسول اسوہ نہیں بن سکتا تو انسانوں میں سے کوئی رسول جنوں کے لیے کیسے اسوہ بن سکتا ہے؟ ہر قوم کا رسول ان کے اندر سے ہونے کا خاص پہلو، اتمام حجت کے نقطۂ نظر سے یہی ہے کہ اس طرح اللہ تعالیٰ گویا اس قوم پر خود اس کی زبان، خود اس کے ضمیر، خود اس کے ایک بھائی اور خود اسی کے ایک فرد کامل کے ذریعے سے اس پر حجت قائم کر دیتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو جنات قیامت کے روز اس سوال کے جواب میں یہ عذر کر سکتے تھے کہ اے رب ہم جنات کے لیے کسی غیر جن کا قول و عمل کس طرح حجت ہو سکتا تھا۔ البتہ یہ بات ضرور ہے کہ جس طرح جنوں کے اشرار و شیاطین اور انسانوں کے اشرار و شیاطین میں حق کی مخالفت کے لیے سنگھٹن ہو جایا کرتا ہے، جیسا کہ اوپر کی آیات میں بیان ہوا، اسی طرح بعض مثالیں ایسی بھی ملتی ہیں کہ جنوں کے اندر جو ابرار و صالحین ہیں ان کی طرف سے اس حق کی بھی تائید ہوتی ہے جو انسانوں کے انبیاء و صالحین کے ذریعے سے ظاہر ہوا ہے اس لیے کہ حق، اصولی حیثیت سے، نہ صرف انسانوں اور جنوں کے درمیان ایک متاع مشترک

کی حیثیت رکھتا ہے بلکہ تمام کائنات کی متاع مشترک ہے۔ اس مسئلے پر انشاء اللہ تفصیل کے ساتھ ہم سورۂ جن میں بحث کریں گے۔ یہاں اس اشارے پر کفایت کیجیے۔

'یَقُصُّوْنَ عَلَیْکُمْ اٰیٰتِیْ' میں ممکن ہے کسی کو 'یَقُصُّ' کا لفظ آیات سنانے کے لیے کھٹکے اس لیے کہ اس لفظ کا معروف استعمال سرگزشتیں سنانے ہی کے لیے ہے۔ ہمارے نزدیک یہاں یہ لفظ اس وجہ سے استعمال ہوا ہے کہ آیات سے یہاں مراد آیات انذار ہیں جن کا غالب حصہ مکذبین و منکرین کے انجام اور ان کی سرگزشتوں کے بیان پر مشتمل ہوتا ہے۔ یہاں موقع و محل اسی کا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان سے جو سوال فرمائے گا اس کا مطلب یہی ہوگا کہ کیا تمھیں میرے رسولوں نے جھٹلانے والوں کے انجام اور اس دن کی آمد سے خبردار نہیں کیا تھا کہ تم نے اپنے آپ کو اس ابدی ہلاکت میں ڈالا۔

اپنی گواہی خود اپنے خلاف

قَالُوْا شَهِدْنَا عَلٰٓى اَنْفُسِنَا وَغَرَّتْهُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا وَشَهِدُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ اَنَّهُمْ كَانُوْا كٰفِرِيْنَ۔ بعینہٖ یہی بات سورہ ملک میں یوں بیان ہوئی ہے۔ كُلَّمَآ اُلْقِيَ فِيْهَا فَوْجٌ سَاَلَهُمْ خَزَنَتُهَآ اَلَمْ يَاْتِكُمْ نَذِيْرٌ ۝ قَالُوْا بَلٰى قَدْ جَآءَنَا نَذِيْرٌ ۝ فَكَذَّبْنَا وَقُلْنَا مَا نَزَّلَ اللّٰهُ مِنْ شَيْءٍ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ كَبِيْرٍ ۝ وَقَالُوْا لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ اَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِيْٓ اَصْحٰبِ السَّعِيْرِ ۝ فَاعْتَرَفُوْا بِذَنْۢبِهِمْ فَسُحْقًا لِّاَصْحٰبِ السَّعِيْرِ ۹-۱۱ ملک (جب جب اس میں جھونکی جائے گی کوئی پارٹی دوزخ کے داروغے اس سے سوال کریں گے، کیا تمھارے پاس کوئی آگاہ کرنے والا نہیں آیا تھا؟ وہ کہیں گے، ہاں، بے شک ہمارے پاس آگاہ کر دینے والا آیا تھا لیکن ہم نے اس کو جھٹلا دیا اور کہا کہ خدا نے کوئی چیز نہیں اتاری ہے، تم لوگ تو ایک بڑی گمراہی میں مبتلا ہو۔ اور وہ کہیں گے اگر ہم سننے اور سمجھنے والے لوگ ہوتے تو دوزخ میں پڑنے والے نہ بنتے۔ پس وہ اپنے جرم کا اعتراف کر لیں گے، پس دفع ہوں یہ دوزخ والے)۔ آیت کے بیچ میں 'غَرَّتْهُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا' کے الفاظ بطور جملہ معترضہ کے اس حقیقت کو ظاہر کر رہے ہیں کہ جس بات کا آج اتنی جسارت سے انکار کر رہے ہیں، کل اس بے بسی کے ساتھ اس کا اعتراف کریں گے اور اپنے خلاف خود گواہ بنیں گے کیونکہ آج ان کے انکار کی بنیاد اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ اس دنیا کی ظاہر فریبی نے ان کو دھوکے میں ڈال رکھا ہے۔ اس دنیا کا کارخانہ چونکہ جزا و سزا کے اصول پر نہیں چل رہا ہے بلکہ ابتلا کے اصول پر چل رہا ہے، جس میں حق کے ساتھ باطل کو بھی مہلت ملی ہوئی ہے اس وجہ سے یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ جزا و سزا ہے ہی نہیں اور نبی جو کچھ کہتے ہیں یہ محض ہوائی باتیں ہیں۔

عذاب سے پہلے اتمام حجت

ذٰلِكَ اَنْ لَّمْ يَكُنْ رَّبُّكَ مُهْلِكَ الْقُرٰى بِظُلْمٍ وَّاَهْلُهَا غٰفِلُوْنَ۔ یہ وجہ بیان فرمائی ہے اس بات کی کہ کیوں یہ اہتمام کیا گیا کہ ہر قوم کے اندر، خواہ انسان ہوں یا جن، انہی کے اندر سے رسول آئیں۔ فرمایا کہ ایسا اس لیے ہوا کہ تیرے رب کی رحمت سے یہ بات بعید تھی کہ وہ کسی قوم کو اس کے کفر و شرک پر، اس کے نتائج و عواقب سے آگاہ کیے بغیر، ان پر عذاب بھیج دے۔ وہ کسی کو سزا

دیتا ہے تو اس سے پہلے ان کو اچھی طرح آگاہ کر دیتا ہے تاکہ وہ توبہ و اصلاح کرنا چاہیں تو توبہ و اصلاح کر لیں اور اگر نہ کرنا چاہیں تو اپنی ذمہ داری پر اس کے نتائج بھگتیں۔

دوزخ میں جرائم کے اعتبار سے درجہ بندی

وَلِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا وَمَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا يَعْمَلُوْنَ لفظ 'کل' پر ہم مختلف مقامات میں لکھ چکے ہیں کہ جب یہ اس طرح آتا ہے تو اس سے مراد وہی اشخاص یا پارٹیاں ہوتی ہیں جن کا ذکر اوپر ہو چکا ہوتا ہے۔ یہاں اس سے مراد جنوں اور انسانوں کے وہی گروہ ہیں جن کا ذکر اوپر گزرا۔ فرمایا کہ انھوں نے جو کچھ کیا، جان بوجھ کر، خدا کی طرف سے اتمامِ حجت کے بعد کیا، اس وجہ سے حق ہے کہ وہ اپنے کیے کی سزا بھگتیں اور جن کے جس درجہ کے جرائم ہیں اسی اعتبار سے وہ دوزخ میں اپنا مقام پائیں۔ چونکہ اللہ ان کے اعمال سے جو یہ کرتے رہے ہیں یا کرتے ہیں اچھی طرح باخبر ہے اس وجہ سے اس کو ان کی درجہ بندی میں کوئی زحمت نہیں پیش آئے گی۔ وہ ہر ایک کے ساتھ وہی معاملہ کرے گا جس کا وہ اپنے اعمال کے اعتبار سے سزاوار ہوگا۔

وَرَبُّكَ الْغَنِيُّ ذُو الرَّحْمَةِ ۭ اِنْ يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ وَيَسْتَخْلِفْ مِنْۢ بَعْدِكُمْ مَّا يَشَاۗءُ كَمَآ اَنْشَاَكُمْ مِّنْ ذُرِّيَّةِ قَوْمٍ اٰخَرِيْنَ ۝ اِنَّ مَا تُوْعَدُوْنَ لَاٰتٍ ۙ وَّمَآ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ ۝ قُلْ يٰقَوْمِ اعْمَلُوْا عَلٰي مَكَانَتِكُمْ اِنِّىْ عَامِلٌ ۚ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۙ مَنْ تَكُوْنُ لَهٗ عَاقِبَةُ الدَّارِ ۭ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ (۱۳۳-۱۳۵)

قریش کو براہ راست دھمکی

اوپر جو باتیں بیان ہوئی تھیں اگرچہ واضح طور پر ان کا رخ قریش ہی کی طرف تھا لیکن ان کی نوعیت اصولی باتوں کی تھی۔ اب یہ صاف صاف قریش کو مخاطب کر کے دھمکی دی کہ جہاں تک اتمامِ حجت کا تعلق ہے اس کا سامان خدا نے تمھارے لیے بھی کر دیا ہے۔ اب تمھاری قسمت بھی میزان میں ہے۔ اگر تم نے اپنے آپ کو نہ سنبھالا تو خدا کی پکڑ میں آ جاؤ گے اور جب اس کی پکڑ میں آ جاؤ گے تو پھر اس کے قابو سے باہر نہ نکل سکو گے۔

اتمامِ حجت کا اہتمام خدا کی رحمت کا تقاضا ہے

وَرَبُّكَ الْغَنِيُّ ذُو الرَّحْمَةِ فرمایا کہ تمھارا خداوند غنی اور بے نیاز بھی ہے اور رحمت والا بھی ہے۔ ہم دوسرے مقام میں واضح کر چکے ہیں کہ صفات جب اس طرح حرف عطف کے بغیر بیان ہوتی ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ یہ صفتیں موصوف میں بیک وقت موجود ہیں۔ وہ ایک ہی وقت میں غنی بھی ہے اور رحمت والا بھی۔ اپنی صفت غنا کی وجہ سے اس کو کسی کی پروا نہیں۔ وہ سب سے بے نیاز، سب سے مستغنی اور سب سے بے پروا ہے۔ سب اس کا انکار کر دیں تو اس کا کچھ نہیں بگڑتا۔ سب اس کی حمد کے ترانے گائیں تو اس کا کچھ نہیں بنتا۔ وہ اگر اپنے رسول بھیجتا ہے، کتاب اتارتا ہے، ایمان و اسلام کی دعوت دیتا ہے تو اس لیے نہیں کہ لوگوں کے ایمان و اسلام کے بغیر اس کا کوئی کام اٹکا ہوا ہے بلکہ یہ سب کچھ اس لیے کرتا ہے کہ بے نیاز ہونے کے ساتھ ساتھ وہ رحمت والا بھی ہے۔ اس کی اس رحمت کا یہ تقاضا ہے کہ وہ لوگوں پر اپنی حجت تمام کیے بغیر ان کو نہیں پکڑتا بلکہ ان پر حجت تمام کرنے کے لیے سارے جتن کرتا ہے اور اس وقت

تک وہ لوگوں کو مہلت دیتا ہے جب تک وہ اپنا پیمانہ اچھی طرح بھر نہ لیں۔ یہ تمہید ہے اس بات کی جو آگے آ رہی ہے۔

اِنْ یَّشَاْ یُذْهِبْكُمْ وَیَسْتَخْلِفْ مِنْۢ بَعْدِكُمْ مَّا یَشَآءُ كَمَآ اَنْشَاَكُمْ مِّنْ ذُرِّیَّةِ قَوْمٍ اٰخَرِیْنَ۔ مطلب یہ ہے کہ تمھاری ان تمام سرکشیوں کے باوجود جو تمھاری پکڑ نہیں ہو رہی ہے تو اس کا سبب یہ نہیں ہے کہ خدا پکڑ نہیں سکتا یا تمھارے فنا ہو جانے سے اس کی دنیا اجڑ جائے گی اور پھر اس کے آباد کرنے والے نہیں ملیں گے بلکہ اس کا واحد سبب اس کی رحمت ہے۔ ورنہ اگر وہ تم کو فنا کرنا چاہے تو جب چاہے فنا کر دے اور تمھاری جگہ جس چیز کو چاہے دے دے۔ اور یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے جو تمھارے قیاس سے بالاتر ہو۔ آخر تم بھی تو اس زمین پر روزِ ازل سے نہیں ہو۔ تم سے پہلے اسی ملک میں دوسری قومیں آباد تھیں جن کی تاریخ تمھیں سنائی جا چکی ہے اور جن کے آثار اس ملک میں موجود ہیں۔ تمھاری ہی طرح خدا نے ان کی طرف بھی رسول بھیجے لیکن انھوں نے سرکشی کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ فنا کر دیے گئے اور بالآخر تم ان کے وارث ہوئے تو جس خدا نے ان کو مٹا کر تمھیں ان کا وارث بنایا، اگر وہ تمھیں مٹا کر دوسروں کو تمھارا وارث بنا دے تو کون ہے جو اس کا ہاتھ پکڑ سکے؟ تمھاری تو اپنی ہی تاریخ تمھارے اوپر حجت ہے۔

زبان کا ایک نکتہ

اس آیت میں زبان کا ایک نکتہ بھی قابلِ توجہ ہے فرمایا کہ وَیَسْتَخْلِفْ مِنْۢ بَعْدِكُمْ مَّا یَشَآءُ حالانکہ بظاہر مَنْ یَّشَآءُ ہونا تھا اس لیے کہ 'ما' کا غالب استعمال بے جان چیزوں ہی کے لیے ہے۔ میرے نزدیک 'مَن' کی جگہ 'ما' کا استعمال اللہ تعالیٰ نے اپنی کامل قدرت کے اظہار اور قریش کے غرور پر ضرب لگانے کے لیے فرمایا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تم اپنی قوت و سطوت پر کیا اترا رہے ہو، خدا کی قدرت تو وہ ہے کہ وہ تمھارے اس صحرا کی جس چیز کو چاہے تمھاری جگہ لینے کے لیے اٹھا کھڑی کرے۔ سیدنا مسیحؑ نے بھی ایک جگہ بنی اسرائیل کو مخاطب کر کے فرمایا ہے کہ تم اس بات پر گھمنڈ نہ کرو کہ تم ابراہیمؑ کی اولاد ہو، میرا خداوند چاہے تو ریگستان کے ذروں سے ابراہیم کے لیے اولاد کھڑی کر دے۔ بعینہٖ یہی زور قرآن کے اس اسلوب میں مضمر ہے بلکہ قرآن کا اسلوب اپنی تعمیم کے پہلو سے زیادہ زوردار ہے۔

اِنَّ مَا تُوْعَدُوْنَ لَاٰتٍ ۙ وَّمَآ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِیْنَ۔ 'تُوْعَدُوْنَ' میں وہ عذاب بھی داخل ہے جس کی، رسول کی تکذیب کی صورت میں، ان کو دھمکی سنا دی گئی تھی اور وہ یوم الحساب بھی جو اس کائنات کی ایک اٹل حقیقت ہے۔ فرمایا کہ یہ دونوں باتیں شدنی ہیں اور جب ان کا ظہور ہوگا تو تم خدا کے قابو سے کسی طرح باہر نہ نکل سکو گے۔ 'اعجزہ الشیء: فاتہ ولم یقدر علیہ'۔ 'اعجزہ الشیء' کے معنی ہوں گے کہ فلاں چیز اس کے قبضہ سے نکل گئی، وہ اس پر قابو نہ پا سکا۔ اس دھمکی میں یہ بات مضمر ہے کہ عذاب کے لیے جلدی نہ مچاؤ، اگر تم نے اپنی روش نہ بدلی تو یہ چیز تو آ کے رہے گی۔

پیغمبر کی طرف سے اعلانِ براءت اور دھمکی

قُلْ یٰقَوْمِ اعْمَلُوْا عَلٰی مَكَانَتِكُمْ اِنِّیْ عَامِلٌ۔ اس میں عربیت کے معروف اسلوب کے مطابق ایک مقابل محذوف ہے۔ یعنی اِنِّیْ عَامِلٌ عَلٰی مَكَانَتِیْ۔ 'مَكَانَةٌ' کے معنی جگہ، منزلت اور مقام کے ہیں۔ قرآن میں یہ جگہ ہی

کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ مثلاً وَلَوْ نَشَاءُ لَمَسَخْنٰهُمْ عَلٰى مَكَانَتِهِمْ ۶۷۔ یٰس (اگر ہم چاہتے ان کی جگہ ہی پر ان کو مسخ کر دیتے) طریقہ کا مفہوم اس لفظ کے لوازم میں سے ہے۔ جب ہم کہیں گے تم اپنی جگہ کام کرو، میں اپنی جگہ کام کرتا ہوں تو طریقہ کا مفہوم اس کے اندر آپ سے آپ پیدا ہو جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب تم اپنے مقام کفر اور موقف مخالفت حق سے ہٹنے کے لیے تیار نہیں ہو تو کر دکھو کرنا چاہتے ہو۔ میں بھی اپنے موقف سے انچ برابر ہٹنے کے لیے تیار نہیں ہوں۔ عربیت کا ذوق رکھنے والے جانتے ہیں کہ اعملو کے مقابل میں اِنِّیْ عَامِلٌ میں زیادہ زور دیا ہے اس لیے کہ صفت اور فاعل کے صیغے فعل کے بالمقابل دوام، استمرار، استقلال اور عزم و جزم کو ظاہر کرتے ہیں۔ الفاظ کے تیور صاف بتا رہے ہیں کہ یہ پیغمبر کی طرف سے صاف صاف برأت کا اعلان اور نہایت واضح الفاظ میں دھمکی ہے۔

اصل دھمکی — 'فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ مَنْ تَكُوْنُ لَهٗ عَاقِبَةُ الدَّارِ' یہ اصل دھمکی ہے۔ یعنی تم بہت جلد دیکھ لوگے کہ انجام کار کی کامیابی کس کو حاصل ہوتی ہے۔ 'عاقبۃ' کا لفظ یوں تو انجام کے معنی میں معروف ہے ہی خواہ نیک انجام ہو یا بد لیکن بعض اوقات یہ مخصوص طور پر انجام خیر و فلاح ہی کے معنی میں آتا ہے۔ یہ گویا لفظ کا استعمال اس کے حقیقی مفہوم کے اعتبار سے ہوتا ہے اس لیے کہ قابلِ ذکر انجام تو وہی ہے جو اس فلاح و سعادت پر منتہی ہو جو اصل غایت ہے اس کائنات کی تخلیق کی نہ کہ نامرادی و خسران کا انجام جو اس غایت سے انحراف کا لازمہ ہے۔ چنانچہ یہ لفظ فلاح و سعادت کے مفہوم میں جگہ جگہ استعمال ہوا ہے مثلاً فَاصْبِرْ اِنَّ الْعَاقِبَةَ لِلْمُتَّقِيْنَ ۴۹ (پس ثابت قدم رہو، عاقبت کار کی کامیابی اہل تقویٰ ہی کے لیے ہے) وَالْعَاقِبَةُ لِلتَّقْوٰى ۱۳۲ طٰہٰ (اور انجام کار کامیابی تقویٰ کے لیے ہے) 'الدار' سے مراد، دار آخرت ہے۔ اس لیے کہ اصل نتائج کے ظہور کی جگہ وہی ہے۔ اہل ایمان دنیا میں جو جد و جہد کرتے ہیں وہ اسی کو سامنے رکھ کر کرتے ہیں۔ اہل ایمان کو دنیا میں جو کامیابی حاصل ہوتی ہے اگرچہ کامیابی وہ بھی ہے لیکن وہ فیصلہ کن نہیں ہے، اس لیے کہ اصل گول یہ دنیا نہیں ہے، اصل گول آخرت ہے۔ جب تک وہ گول نہ جیتا جائے اس وقت تک یہ فیصلہ نہیں کیا جا سکتا کہ کس کی جیت رہی اور کون ہارا۔ اس میں یہ اشارہ بھی مضمر ہے کہ اس دنیا میں مخالفین حق کو جو دندنانے کا موقع دیا جاتا ہے یہ اترانے کی چیز نہیں ہے، یہ عارضی ڈھیل ہے۔ کل انھیں پتہ چلے گا کہ اصل کامیابی کس کو حاصل ہوتی۔

انجام کار کی کامیابی صرف اہل ایمان کا حصہ ہے — 'اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ' اوپر والے ٹکڑے میں جو بات مبہم رہ گئی تھی وہ اس ٹکڑے میں صاف کر دی گئی۔ اوپر یہ فرمایا تھا کہ تم دیکھ لوگے کہ عاقبت کار کی کامیابی کس کو حاصل ہوتی ہے۔ اب یہ بتا دیا کہ انجام کار کی کامیابی میں ان لوگوں کا کوئی حصہ نہیں ہے جو کافر و مشرک اور حق تلف دنیا پرست ہوں گے۔ یہ بات جس حقیقت پر مبنی ہے وہ یہ ہے کہ یہ کائنات اپنے وجود سے شہادت دیتی ہے کہ یہ کسی کھلنڈرے کا کھیل نہیں ہے بلکہ یہ ایک حکیم و علیم اور عادل و رحیم کی پیدا کی ہوئی دنیا ہے پھر یہ کس طرح ممکن ہے کہ انجام کار کی کامیابی وہ ان لوگوں کو بخشے جو ظلم و شرک کے مرتکب ہوئے۔

بات بالکل اصول رنگ میں

یہاں یہ پہلو خاص طور پر قابلِ توجہ ہے کہ بات بالکل اصول کے رنگ میں فرمائی، من و تو کے انداز میں نہیں فرمائی۔ یہ نہیں فرمایا کہ انجام کار کی کامیابی ہمارا حصہ ہے یا آخرت میں فلاح ہم پائیں گے بلکہ صرف یہ فرمایا کہ آخرت کی فلاح میں ظالموں کا کوئی حصہ نہیں ہے۔ یہ اسلوب بیان حکمت و دعوت کے نقطۂ نظر سے بھی نہایت مؤثر ہے اور یہ اس خشیت و توکل پر بھی دلیل ہے جو انبیاء و صالحین کے اندر ہوتی ہے۔ جو چیز پردۂ غیب میں ہے، جس کا فیصلہ ہونا ابھی باقی ہے، جس کی راہ میں ابھی معلوم نہیں کتنی دشوار گزار گھاٹیاں پار کرنی اور کتنی پرخطر وادیاں قطع کرنی ہیں اس کے باب میں جو بات کہی جا سکتی ہے وہ اسی حد تک کہی جا سکتی ہے۔ اس سے آگے بڑھ کر کوئی دعویٰ کرنا بندگی اور خشیت الٰہی کے خلاف ہے۔

وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ مِمَّا ذَرَاَ مِنَ الْحَرْثِ وَالْاَنْعَامِ نَصِيْبًا فَقَالُوْا هٰذَا لِلّٰهِ بِزَعْمِهِمْ وَهٰذَا لِشُرَكَآئِنَا ۚ فَمَا كَانَ لِشُرَكَآئِهِمْ فَلَا يَصِلُ اِلَى اللّٰهِ ۚ وَمَا كَانَ لِلّٰهِ فَهُوَ يَصِلُ اِلٰى شُرَكَآئِهِمْ ۗ سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ ۝ وَكَذٰلِكَ زَيَّنَ لِكَثِيْرٍ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ قَتْلَ اَوْلَادِهِمْ شُرَكَآؤُهُمْ لِيُرْدُوْهُمْ وَلِيَلْبِسُوْا عَلَيْهِمْ دِيْنَهُمْ ۗ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا فَعَلُوْهُ فَذَرْهُمْ وَمَا يَفْتَرُوْنَ ۝ وَقَالُوْا هٰذِهٖٓ اَنْعَامٌ وَّحَرْثٌ حِجْرٌ ۖ لَّا يَطْعَمُهَآ اِلَّا مَنْ نَّشَآءُ بِزَعْمِهِمْ وَاَنْعَامٌ حُرِّمَتْ ظُهُوْرُهَا وَاَنْعَامٌ لَّا يَذْكُرُوْنَ اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهَا افْتِرَآءً عَلَيْهِ ۗ سَيَجْزِيْهِمْ بِمَا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ۝ وَقَالُوْا مَا فِيْ بُطُوْنِ هٰذِهِ الْاَنْعَامِ خَالِصَةٌ لِّذُكُوْرِنَا وَمُحَرَّمٌ عَلٰٓى اَزْوَاجِنَا ۚ وَاِنْ يَّكُنْ مَّيْتَةً فَهُمْ فِيْهِ شُرَكَآءُ ۗ سَيَجْزِيْهِمْ وَصْفَهُمْ ۗ اِنَّهٗ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ ۝ قَدْ خَسِرَ الَّذِيْنَ قَتَلُوْٓا اَوْلَادَهُمْ سَفَهًا ۢ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّحَرَّمُوْا مَا رَزَقَهُمُ اللّٰهُ افْتِرَآءً عَلَى اللّٰهِ ۗ قَدْ ضَلُّوْا وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ (٦ : ١٣٦-١٤٠)

مشرکین کی بدعات کی تفصیل

اس سلسلہ بحث کا آغاز، جیسا کہ آیات ۱۱۸-۱۲۱ سے معلوم ہوا، مشرکین مکہ کی ان بدعات کی تردید سے ہوا تھا جو اپنے مشرکانہ توہمات کے تحت انھوں نے تحریم و تحلیل کی نوعیت کی ایجاد کی تھیں۔ اس تردید کے جواب میں انھوں نے جو ہنگامہ بحث و جدال کھڑا کیا اس کے تقاضے سے بیچ میں بعض مناسب حالات ہدایات مسلمانوں کو دی گئیں اور بعض ضروری تنبیہات مشرکین کو سنائی گئیں۔ اب یہ ان بدعات کی تفصیل آ رہی ہے تاکہ مسلمان اپنے آپ کو ان نجاستوں سے محفوظ رکھیں۔

وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ مِمَّا ذَرَاَ مِنَ الْحَرْثِ وَالْاَنْعَامِ نَصِيْبًا فَقَالُوْا هٰذَا لِلّٰهِ بِزَعْمِهِمْ وَهٰذَا لِشُرَكَآئِنَا یعنی باغ، کھیتی، چوپائے سب پیدا تو کیے خدا نے لیکن ان ظالموں نے ان میں سے خدا کا جو حصہ نکالا تو اس طرح کہ دوسرے شریکوں کے ساتھ ایک حصہ خدا کے لیے بھی الگ کر دیا هٰذَا لِلّٰهِ بِزَعْمِهِمْ وَهٰذَا لِشُرَكَآئِنَا یہ اسی تقسیم کی تفصیل ہے کہ اس میں سے اتنا حصہ تو اللہ کا ہے اور اتنا حصہ ہمارے شریکوں اور معبودوں کا ہے۔ اس تقسیم کے متعلق فرمایا کہ بِزَعْمِهِمْ یہ تمام تر ان کے وہم و گمان پر مبنی ہے لیکن دعویٰ یہ ہے کہ یہ شریعت ابراہیمی کا حکم ہے۔ یہ ملحوظ رہے کہ مشرکین عرب نہ صرف خدا کو مانتے تھے بلکہ ہر چیز کا خالق بھی خدا ہی کو تسلیم کرتے تھے اور اس کے نام کا ایک حصہ اپنی زمینی پیداوار میں سے بھی اور اپنے گلوں میں سے بھی خیر خیرات

اور نذر و نیاز کے لیے الگ کرتے تھے۔ یہ چیز ان کے ہاں حضرت ابراہیمؑ و حضرت اسمٰعیلؑ کے زمانے سے چلی آ رہی تھی۔ چنانچہ حضرت اسمٰعیلؑ کے متعلق خود قرآن میں ہے وَكَانَ يَأْمُرُ أَهْلَهُ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ ۝ مریم (اور وہ اپنے اہل و عیال کو نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیتا تھا) بعد میں جب ان کے اندر مشرکانہ بدعات پھیلیں تو جس طرح خدا کے دوسرے حقوق میں ان کے فرضی معبود شریک بن بیٹھے اسی طرح اس کے نام کی زکوٰۃ بھی انھوں نے اس کے فرضی شریکوں میں تقسیم کر دی کہ اس میں سے اتنا حصہ فلاں کا اتنا فلاں کا۔

حماقت در حماقت

فَمَا كَانَ لِشُرَكَآئِهِمْ فَلَا يَصِلُ إِلَى اللّٰهِ وَمَا كَانَ لِلّٰهِ فَهُوَ يَصِلُ إِلٰى شُرَكَآئِهِمْ سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ یہ ان کے ستم بالائے ستم یا ان کی حماقت در حماقت کا بیان ہے کہ اگر کوئی مجبوری یا مشکل پیش آ جائے تو خدا کا حصہ تو ان کے بتوں کی طرف منتقل ہو سکتا تھا لیکن مجال نہیں تھی کہ بتوں کا حصہ کسی حال میں خدا کی طرف منتقل ہو سکے۔ گویا حق مرجح بتوں اور شریکوں ہی کا تھا۔ قرآن نے دوسری جگہ بیان فرمایا ہے کہ مشرکین اپنے معبودوں اور شریکوں سے خدا کے بالمقابل زیادہ محبت کرتے ہیں۔ یہ چیز کچھ مشرکین مکہ ہی کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ یہ تمام مشرک قوموں کی مشترک خصوصیت بلکہ خود شرک کی فطرت ہے۔ مشرکین جن چیزوں کو خدا کا شریک بناتے ہیں ظاہر ہے کہ اس خیال سے بناتے ہیں کہ ان کی تمام نقد ضروریات انہی سے وابستہ ہیں اور اگر خدا سے کوئی ضرورت وابستہ ہے بھی تو بہر حال وہ بھی انہی کی وساطت سے پوری ہونی ہے۔ یہاں تک کہ اگر خدا نہ بھی پوری کرنی چاہے جب بھی اگر یہ چاہیں تو پوری کرا ہی لیتے ہیں۔ اس خیال کے ہوتے ظاہر ہے کہ خدا کی اہمیت کچھ باقی نہیں رہ جاتی۔ چنانچہ ان مشرکین کے نزدیک بھی خدا کی حیثیت نعوذ باللہ گھر کے ایک بڑے بوڑھے ناکارہ وجود سے زیادہ نہیں رہ گئی تھی۔ چنانچہ وہ اسی حیثیت سے اس کے ساتھ معاملہ بھی کرتے تھے۔ اس کے نام پر روایت کے تحت کچھ نکال تو دیتے لیکن اگر اتفاق سے کسی بت کے نام کی بکری مر گئی یا چوری ہو گئی یا اس کے نام کا غلہ چوہے کھا گئے تو اس کی تلافی لازماً خدا کے حصے میں سے کر دی جاتی اور اگر اسی قسم کی کوئی آفت خدا کے نام پر نکالے ہوئے حصہ پر آ جاتی تو یہ ممکن نہ تھا کہ اس کی تلافی معبودوں کے حصے کے مال سے کرنے کی جرأت کریں۔ فرمایا کہ کتنا برا فیصلہ ہے جو یہ کرتے ہیں! اول تو سب کچھ بخشا ہوا خدا کا اور اس کے حصہ میں یہ من مانا بٹوارہ! پھر فرضی معبودوں کی یہ ناز برداری اور معبود حقیقی سے یہ بے پروائی اور اس کی یہ ناقدری۔

غضبناک بھوتوں کی خوشنودی کے لیے قتل اولاد

كَذٰلِكَ زَيَّنَ لِكَثِيْرٍ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ قَتْلَ أَوْلَادِهِمْ شُرَكَآؤُهُمْ یعنی ان کے یہ شرکا صرف مالوں ہی میں حصہ دار نہیں ہیں بلکہ خدا کی بخشی ہوئی جانوں میں بھی حصہ دار بنا دیے گئے ہیں۔ بہت سے مشرکین ان کی خوشنودی کے لیے اپنی اولاد بھی ان کی بھینٹ چڑھا دیتے ہیں۔ ہم آیت ۱۰۰ کے تحت بیان کر آئے ہیں کہ یہ سنگین جرم بعض مزعومہ سرکش جن بھوتوں کو راضی رکھنے کے لیے کیا جاتا تھا۔ غالباً سخت قسم کے جاہل مشرکین اس وہم کے تحت کہ فلاں وادی یا فلاں درخت کے جن کو انھوں نے اپنی کسی اولاد کی نذر دے کر راضی نہ رکھا تو وہ ان کی ساری اولاد یا ان کے سارے خاندان پر آفت لائے گا یہ حرکت کرتے تھے۔

اس قسم کے اوہام تمام مشرک اور وہم پرست قوموں کے اندر پہلے بھی موجود تھے اور زمانہ کی ترقی کے باوجود اب بھی بعض قوموں کے نچلے طبقات میں پائے جاتے ہیں۔ ان اوہام کے پختہ کرنے میں شیاطین جن کے ان ایجنٹوں کو بڑا دخل ہوتا ہے جو انسانوں میں سے ان کے مرید بن جاتے ہیں۔ عرب جاہلیت میں جہاں جہاں بھوتوں کے تھان اور استھان تھے ان کے پروہت، کاہن اور مجاور اپنی طرف رجوع کرنے والے سادہ لوحوں کو ورغلاتے کہ فلاں جن تم پر بڑا غضب ناک ہے، اگر تم نے اپنے کسی بیٹے یا بیٹی کی قربانی دے کر اس کو راضی نہ کیا تو وہ تمہارے سارے خاندان کو چٹ کر جائے گا۔ بے وقوف لوگ ان کے چکمے میں آکر یہ بیدردانہ اور سنگدلانہ جرم کر بیٹھتے اور اس طرح اپنے دین اور اپنی دنیا دونوں برباد کرتے۔

دین اور دنیا دونوں کی بربادی

لِيُرْدُوهُمْ وَلِيَلْبِسُوا عَلَيْهِمْ دِينَهُمْ ، دِينَهُمْ (ان کے دین) سے مراد وہ دین ہے جو ان کو حضرت ابراہیمؑ و حضرت اسماعیلؑ سے وراثت میں ملا تھا۔ مطلب یہ ہے کہ شیاطین جن و انس نے سادہ لوحوں اور کم عقلوں کو اس جال میں پھنسا کر ان کو مادی و روحانی دونوں قسم کی ہلاکتوں میں مبتلا کیا۔ ایک طرف ان کو اولاد جیسی نعمت سے محروم کیا، دوسری طرف ابراہیمؑ کا سکھایا ہوا سیدھا سادا فطری دین ان کے لیے ایک گورکھ دھندا بن کے رہ گیا۔

ہدایت و ضلالت کے باب میں سنتِ الٰہی

وَلَوْ شَاءَ اللّٰهُ مَا فَعَلُوهُ فَذَرْهُمْ وَمَا يَفْتَرُونَ یہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی ہے کہ اگر یہ اپنی ان حماقتوں اور سنگ دلانہ حرکتوں کی حمایت میں تم سے لڑتے جھگڑتے ہیں، تمہاری بات سننے کے لیے تیار نہیں ہیں تو ان کو ان کے من گھڑت فتنوں میں پڑے رہنے دو۔ تمہارا کام کسی کو باندھ کر راہ پر لگانا نہیں ہے۔ اللہ نے اس دنیا میں باطل کو بھی مہلت دی ہے جو باطل پر جمے رہنا چاہتے ہیں خدا ان کو ان کے باطل ہی پر چھوڑ دیتا ہے۔ ہدایت و ضلالت کے معاملے میں اس نے جبر کو پسند نہیں فرمایا ہے۔ اگر وہ اپنی مشیت کے زور سے لوگوں کو ہدایت پر لانا چاہتا تو یہ سب ہدایت پر ہوتے، کوئی بھی اس گمراہی پر جما نہ رہ سکتا۔ جب یہ سنت الٰہی ہے تو تم ان کی اس ہٹ دھرمی سے کیوں پریشان ہو۔

پروہتوں کی من گھڑت شریعت

وَقَالُوا هٰذِهٖٓ اَنْعَامٌ وَّحَرْثٌ حِجْرٌ لَّا يَطْعَمُهَآ اِلَّا مَنْ نَّشَآءُ بِزَعْمِهِمْ ، حِجْرٌ کے معنی ممنوع کے ہیں لیکن یہ لفظ عرب جاہلیت کی ایک دینی اصطلاح ہے۔ اس سے مراد وہ چیز ہوتی ہے جو کسی دینی رسم کے تحت ممنوع (TABOO) ہو۔ اسلامی اصطلاح اس کے لیے حرام کی ہے۔ یہ ان کے تھانوں اور استھانوں کے پروہتوں اور مجاوروں کے من گھڑت فتوے نقل ہو رہے ہیں۔ ان کے ہاں زمینی پیداوار اور چوپایوں کے جو چڑھاوے پیش ہوتے ان کے کھانے کے باب میں چڑھاوے کی نوعیت کے اعتبار سے بڑی بڑی قیدیں اور پابندیاں تھیں۔ مثلاً مرد کھا سکتے ہیں، عورتیں نہیں کھا سکتیں، یا بیوہ کھا سکتی ہے سہاگن یا کنواری نہیں ہاتھ لگا سکتی یا اس کے برعکس۔ اس قسم کی حماقتیں ہمارے ہاں بھی بدعتی گھرانوں میں پائی جاتی ہیں۔ یہ فتوے چونکہ تمام تر ان پروہتوں کی خود ساختہ شریعت پر مبنی تھے اور وہی اس کے عالم بھی تھے اس وجہ سے نہ کوئی دوسرا اس میں اپنا کوئی اقول لگا سکتا تھا نہ سرمو اس

سے انحراف اختیار کر سکتا تھا۔ ان کے اسی تحکم کو اِلَّا مَنْ نَّشَآءُ بِزَعْمِهِمْ کے الفاظ سے تعبیر فرمایا ہے۔

وَاَنْعَامٌ حُرِّمَتْ ظُهُوْرُهَا وَاَنْعَامٌ لَّا يَذْكُرُوْنَ اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهَا افْتِرَآءً عَلَيْهِ، بعض قسم کے جانوروں پر سواری کرنا ناجائز تھا۔ اس کی بعض مثالیں مائدہ آیت ۱۰۳ کے تحت گزر چکی ہیں۔ بعض قسم کی نذروں اور چڑھاؤں پر ان کے ذبح کے وقت خدا کا نام نہیں لیتے تھے۔ یہ ملحوظ رہے کہ اہل عرب ملت ابراہیمؑ کی روایات کے زیر اثر ذبح کے صحیح طریقے سے آشنا تھے اور ذبح کے وقت وہ خدا کا نام بھی لیتے تھے لیکن مشرکانہ رسوم و عقائد کے غلبہ نے ان کو اس طریقہ سے ہٹا کر ایک بالکل غلط راہ پر ڈال دیا۔ ازاں جملہ یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ بعض قسم کے چوپایوں پر وہ خدا کا نام لینا اپنی مشرکانہ شریعت کے خلاف سمجھتے تھے۔ ان کی یہ ساری خرافات مبنی تو تھیں ان کے مشرکانہ اوہام پر لیکن جس طرح وہ اپنی ساری ہی حماقتوں کو اللہ کی تعلیم کی طرف منسوب کرتے اسی طرح ان حماقتوں کو بھی اللہ کی طرف منسوب کرتے تھے اس وجہ سے قرآن نے اس کو افترا سے تعبیر فرمایا اور دھمکی دی کہ اللہ عنقریب ان کو اس افترا کی سزا دے گا۔

وَقَالُوْا مَا فِيْ بُطُوْنِ هٰذِهِ الْاَنْعَامِ خَالِصَةٌ لِّذُكُوْرِنَا وَمُحَرَّمٌ عَلٰٓى اَزْوَاجِنَا وَاِنْ يَّكُنْ مَّيْتَةً فَهُمْ فِيْهِ شُرَكَآءُ، یہ بھی انہی خانہ ساز فتووں کے قسم کی ایک بات ہے۔ بعض چوپایوں کے پیٹ سے پیدا ہونے والے بچوں کے متعلق مشرکانہ توہمات کے تحت ان کا فتویٰ یہ تھا کہ مردوں کے لیے ان کا کھانا جائز ہے، عورتوں کے لیے ناجائز۔ ہاں اگر بچہ مردہ پیدا ہو تو اس کے کھانے میں مرد عورت دونوں شریک ہو سکتے ہیں۔ فرمایا کہ سَيَجْزِيْهِمْ وَصْفَهُمْ اِنَّهٗ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ، یہ جو من مانے فتوے دیے جا رہے ہیں اللہ ان کو عنقریب اس کا بدلہ دے گا۔ اس کے علم و حکمت کے یہ بات منافی ہے کہ وہ ان لوگوں کو سزا نہ دے جو اس جسارت کے ساتھ اس کے نام پر شریعت سازی کے کارخانے کھول لیں۔ اس میں ایک لطیف اشارہ اس بات کی طرف بھی ہے کہ ان لوگوں سے نمٹنے میں جو دیر ہو رہی ہے یہ اس کے علم و حکمت پر مبنی ہے۔ خدا کے ہاں دیر ہے لیکن اندھیر نہیں۔

قَدْ خَسِرَ الَّذِيْنَ قَتَلُوْٓا اَوْلَادَهُمْ سَفَهًا بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّحَرَّمُوْا مَا رَزَقَهُمُ اللّٰهُ افْتِرَآءً عَلَى اللّٰهِ، یہ ان تمام حماقتوں پر جو اوپر مذکور ہوئیں اور ان کے مرتکبین کی بدانجامی پر اظہار افسوس ہے کہ بغیر کسی خدائی سند کے محض حماقت سے، اللہ پر افترا کر کے انھوں نے اپنی اولادوں کو قتل کیا اور اللہ کے بخشے ہوئے رزق کو اپنے اوپر حرام کیا۔ ان کی بدبختی و نامرادی میں کیا شبہ کی گنجائش ہے۔ یہ لوگ راہ حق سے بھٹکے اور اللہ نے اپنے پیغمبر کے ذریعہ سے ان کو اپنی راہ دکھائی تو اپنی بدبختی کے سبب سے اس کو اختیار کرنے والے نہ بنے۔ قَدْ ضَلُّوْا وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ۔

۲۱۔ آگے کا مضمون ـــــ آیات ۱۴۱-۱۶۵

آگے ان بدعات کی تردید فرمائی ہے جو اوپر مذکور ہوئیں۔ اس تردید کے کئی پہلو ہیں۔

اوّل یہ کہ زمین کی پیداوار ہو یا مال مویشی، سب خدا ہی نے پیدا کیے ہیں اور اسی کی عنایت سے تمھیں ملے ہیں۔ تو ان سے فائدہ اٹھاؤ، خدا کا شکر ادا کرو، ان میں سے خدا کا حق ادا کرو اور شیطان کی پیروی میں اپنے جی سے، مشرکانہ توہمات کے تحت، حلال و حرام نہ ٹھہراؤ، شیطان تمھارا کھلا ہوا دشمن ہے۔

دوسرا یہ کہ تمام چوپایوں میں سے نر و مادہ دونوں کو لے کر ایک ایک سے متعلق سوال کیا ہے کہ بتاؤ ان میں سے نر حرام ہے یا مادہ اور مطالبہ کیا کہ کسی سند سے یہ ثابت کرو کہ ان چوپایوں میں سے کوئی ایک بھی ملّتِ ابراہیمؑ میں حرام تھا۔ جب ان میں سے کسی کی حرمت تم کسی دلیل سے ثابت نہیں کر سکتے تو انھی کی نسل سے پیدا شدہ جانوروں میں سے کوئی حرام اور کوئی حلال کس طرح بن جائے گا؟ آخر ایک ہی درخت کے کچھ پھل جائز اور کچھ ناجائز ہونے کے کیا معنی؟

تیسرا یہ کہ ملّتِ ابراہیمؑ کے حلال و حرام سے متعلق جو وحی مجھ پر آئی ہے اس میں تو فلاں فلاں چیزوں کے سوا اور کسی چیز کی حرمت کا ذکر نہیں ہے۔ یہود پر جو چیزیں حرام ہوئیں وہ بھی وہی ہیں جو ملّتِ ابراہیمؑ میں حرام تھیں بجز ان چیزوں کے جو ان کی سرکشی کے نتیجے میں ان پر حرام کی گئیں۔

اس کے بعد ملّت ابراہیمؑ کی بنیادی تعلیمات کا حوالہ دیا اور فرمایا کہ اسی صراط مستقیم کی تمھیں دعوت دی جا رہی ہے تو اس سے منحرف ہو کر گمراہی کی وادیوں میں نہ بھٹکو۔ اس کے ساتھ حضرت موسیٰؑ کو جو شریعت عطا ہوئی اس کا حوالہ دیا کہ وہ بھی ان کے لیے، جنھوں نے اس کو صحیح طریقہ پر قبول کیا، اسی راہ کی طرف رہنمائی کرنے والی تھی۔

اس کے بعد اس احسانِ عظیم کا ذکر فرمایا جو اس قرآن کو نازل کر کے اللہ تعالیٰ نے اہل عرب پر کیا اور یہ تنبیہ فرمائی کہ یہ کتاب اتار کر اللہ نے تم پر حجت تمام کر دی ہے۔ اب تمھارے پاس کوئی عذر باقی نہیں رہا ہے۔ اگر اس کو ماننے کے لیے عذاب کے منتظر ہو تو یاد رکھو کہ عذاب آ جانے پر جو ایمان لایا جاتا ہے وہ نافع نہیں ہوا کرتا۔

آخر میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے اعلان کرایا کہ خدا نے مجھے تو ملّتِ ابراہیمؑ کی ہدایت بخش دی۔ میری نماز، قربانی، زندگی اور موت سب اللہ رب العالمین کے لیے ہے۔ تم میں سے جو یہ راہ اختیار کرنی چاہے، اختیار کرے ورنہ خدا کے حضور جواب دہی کے لیے تیار رہے۔ وہاں ہر ایک کو اپنی جواب دہی خود کرنی ہے۔ کوئی دوسرا اس کے بوجھ کو اٹھانے والا نہ ہوگا۔ ساتھ ہی قریش کو تنبیہ فرمائی کہ تم پہلی قوم نہیں ہو جو دنیا کے اسٹیج پر نمودار ہوئی ہو۔ تم سے پہلے بھی قومیں آ چکی ہیں اور اپنی سرکشیوں کے نتیجہ میں کیفر کردار کو پہنچ چکی ہیں۔ اگر ان کے جانشین ہو کر تم نے بھی وہی روش اختیار کی تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ تمھارے معاملے میں سنت الٰہی بدل جائے۔ تم بھی اسی انجام کو پہنچو گے جس کو وہ پہنچیں —— اس روشنی میں آگے کی آیات کی تلاوت فرمائیے۔

وَهُوَ الَّذِيْٓ اَنْشَاَ جَنّٰتٍ مَّعْرُوْشٰتٍ وَّغَيْرَ مَعْرُوْشٰتٍ وَّالنَّخْلَ وَالزَّرْعَ مُخْتَلِفًا اُكُلُهٗ وَالزَّيْتُوْنَ وَالرُّمَّانَ مُتَشَابِهًا وَّغَيْرَ مُتَشَابِهٍ ؕ كُلُوْا مِنْ ثَمَرِهٖٓ اِذَآ اَثْمَرَ وَاٰتُوْا حَقَّهٗ يَوْمَ حَصَادِهٖ ۖ وَلَا تُسْرِفُوْا ؕ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ ﴿١٤١﴾ وَمِنَ الْاَنْعَامِ حَمُوْلَةً وَّفَرْشًا ؕ كُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ؕ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ﴿١٤٢﴾ ثَمٰنِيَةَ اَزْوَاجٍ ۚ مِنَ الضَّاْنِ اثْنَيْنِ وَمِنَ الْمَعْزِ اثْنَيْنِ ؕ قُلْ ءٰٓالذَّكَرَيْنِ حَرَّمَ اَمِ الْاُنْثَيَيْنِ اَمَّا اشْتَمَلَتْ عَلَيْهِ اَرْحَامُ الْاُنْثَيَيْنِ ؕ نَبِّـُٔوْنِيْ بِعِلْمٍ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿١٤٣﴾ وَمِنَ الْاِبِلِ اثْنَيْنِ وَمِنَ الْبَقَرِ اثْنَيْنِ ؕ قُلْ ءٰٓالذَّكَرَيْنِ حَرَّمَ اَمِ الْاُنْثَيَيْنِ اَمَّا اشْتَمَلَتْ عَلَيْهِ اَرْحَامُ الْاُنْثَيَيْنِ ؕ اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ اِذْ وَصّٰىكُمُ اللّٰهُ بِهٰذَا ۚ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا لِّيُضِلَّ النَّاسَ بِغَيْرِ عِلْمٍ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿١٤٤﴾ ع قُلْ لَّآ اَجِدُ فِيْ مَآ اُوْحِيَ اِلَيَّ مُحَرَّمًا عَلٰى طَاعِمٍ يَّطْعَمُهٗٓ اِلَّآ اَنْ يَّكُوْنَ مَيْتَةً اَوْ دَمًا مَّسْفُوْحًا اَوْ لَحْمَ خِنْزِيْرٍ فَاِنَّهٗ رِجْسٌ اَوْ فِسْقًا اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ ۚ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَاِنَّ رَبَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿١٤٥﴾ وَعَلَى الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا كُلَّ ذِيْ ظُفُرٍ ۚ وَمِنَ الْبَقَرِ وَالْغَنَمِ حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ شُحُوْمَهُمَآ اِلَّا مَا حَمَلَتْ ظُهُوْرُهُمَا

آيات ١٤١-١٦٥

أَوِ الْحَوَايَا أَوْ مَا اخْتَلَطَ بِعَظْمٍ ۚ ذَٰلِكَ جَزَيْنَاهُم بِبَغْيِهِمْ ۖ وَإِنَّا لَصَادِقُونَ ﴿١٤٦﴾
فَإِن كَذَّبُوكَ فَقُل رَّبُّكُمْ ذُو رَحْمَةٍ وَاسِعَةٍ ۖ وَلَا يُرَدُّ بَأْسُهُ عَنِ
الْقَوْمِ الْمُجْرِمِينَ ﴿١٤٧﴾ سَيَقُولُ الَّذِينَ أَشْرَكُوا لَوْ شَاءَ اللَّهُ مَا
أَشْرَكْنَا وَلَا آبَاؤُنَا وَلَا حَرَّمْنَا مِن شَيْءٍ ۚ كَذَٰلِكَ كَذَّبَ الَّذِينَ
مِن قَبْلِهِمْ حَتَّىٰ ذَاقُوا بَأْسَنَا ۗ قُلْ هَلْ عِندَكُم مِّنْ عِلْمٍ
فَتُخْرِجُوهُ لَنَا ۖ إِن تَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ وَإِنْ أَنتُمْ إِلَّا تَخْرُصُونَ ﴿١٤٨﴾
قُلْ فَلِلَّهِ الْحُجَّةُ الْبَالِغَةُ ۖ فَلَوْ شَاءَ لَهَدَاكُمْ أَجْمَعِينَ ﴿١٤٩﴾
قُلْ هَلُمَّ شُهَدَاءَكُمُ الَّذِينَ يَشْهَدُونَ أَنَّ اللَّهَ حَرَّمَ هَٰذَا ۖ
فَإِن شَهِدُوا فَلَا تَشْهَدْ مَعَهُمْ ۚ وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَ الَّذِينَ كَذَّبُوا
بِآيَاتِنَا وَالَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ وَهُم بِرَبِّهِمْ يَعْدِلُونَ ﴿١٥٠﴾ ع ١٨ ٥
قُلْ تَعَالَوْا أَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ ۖ أَلَّا تُشْرِكُوا بِهِ شَيْئًا
وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا ۖ وَلَا تَقْتُلُوا أَوْلَادَكُم مِّنْ إِمْلَاقٍ ۖ نَّحْنُ
نَرْزُقُكُمْ وَإِيَّاهُمْ ۖ وَلَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ ۖ
وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِي حَرَّمَ اللَّهُ إِلَّا بِالْحَقِّ ۚ ذَٰلِكُمْ وَصَّاكُم
بِهِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ ﴿١٥١﴾ وَلَا تَقْرَبُوا مَالَ الْيَتِيمِ إِلَّا بِالَّتِي
هِيَ أَحْسَنُ حَتَّىٰ يَبْلُغَ أَشُدَّهُ ۖ وَأَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيزَانَ بِالْقِسْطِ ۖ
لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا ۖ وَإِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوا وَلَوْ كَانَ
ذَا قُرْبَىٰ ۖ وَبِعَهْدِ اللَّهِ أَوْفُوا ۚ ذَٰلِكُمْ وَصَّاكُم بِهِ لَعَلَّكُمْ

تَذَكَّرُونَ ﴿١٥٢﴾ وَأَنَّ هَٰذَا صِرَاطِي مُسْتَقِيمًا فَاتَّبِعُوهُ ۖ وَلَا تَتَّبِعُوا
السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَن سَبِيلِهِ ۚ ذَٰلِكُمْ وَصَّاكُم بِهِ لَعَلَّكُمْ
تَتَّقُونَ ﴿١٥٣﴾ ثُمَّ آتَيْنَا مُوسَى الْكِتَابَ تَمَامًا عَلَى الَّذِي أَحْسَنَ
وَتَفْصِيلًا لِّكُلِّ شَيْءٍ وَهُدًى وَرَحْمَةً لَّعَلَّهُم بِلِقَاءِ رَبِّهِمْ
يُؤْمِنُونَ ﴿١٥٤﴾ وَهَٰذَا كِتَابٌ أَنزَلْنَاهُ مُبَارَكٌ فَاتَّبِعُوهُ وَاتَّقُوا لَعَلَّكُمْ ع ١٩ ٦
تُرْحَمُونَ ﴿١٥٥﴾ أَن تَقُولُوا إِنَّمَا أُنزِلَ الْكِتَابُ عَلَىٰ طَائِفَتَيْنِ مِن
قَبْلِنَا وَإِن كُنَّا عَن دِرَاسَتِهِمْ لَغَافِلِينَ ﴿١٥٦﴾ أَوْ تَقُولُوا لَوْ أَنَّا أُنزِلَ
عَلَيْنَا الْكِتَابُ لَكُنَّا أَهْدَىٰ مِنْهُمْ ۚ فَقَدْ جَاءَكُم بَيِّنَةٌ مِّن
رَّبِّكُمْ وَهُدًى وَرَحْمَةٌ ۚ فَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّن كَذَّبَ بِآيَاتِ اللَّهِ
وَصَدَفَ عَنْهَا ۗ سَنَجْزِي الَّذِينَ يَصْدِفُونَ عَنْ آيَاتِنَا سُوءَ
الْعَذَابِ بِمَا كَانُوا يَصْدِفُونَ ﴿١٥٧﴾ هَلْ يَنظُرُونَ إِلَّا أَن
تَأْتِيَهُمُ الْمَلَائِكَةُ أَوْ يَأْتِيَ رَبُّكَ أَوْ يَأْتِيَ بَعْضُ آيَاتِ رَبِّكَ ۗ يَوْمَ
يَأْتِي بَعْضُ آيَاتِ رَبِّكَ لَا يَنفَعُ نَفْسًا إِيمَانُهَا لَمْ تَكُنْ آمَنَتْ
مِن قَبْلُ أَوْ كَسَبَتْ فِي إِيمَانِهَا خَيْرًا ۗ قُلِ انتَظِرُوا إِنَّا
مُنتَظِرُونَ ﴿١٥٨﴾ إِنَّ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا لَّسْتَ
مِنْهُمْ فِي شَيْءٍ ۚ إِنَّمَا أَمْرُهُمْ إِلَى اللَّهِ ثُمَّ يُنَبِّئُهُم بِمَا كَانُوا
يَفْعَلُونَ ﴿١٥٩﴾ مَن جَاءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهُ عَشْرُ أَمْثَالِهَا ۖ وَمَن جَاءَ
بِالسَّيِّئَةِ فَلَا يُجْزَىٰ إِلَّا مِثْلَهَا وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ ﴿١٦٠﴾ قُلْ إِنَّنِي

هَدٰىنِيْ رَبِّيْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ڬ دِيْنًا قِيَمًا مِّلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا ۚ
وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۱۶۱﴾ قُلْ اِنَّ صَلَاتِيْ وَنُسُكِيْ وَمَحْيَايَ
وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۶۲﴾ لَا شَرِيْكَ لَهٗ ۚ وَبِذٰلِكَ اُمِرْتُ
وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ ﴿۱۶۳﴾ قُلْ اَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْغِيْ رَبًّا وَّهُوَ رَبُّ كُلِّ
شَيْءٍ ۭ وَلَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ اِلَّا عَلَيْهَا ۚ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ۚ
ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمْ مَّرْجِعُكُمْ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ﴿۱۶۴﴾
وَهُوَ الَّذِيْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ الْاَرْضِ وَرَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ
دَرَجٰتٍ لِّيَبْلُوَكُمْ فِيْ مَآ اٰتٰىكُمْ ۭ اِنَّ رَبَّكَ سَرِيْعُ الْعِقَابِ ڮ
ع ۲۰ ۱۱ وَاِنَّهٗ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۶۵﴾

ترجمہ آیات ۱۴۱-۱۶۵ اور وہی خدا ہے جس نے باغ پیدا کیے۔ کچھ ٹٹیوں پر چڑھائے جاتے ہیں کچھ نہیں
چڑھائے جاتے۔ اور کھجور اور کھیتی پیدا کی مختلف النوع پیدا وار کی۔ اور زیتون اور انار
باہمدگر ملتے جلتے بھی اور ایک دوسرے سے مختلف بھی۔ ان کے پھلوں سے فائدہ اٹھاؤ
جب وہ پھلیں اور اس کی کٹائی کے وقت اس کا حق ادا کرو اور اسراف نہ کرو۔ اللہ اسراف
کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا اور اس نے چوپایوں میں بڑے قد کے بھی پیدا کیے اور چھوٹے
قد کے بھی تو اللہ نے جو کچھ تمھیں بخشا ہے ان سے فائدہ اٹھاؤ اور شیطان کے نقش قدم کی
پیروی نہ کرو، بے شک وہ تمہارا کھلا ہوا دشمن ہے۔ ۱۴۱-۱۴۲

چوپایوں کی آٹھوں قسموں کو لو، بھیڑوں میں سے نر و مادہ دو اور بکریوں میں سے
نر و مادہ دو، پھر ان سے پوچھو کہ ان دونوں کے نروں کو حرام کیا ہے یا دونوں مادینوں

کو یا اس بچے کو جو ان مادنیوں کے رحم میں ہے؟ اگر تم سچے ہو تو کسی سند کے ساتھ مجھے بتاؤ۔ اسی طرح لو اونٹوں میں سے نر و مادہ دو اور گائے بیل میں سے نر و مادہ دو، پھر پوچھو کہ ان دونوں کے نروں کو حرام ٹھہرایا ہے یا ان کی ماداؤں کو یا اس بچے کو جو ماداؤں کے پیٹ میں ہے؟ کیا تم اس وقت موجود تھے جب اللہ نے تمھیں اس کی ہدایت فرمائی؟ تو ان سے بڑھ کر ظالم کون ہے جو اللہ پر جھوٹ باندھے تاکہ لوگوں کو گمراہ کرے بغیر کسی علم کے۔ بے شک اللہ ظالموں کو راہ یاب نہیں کرے گا۔ ۱۴۳-۱۴۴

کہہ دو، میں تو اس وحی میں جو مجھ پر آئی ہے کسی کھانے والے پر کوئی چیز جس کو وہ کھائے حرام نہیں پاتا بجز اس کے کہ وہ مردار ہو یا بہایا ہوا خون یا سور کا گوشت کہ یہ چیزیں بے شک ناپاک ہیں یا فسق کرکے اس کو غیر اللہ کے لیے نامزد کیا گیا ہو۔ اس پر بھی جو مجبور ہو جائے، نہ چاہنے والا بنے اور نہ حد سے بڑھنے والا تو تیرا رب بخشنے والا اور مہربان ہے۔ ۱۴۵

اور جو یہودی ہوئے ان پر ہم نے سارے ناخن والے جانور حرام کیے اور گائے اور بکری کی چربی حرام کی بجز اس کے جو ان کی پیٹھ یا انتڑیوں سے وابستہ یا کسی ہڈی سے لگی ہوئی ہو۔ یہ ہم نے ان کو ان کی سرکشی کی سزا دی اور ہم بالکل سچے ہیں۔ پس اگر وہ تمھیں جھٹلائیں تو کہہ دو کہ تمھارا رب بڑی وسیع رحمت والا ہے اور اس کا عذاب مجرموں سے ٹالا نہ جا سکے گا۔ ۱۴۶-۱۴۷

جنھوں نے شرک کیا وہ کہیں گے اگر اللہ چاہتا تو نہ ہم شرک کرتے نہ ہمارے باپ دادا اور نہ ہم کسی چیز کو حرام کرتے۔ اسی طرح جھٹلایا ان لوگوں نے بھی جو ان سے پہلے گزرے یہاں تک کہ انھوں نے ہمارا عذاب چکھا۔ پوچھو تمھارے پاس ہے اس کی کوئی

سند کہ تم اس کو ظاہر کر سکو۔ تم محض گمان کی پیروی کر رہے ہو اور محض اٹکل کے تیر تکے چلا رہے ہو۔ کہہ دو کہ اللہ کے لیے تو بس حجت ہے پہنچ جانے والی اور اگر وہ چاہتا تو تم سب کو ہدایت دے دیتا۔ کہو، لاؤ اپنے ان گواہوں کو جو شاہد ہیں کہ اللہ نے فلاں چیز حرام ٹھہرائی ہے۔ پس اگر وہ شہادت دیں تو تم ان کے ساتھ شہادت نہ دیجیو اور ان لوگوں کی خواہشوں کی پیروی نہ کیجیو جنھوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا، جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے اور وہ اپنے رب کے ہمسر ٹھہراتے ہیں۔ ۱۴۸-۱۵۰

کہو، آؤ میں سناؤں جو چیزیں تم پر تمھارے رب نے حرام کی ہیں۔ وہ یہ ہے کہ تم کسی چیز کو اس کا شریک نہ ٹھہراؤ اور ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک کرو، اور اپنی اولاد کو افلاس کے اندیشے سے قتل نہ کرو۔ ہم ہی تم کو بھی روزی دیتے ہیں اور ان کو بھی۔ اور بے حیائی کے کاموں کے پاس نہ پھٹکو، خواہ ظاہر ہو یا پوشیدہ۔ اور جس جان کو اللہ نے حرام ٹھہرایا اس کو قتل نہ کرو مگر حق پر۔ یہ باتیں ہیں جن کی خدا نے تمھیں ہدایت فرمائی ہے تاکہ تم سمجھو اور یتیم کے مال کے پاس نہ پھٹکو بجز اس طریقے کے جو اس کے لیے بہتر ہو یہاں تک کہ وہ سن رشد کو پہنچ جائے اور ناپ، تول انصاف کے ساتھ پوری رکھو۔ ہم کسی جان پر اس کی استطاعت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتے۔ اور جب تم بولو تو عدل کی بات بولو، خواہ کوئی تمھارا قرابت دار ہی ہو اور اللہ کے عہد کو پورا کرو۔ یہ چیزیں ہیں جن کی اس نے تمھیں ہدایت فرمائی تاکہ تم یاد دہانی حاصل کرو اور یہ کہ یہی میرا راستہ سیدھا راستہ ہے تو اس کی پیروی کرو اور دوسری پگڈنڈیوں پر نہ چلو کہ وہ تمھیں اس کی راہ سے الگ کر دیں۔ یہ باتیں ہیں جن کی تمھیں ہدایت فرمائی تاکہ اُس کے غضب سے بچو۔ ۱۵۱-۱۵۳

پھر ہم نے موسیٰ کو کتاب دی اپنی نعمت پوری کرنے کے لیے اس پر جو خوب کار تھا اور ہر بات کی تفصیل اور ہدایت اور رحمت تاکہ وہ اپنے رب کی ملاقات پر ایمان لائیں۔ ۱۵۴

اور یہ کتاب ہے جو ہم نے اتاری ہے سراپا خیر و برکت، تو اس کی پیروی کرو اور ڈرو تاکہ تم پر رحمت کی جائے۔ مبادا تم کہو کہ کتاب بس ان دو گروہوں پر اتاری گئی جو ہم سے پہلے تھے اور ہم ان کے پڑھنے پڑھانے سے بالکل بے خبر رہے یا کہو کہ اگر ہم پر کتاب اتاری جاتی تو ہم ان سے زیادہ ہدایت یافتہ ہوتے۔ سو تمھارے پاس تمھارے رب کی طرف سے ایک واضح حجت اور ہدایت و رحمت آگئی تو ان سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا جو اللہ کی آیات کو جھٹلائیں اور ان سے دوسروں کو پھیریں۔ جو لوگ ہماری آیات سے اعراض اختیار کر رہے ہیں ہم ان کو اس اعراض کی پاداش میں عنقریب نہایت بُرا عذاب دیں گے۔ وہ صرف اس بات کے منتظر ہیں کہ ان کے پاس فرشتے آئیں یا تیرا رب آئے یا تیرے رب کی نشانیوں میں سے کوئی نشانی ظاہر ہو جس دن تیرے رب کی نشانیوں میں سے کوئی نشانی ظاہر ہوگی تو کسی ایسے کو اس کا ایمان نفع نہ دے گا جو پہلے سے ایمان نہ لایا ہو یا اُس نے اپنے ایمان میں نیکی نہ کمائی ہو۔ کہہ دو تم انتظار کرو، ہم بھی منتظر ہی ہیں۔ ۱۵۵-۱۵۸

جن لوگوں نے اپنے دین میں تفرقہ ڈالا اور گروہ گروہ بن گئے تمھارا ان سے کوئی سروکار نہیں۔ ان کا معاملہ بس اللہ کے حوالہ ہے۔ وہی ان کو جمع کرے گا پھر انھیں بتائے گا جو کچھ وہ کرتے رہے ہیں۔ جو نیکی لے کر آئے گا تو اس کو اس کا دس گنا بدلہ ملے گا اور جو برائی لے کر آئے گا تو اس کو بس اسی کے مثل بدلہ ملے گا اور ان پر ظلم نہیں ہوگا۔ ۱۵۹-۱۶۰

کہہ دو، میرے رب نے میری رہنمائی ایک سیدھے رستے کی طرف فرما دی ہے۔ دینِ قیم

ابراہیم کی ملّت کی طرف جو یکسو تھے اور مشرکین میں سے نہ تھے۔ کہہ دو میری نماز اور میری قربانی، میری زندگی اور میری موت اللہ رب العالمین کے لیے ہے۔ اس کا کوئی ساجھی نہیں اور مجھے اسی کا حکم ملا ہے اور میں پہلا مسلم ہوں۔ پوچھو، کیا میں اللہ کے سوا کسی اور کو رب بناؤں جب کہ وہی ہر چیز کا رب ہے اور ہر جان جو کمائی کرتی ہے وہ اسی کے کھاتے میں پڑتی ہے اور کوئی کسی دوسرے کا بوجھ نہ اٹھائے گا۔ پھر تمھارے رب ہی کی طرف تمھارا لوٹنا ہوگا۔ پس وہ تمھیں بتائے گا وہ چیز جس میں تم اختلاف کرتے رہے ہو۔ اور وہی ہے جس نے تمھیں زمین میں ایک دوسرے کا جانشین بنایا اور ایک کے درجے دوسرے پر بلند کیے تاکہ جو کچھ اس نے تمھیں بخشا ہے اس میں تم کو آزمائے، بے شک تیرا رب جلد پاداش عمل دینے والا بھی ہے اور وہ بخشنے والا اور مہربان بھی ہے۔ ۱۶۱-۱۶۵

۲۲- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَهُوَ الَّذِيٓ اَنْشَاَ جَنّٰتٍ مَّعْرُوْشٰتٍ وَّغَيْرَ مَعْرُوْشٰتٍ وَّالنَّخْلَ وَالزَّرْعَ مُخْتَلِفًا اُكُلُهٗ وَالزَّيْتُوْنَ وَالرُّمَّانَ مُتَشَابِهًا وَّغَيْرَ مُتَشَابِهٍ ۭ كُلُوْا مِنْ ثَمَرِهٖٓ اِذَآ اَثْمَرَ وَاٰتُوْا حَقَّهٗ يَوْمَ حَصَادِهٖ ڮ وَلَا تُسْرِفُوْا ۭ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ ۝ وَمِنَ الْاَنْعَامِ حَمُوْلَةً وَّفَرْشًا ۭ كُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ۭ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ (۱۴۱-۱۴۲)

وَهُوَ الَّذِيٓ اَنْشَاَ جَنّٰتٍ مَّعْرُوْشٰتٍ یعنی کھیتی اور باغ سب پیدا کیے ہوئے تو خدا کے ہیں تو ان میں تم نے دوسرے دیویوں، دیوتاؤں کو کس حق کی بنا پر شریک بنا ڈالا؟ 'مَعْرُوْشٰتٍ' سے مراد انگور وغیرہ ہیں جن کی بیلیں ٹٹیوں پر چڑھائی جاتی ہیں، 'غَيْرَ مَعْرُوْشٰتٍ' سے وہ چیزیں مراد ہیں جو ٹٹیوں کی محتاج نہیں ہوتیں۔ انگور کی بیلوں کی مناسبت سے میرا ذہن اس طرف جاتا ہے کہ 'غَيْرَ مَعْرُوْشٰتٍ' وہ بیلیں ہیں جو زمین ہی پر پھیلتی اور پھلتی پھولتی ہیں۔ مثلاً خربوزے، تربوز، ککڑیاں، کھیرے وغیرہ۔ سورہ عبس میں 'عِنَبًا' اور 'قَضْبًا' دو چیزوں کو جمع کیا ہے، 'عنب' انگور کو کہتے ہیں اور 'قضب' ان سبزیوں کے لیے معروف ہے جو تازہ حالت میں کھائی جاتی ہیں۔

یہ امر ملحوظ رہے کہ یہاں باغوں اور کھیتیوں کی گوناگونی و بوقلمونی، ان کی پیداوار کے تنوع اور ان کے انواع و اقسام کے اختلاف و تعدد کو خاص طور پر نمایاں کیا ہے جس سے مقصود بعض حقائق کی طرف توجہ دلانا ہے۔

اشیائے کائنات کی شہادت زبانِ حال سے

ایک یہ کہ جس نے یہ سب کچھ پیدا کیا ہے وہ بڑا ہی جواد و کریم، فیاض و مہربان، سخی اور بندہ نواز ہے۔ اس نے بندوں میں رزق کی احتیاج رکھی تو یہ نہیں کیا کہ جیسا تیسا پیٹ بھرنے کا سامان پیدا کر دیا ہو بلکہ الوانِ نعمت کے انبار لگا دیے۔ باغ اگائے تو گوناگون قسم کے، کھیت اور غلے پیدا کیے تو بے شمار اقسام کے، زیتون، انار اور دوسرے پھل پھول عنایت کیے تو نت نئے انواع کے۔ آخر مجرد زندگی باقی رکھنے کے لیے تو یہ تنوعات، یہ بوقلمونیاں، شکلوں، رنگوں، ذائقوں اور مزوں کی یہ رنگ آرائیاں و رعنائیاں ناگزیر نہیں تھیں لیکن اس دنیا کے خالق نے بغیر اس کے کہ اس کی کوئی ضرورت ہم سے وابستہ ہو ہمارے لیے اتنا وسیع دسترخوان بچھایا کہ ہم اس کے لذائذ کے انواع و اقسام گننا چاہیں تو گن نہیں سکتے۔ سوچنے والوں کے لیے سوچنے کی بات ہے کہ ایسا کیوں ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ سب کچھ اس لیے ہے کہ انسان یہ جانے کہ اس کا رب منعم و کریم اور فیاض و مہربان ہے جس نے بلا کسی استحقاق کے اس کے لیے یہ سارے سامان مہیا فرمائے ہیں اور پھر اس کا فطری اثر اس کے دل پر یہ طاری ہو کہ وہ اس کا شکر گزار بندہ بنے اور اس کا حق پہچانے۔ یہی شکر گزاری کا جذبہ اور حق شناسی کا احساس ہے جو تمام دین و شریعت کی، جیسا کہ ہم دوسرے مقام میں واضح کر چکے ہیں، بنیاد ہے۔

دوسری یہ کہ پروردگاری اور ربوبیت کا یہ سارا ساز و سامان، جس سے ہم بلا استحقاق فائدہ اٹھا رہے ہیں، ہمارے اوپر ایک بہت بھاری ذمہ داری عاید کرتا ہے۔ وہ یہ کہ ہم ان سے فائدہ اٹھانے کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی یاد رکھیں کہ جس نے یہ سب کچھ ہمارے لیے بنایا ہے ضرور ہے کہ وہ ایک دن ایسا بھی لائے جس میں ہم سے ایک ایک نعمت کے متعلق سوال کرے کہ جس کے خوانِ نعمت سے ہم نے یہ فائدے اٹھائے اس کی وفاداری کا حق ادا کیا یا نہیں اور پھر اسی کے لحاظ سے وہ ہم کو جزا یا سزا دے۔ یہ اس بنیاد پر ہے کہ ہر حق اور ہر تمتع کے ساتھ ذمہ داری اور ہر (PRIVILEDGE) کے ساتھ (RESPONSIBILITY) لازمی ہے۔ ان دونوں کا لازم و ملزوم ہونا انسانی فطرت کے بدیہیات میں سے ہے۔ ہر حساس انسان اس کو تسلیم کرتا ہے۔ صرف لئیم، کمینہ اور بلید لوگ ہی ہو سکتے ہیں جو اللہ کی نعمتوں سے فائدہ تو اٹھائیں لیکن ان کے جواب میں کوئی ذمہ داری محسوس نہ کریں۔

تیسری یہ کہ اس کائنات میں کثرت کے اندر وحدت، گوناگونی کے اندر ہم آہنگی، اختلاف کے اندر سازگاری، ہر گوشے میں نمایاں ہے، مٹی، پانی، ہوا ایک ہی لیکن اشیا گوناگون قسم کی، رنگ مختلف قسم کے، مزے، خوشبو، قد و قامت الگ الگ۔ پھر یہ سب انسان کے لیے نعمت و برکت، غذا اور لذت ہیں۔

صاف معلوم ہوتا ہے کہ جس خالق نے ہمارے جسم کے اندر گلوکوز اور فولاد کا تقاضا ودیعت کیا اُسی نے انار اور انگور کے دانوں کے اندر رس بھرے۔ جس نے ہماری زبان کے اندر مختلف ذائقے ودیعت کیے اُسی نے ان اشیا کے اندر مختلف مزے پیدا کیے۔ جس نے ہماری نگاہوں کو حسن و جمال کا ذوق بخشا اُسی نے ہر چیز کو حسن و رعنائی، دلکشی و دلربائی کا پیکر بنا دیا۔ قرآن نے یہاں اشیا کے ظاہری تضاد و اختلاف کے اندر اسی وحدتِ مقصد کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ یہ چیز اس کائنات کے خالق اور اس کے متصرف کی توحید کی طرف اشارہ کر رہی ہے۔ پیچھے آیات ۹۹-۱۰۱ کے تحت بھی بعض اشارے گزر چکے ہیں۔ مزید تفصیل کے طالب ہماری کتابیں 'حقیقتِ شرک' اور 'حقیقتِ توحید' پڑھیں۔ ان میں ہم نے ان مسائل پر سیر حاصل بحث کی ہے۔

كُلُوا مِنْ ثَمَرِهٖٓ اِذَآ اَثْمَرَ وَاٰتُوْا حَقَّهٗ يَوْمَ حَصَادِهٖ: یہ تعلیم تمام نعمتیں اپنی زبانِ حال سے بھی دے رہی ہیں اور یہی تعلیم خدا اور اُس کے نبیوں اور رسولوں نے بھی دی ہے اور یہی ان نعمتوں کا وہ حق بھی ہے جس کی شہادت خود ہماری فطرت دیتی ہے بشرطیکہ وہ مسخ نہ ہو گئی ہو۔ یعنی اللہ کی بخشی ہوئی ان کھیتوں اور ان باغوں سے خود فائدہ اُٹھاؤ اور جب فصلوں کے کاٹنے اور پھلوں کے توڑنے کا وقت آئے تو ان کا حق ادا کرو۔ 'حَقَّهٗ' میں ضمیر کا مرجع خدا بھی ہو سکتا ہے اور ثمر بھی لیکن دونوں صورتوں میں باعتبار مفہوم کچھ زیادہ فرق نہ ہوگا۔ ہر نعمت جو اللہ تعالیٰ عنایت فرماتا ہے اس کا ایک حق واجب یہ ہے کہ جس کو یہ نعمت ملی وہ اس میں ان لوگوں کو بھی شریک کرے جو اس سے محروم ہیں۔ یہ اس نعمت کی شکرگزاری کا حق ہے۔ یہی حق ہے جس کو اللہ تعالیٰ کا حق کہا جاتا ہے۔ اس حق کا شعور انسان کی فطرت کے اندر ودیعت ہے جب سے انسان پایا جاتا ہے، تمام بھلے انسانوں کے اندر اس حق کا احساس بھی پایا جاتا ہے۔ حضرت آدم کا بیٹا ہابیل اپنی بھیڑوں بکریوں کا جو نذرانہ خداوند کے لیے لایا تھا وہ اسی حق کی ادائیگی کے لیے لایا تھا۔ یہی حق ہے جس کی ادائیگی کے لیے اسرائیلی شریعت میں بھی اور پھر اسلام میں بھی زکوٰۃ کا ایک باقاعدہ نظام قائم ہوا۔

حقِ زکوٰۃ پیداوار پر ہے

'يَوْمَ حَصَادِهٖ' کے لفظ سے یہ بات نکلتی ہے کہ اس حق کی ادائیگی فصل کے دِرو کے وقت اس کے حاصل سے ہونی چاہیے۔ اس کی علت یہ ہے کہ یہ حق درحقیقت اس نعمت الٰہی کا شکرانہ ہے جو کسان کو حاصل ہوتی۔ اسی وجہ سے اسلام نے زکوٰۃ کا حق پیداوار پر رکھا ہے۔ یہی بات عقل و فطرت کے مطابق ہے۔ اس زمانے میں دوسری قوموں کی نقالی میں مسلمانوں نے بھی ایک بالکل غیر اسلامی مالیاتی نظام اختیار کر لیا ہے اس وجہ سے مسلمان حکومتیں زکوٰۃ کے بجائے ٹیکس وصول کرتی ہیں۔ یہ چیز اس برکت اور اس عدل سے بالکل خالی ہے جو اسلام کے نظامِ زکوٰۃ میں ہے۔

'مِنْ ثَمَرِهٖٓ اِذَآ اَثْمَرَ' میں ضمیر ہر چند واحد ہے لیکن مراد وہ ساری ہی چیزیں ہیں جو مذکور ہوئیں۔ اس طرح

متعدد چیزیں ذکر کرنے کے بعد جب ضمیر یا فعل واحد لاتے ہیں تو مقصود ان میں سے ایک ایک چیز کا حکم فرداً فرداً بیان کرنا ہوتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام میں ہر پیداوار پر خدا کا حق ہے، خواہ کوئی شے بھی ہو، اس سے استثنا کسی شے کا نہیں بلکہ ایک خاص مقدار کا ہے۔ شریعت نے ایک خاص حد تک کی پیداوار، پیدا کرنے والے کی ضروریات کا لحاظ کر کے اس حق سے مستثنیٰ کر دی ہے۔ رہا یہ سوال کہ یہ مقدار کیا ہے تو اس کا تعلق فقہ سے ہے اور یہ بات تفصیل طلب ہے جس کے لیے یہاں گنجائش نہیں ہے۔[1]

زکوٰۃ سے کوئی پیداوار مستثنیٰ نہیں

'اِذَآ اَثْمَرَ' کا تعلق صرف 'کُلُوْا' سے نہیں ہے بلکہ 'کُلُوْا' اور 'اٰتُوْا حَقَّهٗ' دونوں سے ہے۔ یعنی جس طرح پیداوار سے انتفاع منحصر ہے پیداوار حاصل ہونے پر، اسی طرح اس کے حق شرعی کی ادائیگی واجب ہے اُس کے پیدا ہونے اور کھیت سے کھلیان تک پہنچنے پر۔ اس سے یہ حقیقت مزید موکد ہو گئی کہ اس حق کا اصل تعلق پیداوار سے ہے نہ کہ زمین سے۔ چنانچہ اسی اصول پر اسلام کا نظام زکوٰۃ ہے۔

ادائے حقوق کے لیے اسراف کی ممانعت

'وَلَا تُسْرِفُوْا اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ'۔ یہ ادائے حق کے ساتھ اسی طرح کی ہدایت ہے جس طرح کی ہدایت سورۂ بنی اسرائیل میں بعینہٖ اسی سیاق میں وارد ہوئی ہے۔ فرمایا ہے 'وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيْرًا ۝ اِنَّ الْمُبَذِّرِيْنَ كَانُوْٓا اِخْوَانَ الشَّيٰطِيْنِ وَكَانَ الشَّيْطٰنُ لِرَبِّهٖ كَفُوْرًا' (۲۶-۲۷ بنی اسرائیل) (اور قرابت مند، مسکین اور مسافر کو اس کا حق دو اور فضول خرچی نہ کرو، فضول خرچی کرنے والے شیطان کے بھائی ہیں اور شیطان اپنے رب کا ناشکرا ہے) اس ہدایت کی ضرورت اس وجہ سے تھی کہ حقوق کی ادائیگی کا انحصار اس امر پر ہے کہ آدمی اپنی ضروریات و خواہشات کے معاملے میں معتدل، کفایت شعار اور میانہ رو ہو۔ جو شخص مسرف اور فضول خرچ ہو اس کے اپنے ہی شوق پورے نہیں ہو پاتے، وہ دوسروں کے حقوق کیا ادا کرے گا۔ شیطان ارباب مال پر سب سے زیادہ حملہ اسی راہ سے کرتا ہے۔ وہ ان کو طرح طرح کی آرزوؤں اور خواہشوں میں پھنساتا ہے اور وہ ان خواہشات و تعیشات کے ایسے غلام ہو جاتے ہیں کہ ان کے نزدیک ان کا درجہ ضروریات سے بھی کچھ بڑھ کر ہو جاتا ہے۔ ایسے لوگ بھلا کس طرح سوچ سکتے ہیں کہ جس مال میں ان کے یہ اللے تللے ہیں اس میں خدا کے دوسرے بندوں کے بھی حقوق ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اُن کے کتے، باز، شکرے تو آسودہ رہتے ہیں لیکن ان کے پڑوسی بھوکے سوتے ہیں۔

'حمولۃ' اور 'فرش' کی تحقیق

'وَمِنَ الْاَنْعَامِ حَمُوْلَةً وَّفَرْشًا'۔ 'حَمُوْلَة' 'رکوبۃ' اور 'حلوبۃ' کے وزن پر ہے اور اس سے مراد وہ چوپائے ہیں جو سواری اور بار برداری کے لیے موزوں ہیں۔ مثلاً اونٹ، گھوڑے، خچر وغیرہ۔ الابل التی تحمل وکل ما احتمل علیہ القوم من بعیر وحمار و نحوہ۔

---

[1] فقہا بعض اموال کو اموال زکوٰۃ میں شمار نہیں کرتے۔ یہ بات ہماری سمجھ میں نہیں آتی۔ اگر وہ شے نہایت محدود مقدار میں محض گھریلو استعمال کے حد تک پیدا کی جاتی ہو تب تو بے شک وہ زکوٰۃ سے مستثنیٰ ہونی چاہیے لیکن اگر انہی چیزوں میں سے کوئی چیز کوئی زمیندار بڑے پیمانہ پر کاشت کرے یا وہی چیز کسی علاقہ یا ملک کی عام پیداوار کی حیثیت رکھتی ہو یا حاصل کرے تو آخر وہ زکوٰۃ سے مستثنیٰ کیوں رہے گی؟

'الفرش' اس زمین کو بھی کہتے ہیں جہاں نباتات کی کثرت ہو۔ اس بستی کو بھی کہتے ہیں جو ابھی اپنے ٹھکانوں پر کھڑی نہ ہوئی ہو اور حیوانات کے تعلق سے یہ لفظ آئے تو اس سے مراد وہ چھوٹے جانور ہوتے ہیں جو سواری یا بار برداری کے لیے موزوں نہیں ہیں، صرف ذبح یا دوسری ضروریات ہی کے لیے موزوں ہیں، مثلاً بکریاں، بھیڑیں وغیرہ۔ قرینہ دلیل ہو تو اس میں چھوٹے اونٹ اور گائے بیل بھی شامل ہو جاتے ہیں۔ لیکن یہاں یہ لفظ 'حَمُوْلَة' کے مقابل میں استعمال ہوا ہے اس وجہ سے لازماً یہاں چھوٹے چوپائے ہی مراد ہوں گے۔

اوپر والی آیت میں 'جَنّٰتٍ مَّعْرُوْشٰتٍ وَّغَيْرَ مَعْرُوْشٰتٍ' کا ذکر فرمایا ہے۔ اب یہ اس کے مقابل میں چوپایوں کا ذکر فرمایا تو ان کو بھی دو بڑی قسموں ـــ 'حمولة' اور 'فرش' ـــ میں تقسیم فرما دیا، زبان کا ذوق رکھنے والے اندازہ کر سکتے ہیں کہ یہاں نہایت حسین قسم کا تقابل ہے۔ 'حمولة' 'مَعْرُوْشٰت' کا مقابل ہے، 'فرش' 'غَيْرَ مَعْرُوْشٰت' کا۔ گویا جس طرح نباتاتی کھیتیں اور باغوں میں قدرت نے ایسی بیلیں بھی پیدا کی ہیں جو ٹٹیوں پر چڑھائی جاتی ہیں اور ایسی بھی جو زمین ہی پر پھیلتی ہیں، اسی طرح چوپایوں میں 'حمولة' بھی ہیں جن کو قدرت نے اونچے ڈھانچوں پر کھڑا کیا ہے اور 'فرش' بھی ہیں جو زمین سے لگے ہی ہوئے چوتے چگتے پروان چڑھتے ہیں اور انسان کو اپنے گوشت، کھال، اون، دودھ ہر چیز سے فائدہ پہنچاتے ہیں۔

اس لفظی تجانس کے ساتھ ساتھ اس معنوی تجانس پر بھی نگاہ رکھیے جو دونوں آیتوں میں یکساں موجود ہے۔ اوپر ہم نے اشارہ کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کے لیے جو نعمتیں پیدا کی ہیں ان کا ایک خاص پہلو ان کی گوناگونی اور بوقلمونی بھی ہے جس سے خدا کی ربوبیت، عنایت اور رحمت کی شہادت ملتی ہے اور یہ شہادت، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا، توحید اور جزا و سزا کی نہایت اہم آفاقی و انفسی دلیل ہے۔ اسی دلیل کی طرف یہاں بھی چوپایوں کے تنوع کا حوالہ دے کر اشارہ فرما دیا ہے اور یہ اشارہ فکر انسانی کے لیے ایک مہمیز ہے بشرطیکہ انسان غور کرنا چاہے۔

شیطان کے دو کامیاب حربے

'كُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ' جس طرح اوپر والی آیت میں نعمتوں کے ذکر کے بعد ان کا حق یہ بیان فرمایا کہ 'كُلُوْا مِنْ ثَمَرِهٖٓ اِذَآ اَثْمَرَ' اسی طرح ان چوپایوں کی نعمت کا حق یہ بیان فرمایا کہ 'كُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ' کہ اللہ نے یہ نعمتیں جو تمھیں بخشی ہیں جن جن پہلوؤں سے تمھارے لیے نافع ہیں ان کو برتو، اپنے منعم کا شکر ادا کرو اور ان کے اندر جو خدا کا حق ہے وہ ادا کرو۔ یہ باتیں چونکہ سیاق کلام سے ظاہر ہیں، نیز اوپر ان کا ذکر ہو چکا تھا اس وجہ سے ان کی تصریح کی ضرورت نہیں تھی۔ البتہ شیطان کے فتنوں سے آگاہ فرما دیا کہ اس کے نقش قدم کی پیروی نہ کیجیو اس لیے کہ وہ کھلم کھلا پہلے ہی الٹی میٹم دے چکا ہے کہ وہ تم کو فتنوں میں ڈالے گا تو تم اس کے کہے پر اپنے جی سے حرام و حلال ٹھہراؤ گے اور خدا کے بخشے ہوئے چوپایوں کو بتوں کے نام پر نیاز اور قربانی کے طور پر پیش کرو گے۔ چنانچہ فرمایا ہے۔ 'وَقَالَ لَاَتَّخِذَنَّ مِنْ عِبَادِكَ نَصِيْبًا مَّفْرُوْضًا وَّلَاُضِلَّنَّهُمْ وَلَاُمَنِّيَنَّهُمْ وَلَاٰمُرَنَّهُمْ فَلَيُبَتِّكُنَّ اٰذَانَ الْاَنْعَامِ' ۱۱۹-نساء اور شیطان نے کہا

میں تیرے بندوں میں سے ایک متعین حصہ ہتھیا کے رہوں گا، اور میں ان کو گمراہ کروں گا، ان کو آرزوؤں کے سبز باغ دکھاؤں گا اور ان کو سجھاؤں گا تو وہ چوپایوں کے کان کاٹیں گے) اوپر والی نعمتوں کے سلسلے میں شیطان کی رہزنی اسراف و تبذیر کے پہلو سے بیان ہوئی۔ یہاں اس کی مشرکانہ وسوسہ اندازیوں کا ذکر ہوا اور شیطان کے یہ دونوں ہی حربے اولادِ آدم پر بڑے کارگر ثابت ہوئے ہیں۔

اس آیت میں 'اکل' یا 'رزق' کے الفاظ ان محدود معنوں میں نہیں استعمال ہوئے ہیں جن معنوں میں عام طور پر ہم لیتے ہیں۔ 'اکل' برتنے اور فائدہ اٹھانے کے مفہوم میں ہے اور 'رزق' ایک جامع تعبیر ہے بخشش الٰہی کی۔

ثَمٰنِيَةَ اَزْوَاجٍ ۚ مِنَ الضَّاْنِ اثْنَيْنِ وَمِنَ الْمَعْزِ اثْنَيْنِ ۗ قُلْ آٰلذَّكَرَيْنِ حَرَّمَ اَمِ الْاُنْثَيَيْنِ اَمَّا اشْتَمَلَتْ عَلَيْهِ اَرْحَامُ الْاُنْثَيَيْنِ ۚ نَبِّئُوْنِيْ بِعِلْمٍ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝ وَمِنَ الْاِبِلِ اثْنَيْنِ وَمِنَ الْبَقَرِ اثْنَيْنِ ۗ قُلْ آٰلذَّكَرَيْنِ حَرَّمَ اَمِ الْاُنْثَيَيْنِ اَمَّا اشْتَمَلَتْ عَلَيْهِ اَرْحَامُ الْاُنْثَيَيْنِ ۚ اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ اِذْ وَصّٰىكُمُ اللّٰهُ بِهٰذَا ۚ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا لِّيُضِلَّ النَّاسَ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۗ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ (۱۴۳-۱۴۴)

'ثَمٰنِيَةَ' فعل محذوف سے منصوب ہے۔ عام طور پر لوگوں نے فعل ماضی محذوف مانا ہے لیکن ہمارے نزدیک قرینہ یہاں فعل امر کے محذوف ماننے کا ہے۔ جملہ کی وضاحت سے اس قرینے کی وضاحت ہو جائے گی۔

'زوج' کا لفظ جس طرح جوڑے کے لیے آتا ہے اسی طرح جوڑے کے ایک فرد کے لیے بھی آتا ہے۔ عربی ادب اور قرآن دونوں میں اس کی نظیریں موجود ہیں۔

لفظ انعام کا اطلاق کن چوپایوں پر ہوتا ہے

پالتو چوپایوں میں سے جو گوشت یا دودھ وغیرہ کے لیے عرب میں پالے جاتے تھے چار معروف تھے۔ چھوٹے چوپایوں میں بھیڑ بکری، بڑے چوپایوں میں اونٹ گائے[1]۔ انعام کا لفظ انہی کے لیے بولا جاتا ہے۔ جب اس کی طرف لفظ 'بَهِيْمَةَ' کی نسبت ہو جاتی ہے تو اس میں جیسا کہ سورۂ مائدہ کے شروع میں ہم اشارہ کر چکے ہیں، وہ وحشی چوپائے بھی شامل ہو جاتے ہیں جو اگرچہ پالتو نہیں لیکن شامل انعام ہی کی جنس میں ہیں۔ مثلاً ہرن، جنگلی بکرے، پاڑھے، نیل گائے، گورخر وغیرہ۔

چونکہ یہاں زیر بحث پالتو چوپایوں ہی کی حلت و حرمت ہے اس لیے کہ اہل عرب نے انہی کے اندر سے، جیسا کہ اوپر گزرا، اپنے مشرکانہ توہمات کے تحت بعض کو حلال، بعض کو حرام ٹھہرا رکھا تھا اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت فرمائی کہ ان میں سے ایک ایک کو فرداً فرداً لے کر ان سے پوچھو کہ ان میں سے کس کو خدا نے حرام ٹھہرایا ہے اور ان سے مطالبہ کرو کہ وہ تمہارے سوال کا جواب کسی علمی یا عقلی دلیل سے دیں، محض اٹکل کے تیر تکے نہ چلائیں۔

---

[1] بھینس چونکہ گرم اور مرطوب ملکوں کا چوپایہ ہے اس وجہ سے یہ عرب میں نہ معروف تھی نہ ہے۔

یہ معروف چوپائے، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، چار تھے۔ بھیڑ، بکری، اونٹ اور گائے۔ ان کے جوڑے کے افراد نر اور مادہ دونوں کو الگ الگ گنیے تو یہ سب آٹھ ہو جائیں گے۔ فرمایا کہ ان آٹھوں کو لوا دران میں سے ہر ایک کے نر و مادہ کو لے کر ان لال بجھکڑوں سے پوچھو کہ بتائیں، ان میں سے نر کو خدا نے حرام ٹھہرایا ہے یا مادہ کو یا مادہ کے پیٹ میں جو بچہ ہے اس کو؟ مطلب یہ ہے کہ جب اصلاً یہ جانور، ان کے نر و مادہ دونوں، پیٹ کے بچہ سمیت، حلال ہیں، ان میں سے کسی کی حرمت کا دعویٰ یہ نہیں کر سکتے تو پھر انہی کے بعض اجزا پر یہ حرمت کہاں سے طاری ہو جاتی ہے کہ بعض کا کھانا ناجائز ہو جاتا ہے، بعض پر سواری حرام ہو جاتی ہے، بعض کو صرف مرد ہی کھا سکتے ہیں اور بعض کو مخصوص حالات پیدا ہو جانے کے بعد دونوں کھا سکتے ہیں۔ عقل و فطرت کا تقاضا تو یہ ہے کہ اگر درخت مباح ہے تو اس کا پھل بھی مباح ہو۔ یہ کیا بے تکی بات ہے کہ درخت تو مباح ہے لیکن اس کی ایک شاخ کا پھل حرام ہے، یا مردوں کے لیے تو یہ حلال ہے لیکن عورتوں کے لیے حرام ہے یا اتنے پھل دینے تک تو وہ حلال ہے لیکن اتنے پھل دے چکنے کے بعد اس پر حرمت طاری ہو جاتی ہے۔

بدعات پر قریش سے دلیل کا مطالبہ

نَبِّئُونِي بِعِلْمٍ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ مطلب یہ ہے کہ اگر تم اپنے اس دعوے میں سچے ہو کہ ان میں سے بعض چیزیں دین ابراہیمی میں حرام تھیں تو اس پر کوئی علمی دلیل پیش کرو۔ علمی دلیل دو قسم کی ہو سکتی ہے۔ ایک تو یہ کہ دین ابراہیمؑ کی کوئی قابل اعتماد سند ہو جس سے یہ ثابت ہو سکے کہ فلاں فلاں چیزیں دین ابراہیمی میں حرام تھیں یا کوئی عقلی و فطری دلیل یا قرینہ ہو جس سے ان کے دعوے کی صحت پر اعتماد کیا جا سکے۔ اگر اس طرح کی کوئی چیز موجود نہیں ہے تو مجرد واہمہ پر اچھے بھلے جانوروں کو حرام کر دینے کے کیا معنی؟ یہ واضح رہے کہ اہل عرب اپنے جن مشرکانہ توہمات و رسوم کو حضرت ابراہیمؑ کی طرف منسوب کرتے تھے ان کے حق میں دلیل وہ صرف یہ پیش کرتے تھے کہ لَوْ شَاءَ اللَّهُ مَا أَشْرَكْنَا وَلَا آبَاؤُنَا وَلَا حَرَّمْنَا مِن شَيْءٍ ۱۴۸ (اگر اللہ چاہتا تو نہ ہم شرک کر سکتے نہ ہمارے باپ دادا اور نہ ہم کسی چیز کو حرام ٹھہراتے) ظاہر ہے کہ یہ کوئی دلیل عقلی ہے نہ نقلی۔ اگر یہ کوئی دلیل ہے تو ہر احمق اپنی ہر حماقت کو اس دلیل سے ثواب ثابت کر سکتا ہے۔ باپ دادا کا کسی رسم کو اختیار کر لینا بھی اس کی صحت یا حضرت ابراہیمؑ کی طرف اس کی نسبت کی کوئی دلیل نہیں۔ آخر یہ کس طرح باور کر لیا جائے کہ ان کے باپ دادا نے جو رسوم اختیار کیے کسی سند کی بنا پر اختیار کیے جب کہ خود اہل عرب کی روایات شاہد ہیں کہ جس طرح دین مسیحی کو پال نے بگاڑا اسی طرح عربوں میں شرک و بت پرستی کا رواج ایک شخص عمرو بن لحی نامی کے ذریعے سے ہوا۔ قرآن نے عربوں کے ان توہمات کی تردید کے لیے عقلی و نقلی دونوں قسم کے دلائل دیے۔ ایک طرف تو اس نے حضرت ابراہیمؑ کی زندگی کا وہ سادا تحریری ریکارڈ پیش کیا جو تورات کے صحیفوں میں موجود تھا، جس کا ایک ایک حرف شاہد ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کو نہ صرف یہ کہ شرک اور مشرکانہ رسوم سے کوئی تعلق نہیں تھا بلکہ انھوں نے اپنے ایک ایک قول اور ایک ایک عمل سے شرک کے ایک ایک جڑ و مہ

کا قلع قمع کیا ہے۔ دوسری طرف توحید خالص کے حق میں وہ عقلی و فطری دلیلیں دیں جو ناقابلِ تردید بھی ہیں اور جو حضرت ابراہیمؑ ہی کی، جیسا کہ اسی سورہ کے پچھلے مباحث سے واضح ہے، پیش کردہ ہیں۔ غور کیجیے کہ کہاں قرآن کے یہ سورج کی طرح روشن دلائل اور کہاں اہل عرب کی یہ بات کہ ہم نے اسی طریقہ پر اپنے باپ دادا کو پایا اس وجہ سے یہی اللہ کی شریعت اور یہی ابراہیمؑ کی ملت ہے۔

اتمامِ حجت کا آخری قدم

'اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ اِذْ وَصّٰىكُمُ اللّٰهُ بِهٰذَا' اتمام حجت کا آخری قدم ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جہاں تک عقل و نقل کے دلائل کا تعلق ہے ان میں سے تو کوئی چیز تمھارے ساتھ ہے نہیں پھر آخر کس بنیاد پر تم اللہ پر یہ بہتان باندھ رہے ہو کہ خدا نے فلاں فلاں چیزیں حرام ٹھہرائی ہیں، کیا جب اللہ نے ان چیزوں کی ہدایت فرمائی تم اس وقت موجود تھے؟ پھر بتاؤ کہ ان سے بڑھ کر محروم النعمت، بدبخت اور ظالم کون ہو سکتا ہے جو بغیر کسی سند علمی و دلیل عقلی کے محض جھوٹے بہتان کو لوگوں کے گمراہ کرنے کا ذریعہ بنائیں۔

'اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ' 'ظالمین' سے مراد وہی لوگ ہیں جن کی طرف اوپر 'فَمَنْ اَظْلَمُ' میں اشارہ فرمایا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جو لوگ ایسے ظالم ہیں کہ محض من گھڑت بہتان کو نہ صرف اپنی گمراہی کا بہانہ بنائے بیٹھے ہیں بلکہ اس کو دوسروں کو گمراہ کرنے کا بھی ذریعہ بنا رہے ہیں اللہ ایسے لوگوں کو راہ یاب نہیں کرے گا۔ 'راہ یاب نہیں کرے گا' میں ایک پہلو تو یہ ہے کہ یہ لوگ خدا کی ہدایت سے بہرہ یاب نہیں ہوں گے (واضح رہے کہ یہاں جو لوگ زیر بحث ہیں یہ قریش کے وہ سادات ہیں جو ان کی مذہبی پیشوائی کر رہے تھے) دوسرا یہ کہ خلق خدا کو گمراہ کرنے کی جو مہم یہ چلا رہے ہیں محض بے بنیاد افترا اور جھوٹ پر مبنی ہے اس وجہ سے یہ منہ کی کھائیں گے۔ اس میں ان کو کامیابی نہیں حاصل ہوگی۔ یہ گویا نہایت لطیف انداز میں بشارت ہے دعوت اسلامی کی کامیابی کی۔

قُلْ لَّآ اَجِدُ فِيْ مَآ اُوْحِيَ اِلَيَّ مُحَرَّمًا عَلٰى طَاعِمٍ يَّطْعَمُهٗٓ اِلَّآ اَنْ يَّكُوْنَ مَيْتَةً اَوْ دَمًا مَّسْفُوْحًا اَوْ لَحْمَ خِنْزِيْرٍ فَاِنَّهٗ رِجْسٌ اَوْ فِسْقًا اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ ۚ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَاِنَّ رَبَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ وَعَلَى الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا كُلَّ ذِيْ ظُفُرٍ ۚ وَمِنَ الْبَقَرِ وَالْغَنَمِ حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ شُحُوْمَهُمَآ اِلَّا مَا حَمَلَتْ ظُهُوْرُهُمَآ اَوِ الْحَوَايَآ اَوْ مَا اخْتَلَطَ بِعَظْمٍ ۭ ذٰلِكَ جَزَيْنٰهُمْ بِبَغْيِهِمْ ۡ وَاِنَّا لَصٰدِقُوْنَ ۝ فَاِنْ كَذَّبُوْكَ فَقُلْ رَّبُّكُمْ ذُوْ رَحْمَةٍ وَّاسِعَةٍ ۚ وَلَا يُرَدُّ بَاْسُهٗ عَنِ الْقَوْمِ الْمُجْرِمِيْنَ (۱۴۵-۱۴۷)

ملتِ ابراہیم میں چوپایوں میں سے کیا چیزیں حرام تھیں

'قُلْ لَّآ اَجِدُ فِيْ مَآ اُوْحِيَ اِلَيَّ' الآیہ۔ اب یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے اعلان کرایا ہے کہ ملتِ ابراہیمؑ میں انعام میں سے کیا چیزیں حرام تھیں۔ اوپر کے مباحث سے یہ بات واضح ہے کہ یہاں مشرکین عرب کے ساتھ جو بحث چل رہی ہے وہ ملتِ ابراہیمؑ ہی سے متعلق ہے اور یہ بحث بھی خاص کر چوپایوں سے متعلق ہے اس لیے کہ انہی میں سے بعض کو انھوں نے جیسا کہ اوپر کے بیان سے واضح ہے، اپنے مشرکانہ توہمات کے تحت حرام ٹھہرا رکھا تھا۔ موقع و محل کی یہ خصوصیت مقتضی ہے کہ اس اعلان کو اس مخصوص زاویہ ہی سے دیکھا جائے۔ جن

لوگوں نے اس کے مخصوص موقع و محل سے ہٹا کر اس کو اسلام کے عام ضابطۂ حلت و حرمت کی حیثیت دے دی ہے وہ اپنی اس غلط فہمی کے سبب سے خود بھی اُلجھن میں پڑے ہیں اور دوسروں کو بھی اُلجھن میں ڈالنے کا سبب بنے ہیں اس لیے کہ اسلام میں صرف وہی چیزیں حرام نہیں ہیں جو آیت میں مذکور ہیں بلکہ ان کے علاوہ چیزیں بھی حرام ہیں۔ مثلاً درندے اور شکاری پرندے وغیرہ۔ اور اسلام ہی میں نہیں بلکہ خود ملتِ ابراہیمؑ میں بھی ان کے علاوہ چیزیں حرام تھیں لیکن یہاں چونکہ زیر بحث مسئلہ، جیسا کہ سیاق و سباق سے واضح ہے، اُلعام ہی کا تھا اس وجہ سے ان کے باب میں یہ وضاحت فرما دی کہ مشرکین نے جو چیزیں حرام ٹھہرا رکھی ہیں یہ محض من گھڑت ہیں۔ ملتِ ابراہیمؑ میں چوپایوں کی حلت و حرمت سے متعلق جو وحی مجھ پر آئی ہے اس میں ان من گھڑت حرمتوں کا کوئی وجود نہیں ہے۔

عَلٰی طَاعِمٍ یَّطْعَمُهٗ (کسی کھانے والے پر جو اس کو کھائے) کے اسلوب میں جو تعمیم ہے اس سے مشرکین کے ان توہمات کی تردید ہو رہی ہے جو بعض مخصوص قربانیوں اور جانوروں سے متعلق وہ رکھتے تھے کہ ان کو خاص خاص لوگ ہی کھا سکتے تھے۔ ہر شخص ان کو ہاتھ نہیں لگا سکتا تھا۔ بعض جانوروں کے گوشت مرد ہی کھا سکتے تھے، عورتوں کے لیے ان کا کھانا حرام تھا (ملاحظہ ہوں آیات ۱۳۸-۱۳۹) قرآن کے ان الفاظ نے یہ واضح فرما دیا کہ جس طرح ان کی یہ مشرکانہ قربانیاں بے اصل و بے سند ہیں اسی طرح ان کے کھانے کے بارے میں ان کی یہ تفریق و تقسیم بھی محض ان کے واہمہ کی خلاقی ہے، ملتِ ابراہیمؑ سے اس کو کوئی تعلق نہیں ہے۔

ملتِ ابراہیم میں اشیاء کی حلت و حرمت کی بنیاد

اس آیت میں چار چیزوں کی حرمت کا ذکر ہے۔ مردار، بہایا ہوا خون، سور کا گوشت اور وہ جانور جس کو غیر اللہ کے نام پر ذبح کیا گیا ہو۔ ان میں سے سابق الذکر تین چیزوں کی حرمت ان کی ظاہری نجاست کی بنا پر ہے۔ ان کے ذکر کے بعد فرمایا ہے 'فَاِنَّهٗ رِجْسٌ' ہمارے نزدیک اس کا تعلق مذکورہ تینوں ہی چیزوں سے ہے۔ ضمیر جب اس طرح واحد آتی ہے تو بعض اوقات جیسا کہ ہم آیت ۱۱۹ کے تحت ذکر کر چکے ہیں، وہ سابق الذکر ساری ہی چیزوں پر حاوی ہو جاتی ہے۔ گویا وہ ایک ایک چیز کی طرف فرداً فرداً لوٹتی ہے۔ آخری چیز کی حرمت باطنی نجاست کی بنا پر ہے۔ غیر اللہ کے نام پر ذبح کرنا شرک ہے اور شرک عقائدی نجاست ہے۔ اس وجہ سے جس چیز کو شرک کی چھوت لگ جاتی ہے وہ بھی نجس ہو جاتی ہے۔ اس عقائدی نجاست کو یہاں 'فسق' کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ملتِ ابراہیمؑ میں اشیاء کی حلت و حرمت محض حکمی نہیں بلکہ فطری و عقلی بھی ہے۔ مذکورہ حرمتوں پر بھی اور اس کے ساتھ صورتِ اضطرار میں جو استثنا ہے اس پر بھی ہم ایک سے زیادہ مقامات میں بحث کر چکے ہیں اس وجہ سے یہاں زیادہ تفصیل میں جانے کی ضرورت باقی نہیں رہی۔

یہاں حلت وحرمت سے متعلق یہ بنیادی اصول ذہن میں رہے کہ ملتِ ابراہیمؑ میں تمام طیبات حلال تھیں، حرام صرف خبائث تھیں، عام اس سے کہ یہ خباثت ظاہری ہو یا باطنی۔ یہی بنیادی اصول اسلام میں بھی ملحوظ ہے اس لیے کہ اسلام، جیسا کہ پچھلی سورتوں میں واضح ہو چکا ہے، یہودیت و نصرانیت کے برعکس ملتِ ابراہیمؑ پر مبنی ہے۔ آگے ہم اسلام کے اصولِ حلت وحرمت کی وضاحت کریں گے۔

یہود پر بعض طیبات حرام ہونے کی وجہ

وَعَلَى الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا كُلَّ ذِيْ ظُفُرٍ الایۃ ملتِ ابراہیمؑ کے بعد اب یہ ملت یہود کا ذکر فرمایا کہ ان کے اوپر بے شک بعض طیبات حرام کر دی گئی تھیں۔ مثلاً تمام ناخون والے جانور اور گائے بکری وغیرہ کی چربی لیکن یہ حرام کرنا اس لیے نہیں تھا کہ فی نفسہٖ یہ چیزیں قابلِ حرمت تھیں بلکہ یہ ان کی سرکشی کی سزا کے طور پر ان پر حرام کی گئی تھیں۔ مطلب یہ ہے کہ اب ملتِ اسلام میں یہ حرمتیں باقی نہیں رہیں بلکہ تمام طیب چیزیں اس میں مباح کر دی گئیں اور یہود پر جو قیدیں اور پابندیاں (اصر و اغلال) عاید کی گئی تھیں وہ، جیسا کہ ان سے وعدہ کیا گیا تھا، خاتم الانبیاءؐ کی بعثت کے بعد اٹھا لی گئیں۔

یہود پر ہر ناخون والے جانور اور چربی کی حرمت کا یہاں جو ذکر ہے اس کی وضاحت کے لیے ہم تورات کے بعض حوالے پیش کرتے ہیں۔ پہلے چربی کی حرمت کے مسئلہ کو لیجیے۔

> اور خداوند نے موسیٰ سے کہا بنی اسرائیل سے کہہ تم لوگ نہ تو بیل کی، نہ بھیڑ کی اور نہ بکری کی کچھ چربی کھانا جو جانور خود بخود مر گیا ہو اور جس کو درندوں نے پھاڑا ہو ان کی چربی اور کام میں لاؤ تو لاؤ پر تم کسی حال میں نہ کھانا کیونکہ جو کوئی ایسے چوپائے کی چربی کھائے جسے لوگ آتشیں قربانی کے طور پر خداوند کے حضور چڑھاتے ہیں وہ کھانے والا آدمی اپنے لوگوں میں سے کاٹ ڈالا جائے۔
>
> احبار باب ۲۲-۲۵

دوسرے مقام میں چربی کی ان تمام قسموں کی تفصیل بھی ہے جو اُن کے لیے حرام ٹھہرائی گئیں۔

> جس چربی سے انتڑیاں ڈھکی رہتی ہیں اور وہ سب چربی جو انتڑیوں پر لپٹی رہتی ہے اور دونوں گُردے اور ان کے اوپر کی چربی جو کمر کے پاس رہتی ہے اور جگر پر کی جھلی گردوں سمیت ان سبھوں کو وہ الگ کرے اور کاہن ان کو مذبح پر جلائے۔ یہ اس آتشیں قربانی کی غذا ہے جو راحت انگیز خوشبو کے لیے ہوتی ہے۔ ساری چربی خداوند کی ہے۔ یہ تمھاری سب سکونت گاہوں میں نسل در نسل ایک دائمی قانون رہے گا کہ تم چربی یا خون مطلق نہ کھاؤ۔ احبار باب ۳ ۱۵-۱۷

قرآن کے الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ جو چربی گوشت کے جزو کی حیثیت رکھتی ہو، مکر یا آنتوں یا ہڈیوں میں اس طرح شامل ہو کہ اس کو بآسانی الگ نہ کیا جا سکے اس کے سوا تمام چربی بنی اسرائیل پر حرام تھی۔ یہی بات عقل کے مطابق معلوم ہوتی ہے لیکن تورات کے مذکورہ بالا بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ چربی مطلق حرام تھی۔ ہمارے نزدیک یہ تشدد یہود کے کاہنوں اور فقیہوں کی طرف سے اس تشدد پر ایک مزید اضافہ ہے

جوان کی شریعت میں پہلے بھی کچھ کم نہ تھا، چربی تو درکنار خون بھی آخر کچھ نہ کچھ تو گوشت کے جزو کی حیثیت سے رہ ہی جاتا ہے۔ چنانچہ اسی وجہ سے اوپر خون کی جو حرمت بیان ہوئی ہے اس کے ساتھ 'مسفوح' کی قید لگی ہوئی ہے کہ پابندی اسی حد تک رہے جس حد تک دائرہ فطرت کے اندر ہے اس سے آگے نہ بڑھنے پائے۔

'کُلَّ ذِیْ ظُفُرٍ' سے کیا مراد ہے؟ ظفر، یوں تو ناخون کو کہتے ہیں۔ لسان میں ہے 'الظفر یکون للانسان' ظفر انسان کے ناخون کو کہتے ہیں۔ کچھ لوگوں کی رائے ہے کہ 'الظفر لما لا یصید والمخلب لما یصید' جو جانور شکار نہیں کرتے ان کے ناخون کو ظفر کہتے ہیں، جو شکار کرتے ہیں ان کے پنجہ کو 'مخلب' کہتے ہیں۔

تورات کے مطالعہ سے حرام و حلال کی جو تفصیل سامنے آتی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہود کے ہاں چوپایوں میں سے صرف وہ چوپائے حلال تھے جن کے پاؤں چرے ہوئے ہیں اور وہ جگالی بھی کرتے ہیں۔ جن کے اندر ان میں سے کوئی ایک شرط بھی مفقود ہو وہ اُن کے ہاں حرام ہے۔ چنانچہ اونٹ، سافان اور خرگوش اور وہ تمام جانور جن کے پاؤں چرے ہوئے نہیں ہیں یہود کے ہاں حرام ہیں۔ اس روشنی میں 'ذِیْ ظُفُرٍ' کا مفہوم متعین کیا جائے تو اس سے مراد وہ جانور ہوں گے جن کے پاؤں چرے ہوئے نہیں ہیں بلکہ سُم کی شکل میں وہ بند اور ان کے سامنے کے حصہ پر ناخون ہیں۔ یہود پر اس طرح کے تمام جانور، جیسا کہ 'کُلَّ' کے لفظ سے معلوم ہوتا ہے علی الاطلاق حرام تھے اس وجہ سے ان پر بعض وہ جانور بھی حرام ہو گئے جو ملت ابراہیمؑ میں جائز تھے مثلاً اونٹ خرگوش وغیرہ۔

'ذٰلِکَ جَزَیْنٰھُمْ بِبَغْیِھِمْ وَاِنَّا لَصٰدِقُوْنَ' یعنی ناخون والے جانوروں اور چربی کی علی الاطلاق حرمت بنی اسرائیل پر اس وجہ سے نہیں تھی کہ فی نفسہٖ ان چیزوں کے اندر حرمت کی کوئی علت موجود ہے بلکہ ان کی حرمت میں اصل دخل بنی اسرائیل کے فساد مزاج کو تھا جس طرح ایک طبیب بسا اوقات کسی مریض کو ایک جائز و طیب چیز کے استعمال سے بھی روک دیتا ہے کہ اس سے اس کی صحت جسمانی کو ضرر کا اندیشہ ہوتا ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کے اخلاقی فساد کے سبب سے، سزا کے طور پر، بہت سی جائز چیزیں بھی ان پر حرام ٹھہرا دیں۔ اس اخلاقی فساد کو قرآن نے 'بغی' کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے جس کے معنی سرکشی کے ہیں۔ بنی اسرائیل کی اس سرکشی کا ذکر تورات اور انبیا کے صحیفوں میں اس کثرت سے آیا ہے کہ آدمی پڑھتے پڑھتے اکتا جاتا ہے۔ شریعت کا کوئی حکم ایسا نہیں ہے جس کو انھوں نے بخوشی قبول کیا ہو۔ جو حکم بھی ان کو دیا گیا اوّل تو انھوں نے اپنے سوال در سوال کی کثرت ہی سے اس کو نہایت بوجھل بنا لیا، جس کی ایک مثال سورہ بقرہ میں گائے کے قصے میں گزر چکی ہے۔ پھر اس کو مانا بھی تو اس سے گریز و فرار کی اتنی راہیں ڈھونڈھ ڈھونڈھ کے نکال لیں کہ عملاً وہ حکم اُن کے لیے بالکل بے اثر ہو کے رہ گیا۔ ان کے اس فرار پسندانہ اور باغیانہ مزاج کا اثر قدرتی طور پر ان کی شریعت پر بھی پڑا۔ جس طرح کسی سرکش جانور کا مالک اس کو سخت بندھنوں کے اندر رکھنے پر مجبور ہوتا ہے یا سرکش رعایا کا حکمران سخت قوانین نافذ کرتا ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ نے ان سرکشوں کو نہایت

سخت قوانین میں باندھا جن کو قرآن میں 'اصر و اغلال' یعنی بندھن اور طوق سے تعبیر فرمایا گیا ہے۔ تورات میں اسرائیلی شریعت کے احکام پڑھیے تو کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ دوسری چیزوں سے قطع نظر صرف طہارت ہی کے احکام پڑھیے اور دیکھیے کہ حیض، نفاس، جنابت اور بعض بیماریاں مثلاً جریان اور برص وغیرہ لاحق ہو جانے کی صورت میں ان کو کیا کیا پاپڑ بیلنے پڑتے تھے تو آدمی کارواں رواں اس رب کا شکر گزار ہوتا ہے جس نے ہمیں ملتِ اسلام کی ہدایت بخشی جو ان تمام غیر فطری بندشوں اور پابندیوں سے پاک ہے۔ کھانے پینے کے باب میں بھی صرف وہی بندشیں نہیں تھیں جو بیان ہوئیں۔ یہ بندشیں تو صرف چوپایوں کی حلت و حرمت کے متعلق بیان ہوئی ہیں، اس سے زیادہ پابندی ان پر دریائی جانوروں کے معاملے میں تھی۔ احبار باب ۱۱ سے معلوم ہوتا ہے کہ دریائی جانوروں میں سے جن کے پر اور چھلکے ہیں وہ ان کے ہاں جائز تھے باقی سب حرام تھے۔ اسی طرح پرندوں میں سے صرف شکاری پرندے ہی حرام نہیں تھے بلکہ قازیں، بط اور بگلے وغیرہ بھی حرام تھے۔

ان چیزوں کے حرام کیے جانے کی علت، جیسا کہ واضح ہوا، یہود کی سرکشی اور گردن کشی تھی اور اللہ تعالیٰ نے، جیسا کہ سورۂ مائدہ میں بیان ہو چکا ہے، یہود کو یہ احکام دیتے وقت ان سے وعدہ فرمایا تھا کہ جب آخری نبی آئیں گے تو اگر تم ان پر ایمان لائے تو وہ یہ پابندیاں تم پر سے اٹھا دیں گے اس لیے کہ ان کی بعثت دینِ فطرت، ملت ابراہیمؑ پر ہو گی جس میں اس قسم کی کوئی ناروا پابندی نہیں ہو گی۔

'وَاِنَّا لَصٰدِقُوْنَ' کے الفاظ یہاں بہت بلیغ ہیں۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے اپنے سچے ہونے پر جو اتنا زور دیا ہے تو مقصود صرف اپنے سچے ہونے کا اظہار نہیں ہے بلکہ اس میں حریف کے جھوٹے ہونے کا اعلان بھی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ملت ابراہیمؑ اور شریعت بنی اسرائیل سے متعلق یہ جو کچھ ہم نے بیان کیا ہے ہم اس میں بالکل سچے ہیں اور جو تاویل خائی یہ قریش اور یہود کے مفسدین و اشرار کر رہے ہیں یہ بالکل جھوٹے ہیں۔

'فَاِنْ كَذَّبُوْكَ فَقُلْ رَّبُّكُمْ ذُوْ رَحْمَةٍ وَّاسِعَةٍ' اب یہ قریش اور بنی اسرائیل دونوں کو دھمکی ہے۔ پیغمبر کو خطاب کر کے فرمایا کہ اس ساری وضاحت کے بعد بھی اگر یہ تم پر ایمان نہ لائیں، بدستور تمہارے جھٹلانے ہی پر اڑے رہیں تو ان کو سنا دو کہ اللہ چونکہ بڑی وسیع رحمت والا ہے، وہ سرکشوں اور ہٹ دھرموں کو بڑی دور اور بڑی دیر تک ڈھیل دیتا ہے تاکہ ان کے پاس کوئی عذر باقی نہ رہ جائے، اس وجہ سے وہ تمہیں ڈھیل پر ڈھیل دے رہا ہے۔ اس ڈھیل سے مغرور نہ ہو جاؤ۔ ڈھیل بہر حال ڈھیل ہے۔ اس سے اللہ کی پکڑ کچھ پیچھے تو بے شک ہو جاتی ہے لیکن اس سے اس کی وہ سنت باطل نہیں ہو جاتی جو مجرموں کی پکڑ کے لیے اس نے ٹھہرا رکھی ہے۔ جب اس کی اس سنت کے ظہور کا وقت آ جائے گا تو وہ کسی کے ٹالے نہیں ٹل سکے گی۔

اوپر ملت ابراہیمؑ اور شریعت بنی اسرائیل کی جو حرمتیں بیان ہوئی ہیں اس سے یہ حقیقت اچھی طرح واضح ہو گئی کہ مشرکین نے بلا سند بہت سی چیزیں جو حرام ٹھہرا رکھی تھیں ان کی حرمت کو ملت ابراہیمؑ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اسی طرح یہود بہت سی چیزوں کی حرمت کے جو مدعی تھے تو ان کی حرمت اصلاً نہیں بلکہ ان کے فسادِ مزاج

کے سبب سے مصلحتاً تھی اور وعدۂ الٰہی کے مطابق ان پابندیوں کو آخری بعثت کے ذریعے سے دُور ہونا تھا، چنانچہ وہ، جیساکہ سورۂ مائدہ میں بیان ہُوا، خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے سے دُور کر دی گئیں۔ اب اس ملّت میں حرام وہی چیزیں ہیں جو عقل و فطرت کی رُو سے حرام ہونی چاہئیں، مشرکین کی بدعات اور یہود کے تشددات سے اس ملّت کا ضابطۂ حلّت و حرمت پاک ہے۔

اسلام کا ضابطۂ حلّت وحرمت

ہم اختصار کے ساتھ یہاں اسلام کا وہ ضابطۂ حلّت و حرمت بھی پیش کیے دیتے ہیں جو قرآن نے بیان فرمایا ہے۔

قرآن نے حلّت و حرمت کی فطری بنیاد یہ بتائی ہے کہ جو طیّبات ہیں وہ حلال ہیں، جو خبائث ہیں وہ حرام ہیں۔ چنانچہ قرآن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ تعریف بیان ہُوئی ہے۔

يَأْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَاهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ	وہ ان کو حکم دیتا ہے معروف کا اور روکتا ہے منکر
وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبَاتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبَائِثَ	سے اور ان کے لیے جائز کرتا ہے پاکیزہ چیزیں اور
وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي	حرام ٹھہراتا ہے ناپاک چیزیں اور ان سے دُور کرتا
كَانَتْ عَلَيْهِمْ، ۱۵۷ اعراف	ہے وہ بوجھ اور وہ پابندیاں جو ان پر اب تک تھیں۔

'طیّبات' سے مراد ظاہر ہے کہ وہ چیزیں ہیں جو اپنے مزاج، اپنی سرشت اور انسان کے اوپر اپنے اثرات کے اعتبار سے پاکیزہ، معتدل، صحت بخش اور نافع ہیں۔

'خبیثات' سے مراد اس کے برعکس وہ چیزیں ہیں جو اپنے مزاج، اپنی جبلت اور انسان کے مزاج و طبیعت پر اپنے اثرات کے لحاظ سے مضر، انحراف انگیز اور مفسد ہیں۔

ان دونوں چیزوں کے اندر مذکورہ صفات کے اعتبار سے تفاوتِ درجات اور فرقِ مراتب ہوتا ہے، کوئی چیز زیادہ طیّب ہوتی ہے، کوئی چیز کم، اسی طرح کوئی چیز زیادہ خبیث ہوتی ہے کوئی کم۔ اس فرقِ مراتب کا اثر لازماً اس سے متعلق حکم پر بھی پڑتا ہے۔ مثلاً ایک چیز حرام کر دی جاتی ہے، دوسری چیز کراہت کے درجے ہی میں رہتی ہے۔

اسی طرح بعض حالات میں یہ بھی ہوتا ہے کہ ایک چیز کے اندر بجائے خود تو کوئی خرابی نہیں ہوتی لیکن کسی خارجی سبب سے اس کو کوئی خرابی لاحق ہو جاتی ہے اور وہ خبیث بن جاتی ہے۔ مثلاً غیر اللہ یا کسی تھان اور استھان کا ذبیحہ، جوئے کے ذریعہ سے حاصل کیا ہُوا گوشت یا حالت احرام میں کیا ہُوا شکار۔

یہ خیال صحیح نہیں ہے کہ اشیا کے درمیان خبیث و طیّب کا فرق محض ایک امر اضافی ہے۔ اس کی کوئی فطری یا عقلی و اخلاقی بنیاد نہیں ہے۔ ایک ہی چیز ایک قوم کے نزدیک حلال و طیّب ہوتی ہے، وہی چیز دوسری قوم کے نزدیک خبیث و حرام قرار پاتی ہے۔ ایسا سمجھنا صریح سوفسطائیت ہے۔ یہ کہنا درحقیقت دوسرے الفاظ میں یہ کہنا ہے کہ حق و باطل، عدل و ظلم اور خیر و شر بھی محض اضافی امور ہیں۔ ان کی کوئی عقلی و فطری بنیاد

نہیں ہے۔ اس مغالطے پر انشاء اللہ ہم کسی موزوں مقام پر تفصیل کے ساتھ بحث کریں گے۔

اسی طیب و خبیث کو معیار بنا کر اسلام نے چوپایوں میں سے وہ تمام چوپائے حلال ٹھہرائے جو انعام میں سے ہیں یا وحشی جانوروں میں سے انعام کے حکم میں داخل ہیں۔ مائدہ کے شروع میں اُحِلَّتْ لَكُمْ بَهِيْمَةُ الْاَنْعَامِ کے الفاظ آئے ہیں اور وہاں ہم واضح کر چکے ہیں کہ انعام کا لفظ اونٹ، گائے، بھیڑ بکری کے لیے معروف تھا۔ اس کی طرف 'بَهِيْمَة' کی اضافت نے اس میں وسعت پیدا کر دی اور وہ سارے جانور بھی اس میں شامل ہو گئے جو انعام کی جنس سے تعلق رکھنے والے ہیں عام اس سے کہ وہ پالتو ہیں یا وحشی، مثلاً بھینس چھترے، دنبے، نیل گاؤ، ہرن، چیتل، پاڑے وغیرہ۔ البتہ وہ جانور اس سے نکل جائیں گے جو درندوں کے حکم میں داخل ہیں اس لیے کہ وہ 'بَهِيْمَةُ الْاَنْعَام' کے تحت نہیں آتے مثلاً شیر، ریچھ، بھیڑیے، کتے وغیرہ۔ چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے درندہ جانوروں کو حرام قرار دیا۔ اسی طرح مردار، خنزیر، بہایا ہوا خون اور غیر اللہ کے نام یا تھان اور استھان کا ذبیحہ بھی حرام ہے۔ اس لیے کہ ان میں نجاست و خباثت ہے۔ بعض کے اندر ظاہری نجاست ہے بعض کے اندر عقلی۔

یہی ضابطہ پرندوں پر بھی لاگو ہو گا۔ ان میں سے بھی جو درندوں کی نوعیت کے ہیں۔ مثلاً چیل، باز، عقاب شکرے وغیرہ یا ان کے اندر کوئی اس نوع کی خباثت پائی جاتی ہے جو اوپر مذکور ہوئی وہ حرام ہیں باقی جائز۔

یہی ضابطہ دریائی جانوروں اور ہوام و حشرات پر بھی نافذ ہو گا۔ ان میں سے بھی خبیث و طیب کے اسی اصول کو سامنے رکھ کر فرق کیا جائے گا جو اوپر مذکور ہوا۔

اسی ضابطہ پر وہ چیزیں بھی پرکھی جائیں گی جو نباتات میں سے ہیں یا نباتات کی ترکیب و تحلیل سے پیدا ہوتی ہیں۔ مثلاً شراب خواہ کسی چیز سے تیار کی جائے حرام ہے اس لیے کہ اس میں عقلی و اخلاقی خباثت ہے۔

اسلام میں حلت و حرمت کا اصل ضابطہ یہی ہے۔ اس ضابطہ کی روشنی میں حلال بین اور حرام بین کا تعین کر لینا کچھ مشکل نہیں ہے لیکن نہ دنیا میں چوپایوں کی کوئی حد ہے، نہ پرندوں کی اور نہ دریائی جانوروں کی، اس وجہ سے بہت سی چیزوں کے بارے میں اختلاف بھی ہو سکتا ہے۔ چنانچہ ہمارے فقہا نے مختلف چیزوں کے بارے میں اختلاف کیا بھی ہے۔ یہ اختلاف فقہ کی کتابوں میں تفصیل سے مذکور ہے۔ بعض لوگ بعض چیزوں کو درندوں میں داخل کرتے ہیں، بعض نہیں داخل کرتے، اسی طرح بعض چیزوں کو بعض فقہا خبیث قرار دیتے ہیں بعض ان کو خبیث نہیں قرار دیتے۔ ہمارے نزدیک اس باب میں حنفیہ کا مسلک۔ قرآن کے بیان کردہ اصول حلت و حرمت سے زیادہ اوفق ہے لیکن اس طرح کے مسائل میں، جن کے اندر اختلاف کی گنجائش ہے، صحیح طریقہ یہ ہے کہ آدمی ان کو متشابہات کے درجہ میں رکھے۔ یعنی ان سے احتراز کرے، اگر اس کے نزدیک احتراز کا پہلو راجح ہے، لیکن دوسرے کو مرتکب حرام قرار نہ دے۔ حدیثوں میں گوہ کے باب میں حضورؐ کا جو ارشاد نقل ہے وہ اس طرح کے مسائل میں بہترین رہنمائی دیتا ہے۔

البتہ ایک تنبیہ یہاں ضروری ہے۔ بعض صحابہؓ کے متعلق بعض کتابوں میں یہ جو نقل ہوا ہے کہ وہ اسلام میں صرف وہی چار چیزیں حرام مانتے تھے جو اوپر قُلْ لَآ اَجِدُ فِیْ مَآ اُوْحِیَ اِلَیَّ والی آیت میں مذکور ہیں، یہ بات کسی طرح بھی صحیح نہیں معلوم ہوتی۔ اس کے نقل میں راویوں سے تسامح ہوا ہے۔ صحابہؓ میں سے کسی کی طرف اس بات کی نسبت بعید از عقل ہے۔ ان میں کسی نے اگر کہی ہوگی تو یہ بات کہی ہوگی کہ ملت ابراہیمؑ میں بس یہی چار چیزیں چوپایوں میں سے حرام تھیں۔ یہ بات کہنے کا ایک محل ہے جس کی وضاحت ہم اوپر کر چکے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے اسی بات کو غلط فہمی کی بنا پر راوی نے یہ شکل دے دی کہ وہ اسلام میں بس یہی چار چیزیں حرام مانتے تھے۔

سَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَآ اَشْرَكْنَا وَلَآ اٰبَآؤُنَا وَلَا حَرَّمْنَا مِنْ شَيْءٍ ۭ كَذٰلِكَ كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ حَتّٰى ذَاقُوْا بَاْسَنَا ۭ قُلْ هَلْ عِنْدَكُمْ مِّنْ عِلْمٍ فَتُخْرِجُوْهُ لَنَا ۭ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنْ اَنْتُمْ اِلَّا تَخْرُصُوْنَ ۝ قُلْ فَلِلّٰهِ الْحُجَّةُ الْبَالِغَةُ ۚ فَلَوْ شَآءَ لَهَدٰىكُمْ اَجْمَعِيْنَ ۝ قُلْ هَلُمَّ شُهَدَآءَكُمُ الَّذِيْنَ يَشْهَدُوْنَ اَنَّ اللّٰهَ حَرَّمَ هٰذَا ۚ فَاِنْ شَهِدُوْا فَلَا تَشْهَدْ مَعَهُمْ ۚ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَالَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ وَهُمْ بِرَبِّهِمْ يَعْدِلُوْنَ (۱۴۸-۱۵۰)

مشرکین کا آخری معارضہ

"سَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَآ اَشْرَكْنَا الآیۃ" اب یہ مشرکین کا آخری معارضہ نقل فرمایا ہے اور اس کا جواب دیا ہے۔ مشرکین جب ہر طرف سے بحث میں پسپا ہو جاتے تو آخری بات یہ کہتے کہ اگر ہم نے خدا کا شریک ٹھہرانے اور کسی چیز کو حرام قرار دینے کے معاملے میں خدا کی مرضی کی مخالفت کی ہے تو خدا کے اختیار میں تو سب کچھ ہے، اس نے اپنے اختیار سے ہم کو روک کیوں نہیں دیا؟ جب اس نے اپنے اختیار کے زور سے ہم کو نہیں روکا تو اس کے معنی یہ ہیں کہ جو کچھ ہم نے کیا اور کر رہے ہیں یہی اس کا حکم اور یہی اس کی مرضی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ معارضہ ایک بالکل ہی احمقانہ معارضہ ہے۔ انسانوں کو کسی قول یا فعل کی آزادی ملنا اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ وہ قول یا فعل عند اللہ بھی صحیح ہے۔ اگر یہ کوئی دلیل ہے تو یہ دلیل ہر احمق اپنی حماقت کے جواز میں، ہر ظالم اپنے ظلم کی حمایت میں اور ہر بدمعاش اپنی بدمعاشیوں کے حق میں پیش کر سکتا ہے کہ جو کچھ اس نے کیا اور کر رہا ہے خدا کے حکم سے کیا اور کر رہا ہے۔ فرمایا کہ یہ معارضہ محض ان کی شرارت کی ایجاد اور اپنی ضد پر اڑے رہنے کا بہانہ ہے۔ یہی روش ان کے پچھلے ہم مشربوں نے اختیار کی یہاں تک کہ وہ خدا کے عذاب سے دوچار ہوئے۔ یہی انجام ان کا ہونا ہے تو تم ان کو ان کے حال پر چھوڑو۔

قریش سے کسی علمی دلیل کا مطالبہ

"قُلْ هَلْ عِنْدَكُمْ مِّنْ عِلْمٍ فَتُخْرِجُوْهُ لَنَا اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ" مطلب یہ ہے کہ ان سے کہو کہ خدا کی پسند یا ناپسند معلوم کرنے کا ذریعہ تمہاری اپنی زندگی اور تمہارے اپنے اعمال نہیں ہیں کہ تم جو کچھ کر گزرو وہ عند اللہ ثواب بن جائے۔ اس کے لیے کسی علمی سند کی ضرورت ہے۔ یا تو خدا نے تم کو اس کا حکم دیا ہو جس کا کوئی ثبوت موجود ہو یا عقل و فطرت کے اندر اس کے حق میں کوئی شہادت ہو جس کو تم پیش کر سکو۔ اس قسم کی کوئی چیز

تو تمھارے پاس ہے نہیں، محض اٹکل کے تیر تکے چلاتے اور قیاس کے گھوڑے دوڑاتے ہو۔ حالانکہ وہم و گمان علم کا بدل نہیں ہو سکتا۔

ہدایت و ضلالت کے باب میں سنتِ الٰہی

'قُلْ فَلِلّٰهِ الْحُجَّةُ الْبَالِغَةُ فَلَوْ شَآءَ لَهَدٰىكُمْ اَجْمَعِيْنَ' اب یہ ہدایت و ضلالت کے معاملے میں اللہ تعالیٰ کی جو اصل سنت ہے وہ واضح فرمائی کہ اللہ کا طریقہ یہ نہیں ہے کہ وہ اپنی مشیت کے زور سے جس کو چاہے ہدایت پر کر دے۔ اگر وہ ایسا کرنا چاہتا تو اس کی اس مشیت کو کوئی روک تو نہیں سکتا تھا، وہ تم سب کو بلکہ ساری خلق کو ہدایت پر کر دیتا لیکن اس معاملے میں اس نے جبر کو پسند نہیں فرمایا ہے بلکہ دلیل و حجت کے ذریعہ سے وہ رہنمائی کرتا ہے اور لوگوں کو اس نے یہ اختیار دیا ہے کہ وہ چاہیں تو اس رہنمائی کو قبول کریں اور چاہیں تو رد کریں۔ پس اللہ نے اپنی یہ حجت بالغہ اپنے رسول کے ذریعے سے تم کو پہنچا دی۔ تمھارے پاس تو محض ظن و گمان ہے مگر اللہ کے پاس عقل و دل میں اتر جانے والی دلیلیں ہیں بشرطیکہ تم ان کے سننے اور سمجھنے کے لیے اپنے کانوں اور اپنے دلوں کو کھولو۔ ہدایت حاصل کرنے کی راہ یہی ہے۔ خدا اپنی مشیت کے زور سے کسی کو ہدایت نہیں دیا کرتا۔ یہ تو حجت و دلیل اور عقل و دل کا سودا ہے۔

گواہی کے لیے دو بنیادیں

'قُلْ هَلُمَّ شُهَدَآءَكُمُ الَّذِيْنَ يَشْهَدُوْنَ اَنَّ اللّٰهَ حَرَّمَ هٰذَا' مطلب یہ ہے کہ محض اٹکل کے تیر تکے نہ چلاؤ۔ ہاں اگر تمھارے پاس ایسے گواہ ہوں جو یہ گواہی دے سکیں کہ جو چیزیں تم نے حرام ٹھہرا رکھی ہیں خدا نے وہ حرام ٹھہرائی ہیں تو ان گواہوں کو سامنے لاؤ۔ یہ واضح رہے کہ معقول گواہی صرف دو بنیادوں پر ہوتی ہے ایک تو ذاتی مشاہدہ اور شخصی علم و واقفیت پر، دوسری کسی عقلی یا فطری قرینہ پر جس کی مثال سورۂ یوسف کی آیت ۲۶-۲۸ میں موجود ہے۔ یہاں قرآن نے ان دونوں ہی قسم کے گواہوں اور گواہیوں کا مطالبہ کیا ہے کہ اس طرح کی کوئی گواہی بھی موجود ہو تو اس کو پیش کرو، ورنہ اس حجت بالغہ کو قبول کرو جو قرآن تمھارے آگے پیش کر رہا ہے۔

جن کے پاس دلیل نہیں وہ خواہشوں کے پیرو ہیں

'فَاِنْ شَهِدُوْا فَلَا تَشْهَدْ مَعَهُمْ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا' الآیہ یعنی اگر گواہی کی مذکورہ شرطوں کے بغیر ہی یہ گواہی دینے کے لیے اٹھ کھڑے ہوں تو تمھیں ایسے لاغیوں اور ہرزہ سراؤں کی پروا کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ تم اپنی دعوت و شہادت پر جمے رہو۔ ان لوگوں کی خواہشات و بدعات کی پیروی نہ کرو۔ یہاں ان کی بدعات کو 'اَهْوَآءَ' کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے، اس لیے کہ جس چیز کے حق میں نہ کوئی نقلی دلیل ہو نہ عقلی، ظاہر ہے کہ وہ اس کے اختیار کرنے والوں کی خواہش ہی پر مبنی ہو سکتی ہے اور جن کی رہنما ان کی خواہش ہو ان کا انجام معلوم۔ یہاں ان لوگوں کی تین صفات کا حوالہ دیا ہے۔ ایک یہ کہ یہ اللہ کی آیات کی تکذیب کرتے ہیں، دوسری یہ کہ یہ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے، تیسری یہ کہ یہ اپنے رب کے ہم سر ٹھہراتے ہیں۔ مقصود ان صفات کے حوالہ سے یہ ہے کہ جو لوگ اتنے بگ ٹٹ ہیں کہ خدا، آخرت اور آیاتِ الٰہی میں سے کوئی چیز بھی ان کے نزدیک درخور اعتنا نہیں، ایسے عناں گسیختہ لوگوں کی خواہشیں ان کو کہاں لے جائیں گی، اس کا کون اندازہ کر سکتا ہے!

قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ اَلَّا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـًٔا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ مِّنْ اِمْلَاقٍ ۭ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَاِيَّاهُمْ ۚ وَلَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ ۚ وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ ۭ ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۝ وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِىَ اَحْسَنُ حَتّٰى يَبْلُغَ اَشُدَّهٗ ۚ وَاَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيْزَانَ بِالْقِسْطِ ۚ لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ۚ وَاِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوْا وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى ۚ وَبِعَهْدِ اللّٰهِ اَوْفُوْا ۭ ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ۝ وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ ۚ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ ۭ ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ (۱۵۱-۱۵۳)

اصل ملتِ ابراہیم کی تفصیل

'قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ اَلَّا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـًٔا' یہ اصل ملت ابراہیمی کا تفصیلی بیان ہے۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے کہلایا کہ تم نے تو محض اپنے ظن و گمان سے ملتِ ابراہیم کی بعض طیب حلال چیزوں کو اپنے مشرکانہ توہمات کی بنا پر حرام ٹھہرا کر یہ سمجھ رکھا ہے کہ بس کُل ملتِ ابراہیم یہی ہے اور تم نے اس کا حق ادا کر دیا، حالانکہ ملت ابراہیم میں دوسری بہت سی باتیں، جو خدا اور بندوں کے حقوق و معاملات سے متعلق حرام ہیں، ان کو تم نے اختیار کر رکھا ہے۔ تو آؤ، میں تمھیں سُناتا ہوں کہ تمھارے رب نے تم پر کیا کیا چیزیں حرام ٹھہرائی ہیں۔ فرمایا کہ سب سے پہلی چیز جو تم پر حرام کی گئی وہ شرک ہے لیکن شرک کو تم نے اپنا دین بنا رکھا ہے۔

والدین کے ساتھ حسنِ سلوک

'وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا' خدا کے بعد سب سے بڑا حق والدین کا ہے۔ اب یہ اس کا ذکر فرمایا۔ یہ ہے تو اسی اوپر والی بات ہی کے تحت لیکن اس کو منفی کے بجائے مثبت پہلو سے ذکر فرمایا۔ زیر بحث آیات میں اسلوب کی یہ ندرت قابلِ لحاظ ہے کہ بعض باتیں منفی پہلو سے بیان ہوئی ہیں، بعض مثبت پہلو سے۔ مثلاً شرک، قتلِ اولاد، فحشا، قتلِ نفس اور اکل مالِ یتیم کا ذکر تو منفی پہلو سے ہے اور والدین کے ساتھ احسان، ایفائے کیل و میزان، قول و عمل میں اہتمام عدل اور ایفائے عہد الٰہی کا ذکر مثبت اسلوب سے ہے۔ بعینہٖ یہی اسلوب، بعینہٖ انہی امور کے بیان میں بنی اسرائیل کی آیات ۲۲-۳۸ میں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نفی سے اثبات اور اثبات سے نفی کا استنباط ایک بدیہی چیز ہے۔ جب ایک شے کا اثباتی انداز میں حکم ہے تو اس کے لازمی معنی یہ ہیں کہ جو چیز اس کی ضد ہے اس کی لازماً ممانعت ہے۔ علی ہذا القیاس ایک چیز کی ممانعت ہے تو اس سے یہ بات آپ سے آپ نکلی کہ اس کا مقابل پہلو مطلوب ہے۔ یعنی اگر شرک کی نہی ہے تو توحید مطلوب ہے، علی ہذا القیاس اگر والدین کے حقوق کی ادائیگی کا حکم ہے تو ان کے ساتھ بدسلوکی اور ان کی نافرمانی حرام ہے۔ اس اسلوب کی روشنی میں وہ تمام باتیں جو بیان تو ہوئی ہیں اثبات کے الفاظ میں لیکن ہیں ظاہری تالیف کلام کے اعتبار سے 'حَرَّمَ' ہی کے تحت ان سب کے ضد پہلو کو بھی مدنظر رکھیے۔ گویا پوری بات یوں ہے کہ 'والدین کو اُف کہو نہ جھڑکو بلکہ ان کے ساتھ اچھا سلوک کرو'، اس

اسلوب کا فائدہ یہ ہے کہ اس میں جو پہلو زیادہ زور و قوت سے ظاہر کرنے کا ہے وہ تو الفاظ میں بیان ہو جاتا ہے اور اس کا ضد پہلو بغیر الفاظ کی مدد کے مجرد فحوائے کلام اور اقتضائے نظام سے سمجھ میں آ جاتا ہے۔ قرآن نے اس اسلوب کے مضمرات کہیں کہیں کھول بھی دیے ہیں۔ مثلاً سورۂ بنی اسرائیل میں یہی بات یوں ارشاد ہوئی ہے۔

وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ	اور تیرے رب کا فیصلہ یہ ہے کہ تم نہ عبادت کرو مگر
وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ۭ اِمَّا يَبْلُغَنَّ	اسی کی اور والدین کے ساتھ احسان کرو جیسا کہ اس کا
عِنْدَكَ الْكِبَرَ اَحَدُهُمَآ اَوْ	حق ہے۔ اگر تمہارے سامنے ان میں سے ایک یا دونوں
كِلٰهُمَا فَلَا تَقُلْ لَّهُمَآ اُفٍّ	بڑھاپے کو پہنچ جائیں تو ان سے اظہار بیزاری ہو،
وَّلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلًا	نہ ان کو جھڑکنا، ان سے سعادت مندانہ بات کرنا اور
كَرِيْمًا ۝ وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ	ان کے لیے مہر و وفا کے بازو جھکائے رکھنا اور دعا
مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا	کرنا کہ اے رب تو ان پر رحم فرما جس طرح انھوں نے
رَبَّيٰنِيْ صَغِيْرًا ۝ ۲۳-۲۴ بنی اسرائیل	مجھے بچپن میں مہر کے ساتھ پالا۔

قتل اولاد فقر و فاقہ کے اندیشے سے

وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ مِّنْ اِمْلَاقٍ ۭ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَاِيَّاهُمْ "املاق" کے معنی فقر و تنگ دستی کے ہیں۔ سورۂ بنی اسرائیل میں 'خشیۃ املاق' کے الفاظ ہیں۔ یعنی اس اندیشہ سے کہ اولاد کیا کھائے گی، کہاں سے اس کی پرورش ہو گی، اس کو قتل نہ کرو۔ اہل عرب میں قتل اولاد کی ایک قسم تو وہ تھی جس کا تعلق مشرکانہ توہمات سے تھا، جس کا ذکر اسی سورہ میں پیچھے گزرا ہے، دوسری صورت بعض قبائل میں لڑکیوں کو زندہ درگور کر دینے کی تھی جس کا سبب غیرت کا ظالمانہ حد تک غلو تھا۔ تیسری یہ فقر و فاقے کے اندیشے کی صورت تھی۔ بعض غریب لوگ تنگ دستی سے گھبرا کر یہ سنگ دلانہ حرکت کر بیٹھتے۔ اس قسم کی لرزہ خیز خبریں اب بھی کبھی کبھی ان ملکوں سے آ جاتی ہیں جن میں غربت زیادہ ہے یا جہاں کسی ناگہانی آفت سے لوگ مصائب میں گرفتار ہو جاتے ہیں۔ اس ظلم کا اصل باعث انسان کی یہ جہالت ہے کہ وہ اپنے آپ کو اپنا اور اپنی اولاد اور متعلقین کا روزی رساں سمجھ بیٹھتا ہے حالانکہ ہر شخص کو وجود اور رزق خدا کی طرف سے ملتا ہے۔ انسان ان چیزوں میں واسطہ اور ذریعہ ہونے سے زیادہ دخل نہیں رکھتا۔ اگر کسی کو خدا نے اولاد بخشی ہے تو اصلاً وہ اس کی تحویل میں خدا کی امانت ہے۔ اس کا فرض یہ ہے کہ عقل و فطرت اور شریعت کی رُو سے اس امانت سے متعلق اس پر جو ذمہ داریاں اور جو فرائض عاید ہوتے ہیں وہ اپنے امکان کے حد تک ادا کرے۔ لیکن ایک لمحہ کے لیے بھی اس غلط فہمی میں مبتلا نہ ہو کہ خدا نے اس کو ان کا رزّاق بنایا ہے اور جس رزق سے وہ پلتے ہیں یہ وہ ان کو فراہم کرتا ہے۔ ان کا رزق تو درکنار آدمی اپنا رزق بھی خدا ہی سے پاتا ہے۔ بچہ ماں کی چھاتی سے جو دودھ پیتا ہے یہ بھی ماں کا دیا ہوا نہیں بلکہ اپنے رب کا دیا ہوا پیتا ہے

تو جب بچہ اپنے رب کا دیا ہُوا کھاتا پیتا ہے تو کسی دوسرے کو کیا حق پہنچتا ہے کہ وہ اس کو اس اندیشہ سے قتل کرے کہ میں اس کی پرورش کہاں سے کروں گا؟ قرآن نے اسی حقیقت کو یوں سمجھایا ہے کہ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَاِيَّاهُمْ (ہم ہی تم کو بھی روزی دیتے ہیں اور ان کو بھی روزی دیتے ہیں)۔

خاندانی منصوبہ بندی

افراد کی طرح بعض اوقات حکومتیں بھی اپنے دائرۂ اختیار اور اپنے فطری و شرعی حدود کار سے متجاوز ہو کر ان حدود میں مداخلت کرنے لگتی ہیں جو قدرت کے حدود ہیں۔ اس تعدی کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ خلق کے لیے کوئی مفید کام کرنے کی جگہ وہ اپنی صلاحیتیں نظامِ قدرت سے زور آزمائی میں صرف کرنا شروع کر دیتی ہیں۔ ایک فرض شناس حکومت کے لیے یہ بات تو معقول ہے کہ وہ اپنے ملک کے وسائل معاش کو ترقی دینے کے لیے بر و بحر کے ایک ایک چپہ اور ایک ایک گوشے کو چھان ڈالے اور اس راہ کے کسی پتھر کو بھی اُلٹے بغیر نہ چھوڑے، یہ بات بھی اس کے فطری بلکہ شرعی فرائض میں سے ہے کہ وہ ملک کے عوام کو زندگی کے ہر شعبہ میں، خواہ وہ پبلک ہو یا پرائیویٹ، اجتماعی ہو یا خاندانی، احتیاط، اعتدال، کفایت شعاری، صحت، صفائی اور محنت کی تربیت دے لیکن یہ امر بالکل اس کے دائرۂ اختیار اور حدود کار سے باہر ہے کہ وہ یہ منصوبہ بندی کرے کہ اتنی مدت میں ہم اتنا غلّہ پیدا کریں گے اور اسی حساب سے اتنے بچوں کو پیدا ہونے دیں گے اور اگر کسی مزید ناخواندہ مہمان نے ہماری نپی روٹی اور گنی بوٹی میں حصہ دار بننے کی کوشش کی تو ہم اپنی سائنسی تدبیروں سے کام لے کر اس کا گلا گھونٹ دیں گے۔

غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ اس معاملے میں جو غلط فہمی عرب جاہلیت کے سنگدلوں کو لاحق ہُوئی تھی اسی غلط فہمی کا شکار اس زمانے کی متمدن حکومتیں ہو رہی ہیں۔ انھیں بھی خدا پر غصہ تھا کہ جب وہ بھرپور روٹی نہیں دے رہا ہے تو مبدم اولادیں کیوں اضافہ کیے جا رہا ہے؟ یہ غصہ وہ اولاد کو قتل کر کے نکالتے تھے۔ اس زمانے کے متمدن انسان کو بھی یہ برہمی ہے کہ ابھی جب اپنے ہی معیارِ زندگی کو ہم اپنے مطلوبہ معیار پر نہ پہنچا سکے تو دوسروں کی ذمہ داری کا بوجھ اپنے کندھوں پر کس طرح اٹھا لیں؟ اس برہمی یا گھبراہٹ میں انھوں نے خاندانی منصوبہ بندی کی اسکیم بنا ڈالی۔ شکلیں ذرا بدلی ہوئی ہیں، عرب اجڈ اور گنوار تھے اس وجہ سے انھوں نے ایک ناتراشیدہ اور بھونڈی سی شکل اختیار کی، موجودہ زمانے کا انسان مہذب اور تعلیم یافتہ ہے اس وجہ سے اس نے ایک خوب صورت سی شکل اختیار کی ہے اور نام بھی اس کا اس نے پیارا سا ڈھونڈھ نکالا ہے لیکن فلسفہ دونوں جگہ ایک ہی ہے۔ انھوں نے بھی رزّاق اپنے کو سمجھا اور یہ بھی رزّاق اپنے کو سمجھے بیٹھے ہیں حالانکہ رزّاق اللہ تعالیٰ ہے۔ قرآن نے عربوں پر تو ان کی غلطی واضح کر دی اور وہ یہ بات سمجھ بھی گئے، مان بھی گئے، لیکن اس زمانے کے پڑھے لکھے جنوں کو کون سمجھائے اور کون قائل کرے!!

زنا اور محرکاتِ زنا

وَلَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ، 'فَوَاحِشَ' کے معنی کھلی ہوئی بے حیائی اور بدکاری کے ہیں،

جن میں اولین درجہ زنا کو حاصل ہے۔ چنانچہ سورۂ بنی اسرائیل میں اسی مضمون کو یوں ادا فرمایا ہے وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنَا اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً ۭ وَسَاۗءَ سَبِيْلًا ۳۲ (اور زنا کے پاس بھی نہ پھٹکو، یہ کھلی ہوئی بے حیائی اور نہایت ہی بری راہ ہے) لَا تَقْرَبُوْا کا لفظ ان برائیوں سے روکنے کے لیے قرآن میں استعمال ہوا ہے جن کا پرچھاواں بھی انسان کے لیے مہلک ہے، جو خود ہی نہیں بلکہ جن کے دواعی و محرکات بھی نہایت خطرناک ہیں، جو بہت دور سے انسانوں پر اپنی کمند پھینکتی ہیں اور پھر اس طرح اس کو گرفتار کر لیتی ہیں کہ ان سے چھوٹنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ ایسی برائیوں سے اپنے آپ کو بچائے رکھنے میں آدمی کو کامیابی صرف اسی صورت میں حاصل ہوتی ہے جب وہ اپنی نگاہ، اپنی زبان، اپنے دل کی پوری پوری حفاظت کرے اور ہر اس رخنہ کو پوری ہوشیاری سے بند رکھے جس سے کوئی ترغیب اس کے اندر راہ پا سکتی ہو اور ہر ایسے مقام سے پرے پرے رہے جہاں کوئی لغزش ہو سکتی ہے۔ اسی لَا تَقْرَبُوْا کے تقاضوں کو بروئے کار لانے کے لیے قرآن نے مردوں اور عورتوں دونوں پر بہت سی پابندیاں عاید کی ہیں جن کی تفصیل احزاب اور نور میں بیان ہوئی ہے۔ وہاں ہم انشاء اللہ اس کے سارے پہلو زیر بحث لائیں گے۔

نیکیوں اور بدیوں دونوں سے متعلق یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ ان کا اصل منبع انسان کا دل ہوتا ہے اس وجہ سے کوئی نیکی اس وقت تک فروغ نہیں پاتی جب تک دل کے اندر اس کی جڑ مضبوط نہ ہو۔ علیٰ ہذا القیاس کوئی برائی اس وقت تک انسان کی جان نہیں چھوڑتی جب تک دل کے اندر سے اس کی جڑ اکھاڑ نہ دی جائے۔ اگر کوئی برائی دل کے اندر موجود رہے تو وہ کان، آنکھ، زبان، فکر اور خیال کی راہ سے برابر غذا حاصل کر کے موٹی ہوتی رہتی ہے۔ یہاں تک کہ وہ روحانی سرطان کی شکل اختیار کر لیتی ہے اور گو اس کو زندگی میں ایک دن بھی فعلاً بروئے کار آنے کا موقع نہ ملا ہو تاہم انسان کے قلب و دماغ پر اس کا اس طرح تسلط ہو جاتا ہے کہ پھر تزکیہ و اصلاح کا کوئی سخت سے سخت اپریشن بھی اس پر کارگر نہیں ہوتا۔ وہ بالآخر انسان کی اخلاقی و ایمانی موت ہی پر منتہی ہوتی ہے اس وجہ سے قرآن نے ظاہری اور باطنی دونوں قسم کے فحشا سے دور رہنے کی تاکید فرمائی۔

قتلِ نفس

وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ، ہر جان بجائے خود محترم ہے اس وجہ سے اس کی صفت اَلَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ (جس کو اللہ نے حرام ٹھہرایا) وارد ہوئی۔ اس سے مستثنیٰ صرف وہ جان ہے جو کسی حق شرعی یا بالفاظ دیگر قانون کے تحت مباح الدم قرار پا جائے۔ مثلاً کسی پر قصاص عاید ہو یا وہ اللہ و رسول کے خلاف بغاوت کے لیے اٹھ کھڑا ہو یا زنا کی اس شکل کا مرتکب ہوا ہو جس پر رجم کی سزا ہے۔ اس قسم کے حق شرعی و قانونی کے بغیر کسی کو قتل کرنا جائز نہیں۔

ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ یہ باتیں ہیں جن کی اللہ نے ملتِ ابراہیمؑ میں ہدایت فرمائی تھی۔ تم یہ باتیں تو چھوڑ بیٹھے، البتہ اپنے جی سے چند اچھے بھلے جانوروں کو حرام کر کے ملتِ ابراہیمؑ کے دعویدار

بنے پھر رہے ہو۔ اب میں تمھیں از سرِ نو ملتِ ابراہیمؑ کے یہ احکام اس لیے سنا رہا ہوں کہ تم سوچو اور سمجھو کہ تم کہاں سے کہاں نکل گئے ہو اور دعویٰ یہ رکھتے ہو کہ تم ملت ابراہیم پر ہو۔ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ کا اصلی زور سمجھنے کے لیے کلام کی تمہید قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ پیشِ نظر رکھیے۔ مطلب یہ ہے کہ میں نے یہ تفصیل اس لیے سنائی ہے کہ تم اپنے رویہ کا جائزہ لو اور حقیقتِ حال کو سمجھو۔

اکل مالِ یتیم

وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ۔ اس کی پوری وضاحت سورۂ نساء کی تفسیر میں ہو چکی ہے۔ یتیم کا مال دوزخ کی آگ ہے اس وجہ سے کسی بُری نیت سے کسی کو اس کے پاس بھی نہیں پھٹکنا چاہیے۔ جو بھی اس کے پاس جائے صرف اچھی ہی راہ سے جائے، یعنی اس کو سنبھالنے اور حتی الامکان ترقی دینے کے لیے، تا آنکہ یتیم بالغ ہو جائے۔ جب بالغ ہو جائے پوری احتیاط کے ساتھ گواہوں کی موجودگی میں اس کا مال اس کے حوالہ کرے۔

ناپ تول میں عدل کا اہتمام

وَاَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيْزَانَ بِالْقِسْطِ۔ ناپ تول کو ٹھیک ٹھیک عدل کے ساتھ پورا کرو۔ یہ بات بھی مثبت پہلو سے ارشاد ہوئی ہے اس وجہ سے اس کے ضد پہلو کو بھی، جیسا کہ اوپر ہم نے وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا کے تحت عرض کیا، پیشِ نظر رکھنا ہوگا۔ یعنی ناپ تول میں کمی بیشی نہ کرو کہ اپنے لیے اور پیمانہ ہو، دوسروں کے لیے اور۔ لینے کے لیے کوئی باٹ ہو، دینے کے لیے کوئی۔ وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ ۙ الَّذِيْنَ اِذَا اكْتَالُوْا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُوْنَ ۖ وَاِذَا كَالُوْهُمْ اَوْ وَّزَنُوْهُمْ يُخْسِرُوْنَ ۱-۳ مطففین۔ (ناپ تول میں کمی کرنے والوں کی تباہی ہے کہ لوگوں سے لیں تو پورا ناپ کر لیں اور جب ان کے لیے ناپیں یا تولیں تو اس میں کمی کریں) یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ نظام کائنات، جیسا کہ سورۂ آلِ عمران میں واضح ہوا، عدل و قسط پر قائم ہے اور اس کائنات کی ہر چیز شاہد ہے کہ اس کا خالق و مدبّر قائم بالقسط ہے اس وجہ سے اس دنیا کی صلاح و فلاح کے لیے بنیادی چیز یہ ہے کہ انسان اپنے دائرۂ اختیار میں بھی کانٹے کی تول عدل و قسط کو قائم کرے۔ اگر اس میں ذرا رخنہ پیدا ہوا تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ہماری زندگی اپنے مرکزِ ثقل سے منحرف ہو گئی اور اب سارے نظامِ تہذیب و تمدن میں فساد و اختلال رونما ہو کے رہے گا۔ عدل و قسط کی اس اہمیت کی وجہ سے یہ حکم ہوا کہ ناپ تول کو ٹھیک ٹھیک انصاف کے ساتھ پورا کرو۔ سورہ بنی اسرائیل میں اس کی برکات کی طرف بھی اشارہ فرما دیا ہے وَاَوْفُوا الْكَيْلَ اِذَا كِلْتُمْ وَزِنُوْا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيْمِ ۭ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا ۳۵ (اور ناپ کو پورا کرو جب ناپو، اور جب تولو تو ٹھیک ترازو سے تولو، یہی نتیجہ اور مآل کار کے اعتبار سے بابرکت اور بہتر ہے) ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا، کے الفاظ دنیا اور آخرت دونوں کے نتائج و برکات کے لحاظ سے استعمال ہوئے ہیں۔ آخرت میں اس کی برکات تو واضح ہیں ہی، دنیا میں بھی باعتبارِ مآل، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، یہی رویہ معاش و معیشت، کاروبار اور تجارت اور عادلانہ تمدن کے فروغ کے نقطۂ نظر سے بابرکت ہے۔ کوئی ڈنڈی مارنے والی قوم دنیا میں نہ فروغ پائی ہے، نہ پائے گی۔ یہ برائی کوئی منفرد برائی نہیں ہے بلکہ یہ بہت سی برائیوں کے پائے جانے کی ایک علامت

ہے۔ جس قوم کے اندر یہ برائی پائی جاتی ہے، خبر دیتی ہے کہ یہ قوم عدل و قسط کے تصور سے خالی ہے اس وجہ سے یہ کسی صالح تمدن کے قیام کی صلاحیتوں سے نہ صرف محروم ہے بلکہ یہ خدا کی زمین میں فساد کے بیج بونے والی ہے۔ چنانچہ سنتِ الٰہی کے مطابق ایسی قوم کی جڑ کاٹ دی جاتی ہے۔ اس مسئلہ پر انشاء اللہ ہم سورۂ اعراف میں، قوم شعیب کے بیان میں، تفصیل سے بحث کریں گے۔

تمام اعمال کے لیے معیار

'لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا' یہ وہ معیار ہے جو اللہ تعالیٰ نے تمام اعمال کے لیے مقرر فرمایا ہے کہ وہ لوگوں پر ان کی برداشت اور ان کے امکان سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا۔ اس سے ایک تو یہ بات نکلتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ احکام جو دیے ہیں انسان کی فطرت اور اس کی صلاحیتوں کو تول کر دیے ہیں، ان میں کوئی چیز بھی ایسی نہیں ہے جو اس کے تحمل سے باہر ہو۔ دوسری یہ کہ مطلوب جو کچھ ہے وہ یہ ہے کہ شخص پوری دیانت و صداقت کے ساتھ ان احکام کی تعمیل ظاہراً و باطناً کرے اگر بلا ارادہ اس کے کسی پہلو میں کوئی بھول چوک یا کوتاہی ہو گئی تو اللہ تعالیٰ کے ہاں اس پر کوئی گرفت نہیں ہے۔ معیار مطلوب کی اس وضاحت سے احتیاط میں شدت و غلو کی نفی بھی مقصود ہے کہ لوگ خواہ مخواہ اپنے جی سے اس سے آگے بڑھ کر گول باندھنے کی کوشش نہ کریں جو خدا نے مقرر کر دیا ہے۔ البتہ اس ٹکڑے سے کسی کو یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے کہ یہ ہماری صواب دید پر منحصر ہے کہ ہم اپنی طاقت و استطاعت کی حد خود مقرر کریں اور پھر اس مزعومہ طاقت و استطاعت کے پیمانہ سے ناپ کر اپنے لیے خدا کے احکام و شرائع میں سے انتخاب کریں کہ اتنا ہم سے ہو سکتا ہے، یہ ہم کریں گے، باقی ہماری استطاعت سے باہر ہے اس وجہ سے ہم اس کے مکلف نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی شریعت کے باب میں یہ اختیار کسی کو نہیں بخشا ہے۔

حق و عدل کا اہتمام

'وَاِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوْا وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى' یوں تو زبان سے نکلنے والی ہر بات کے لیے ایک عام اصول ہے کہ جو بات بھی منہ سے نکلے وہ حق و عدل کی کسوٹی پر پوری اترنے والی ہو چنانچہ سورۂ بنی اسرائیل میں ہے 'وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا' ۳۶ (اور اس بات کے درپے نہ ہو جس کے باب میں تمھیں کوئی علم نہیں۔ کان، آنکھ، دل ان میں سے ہر ایک سے متعلق پرسش ہونی ہے) لیکن یہاں موقع کلام دلیل ہے کہ تمھاری کوئی شہادت اور تمھارا کوئی فیصلہ حق و عدل سے ہٹا ہوا نہ ہو بلکہ جب بھی دو آدمیوں کے درمیان کوئی شہادت دو یا کوئی فیصلہ کرو تو وہ حق و عدل کے مطابق ہو، اور اس معاملے میں اپنے کسی عزیز و قریب کے ساتھ بھی کوئی رو رعایت نہ ہو۔

ایفائے عہد

'وَبِعَهْدِ اللّٰهِ اَوْفُوْا' اب یہ آخر میں ایک جامع بات فرما دی کہ اللہ کے ہر عہد کو پورا کرو۔ اس میں وہ تمام عہد بھی آ گئے جو اللہ نے بندوں سے لیے ہیں اور وہ عہد بھی آ گئے جو ہم آپس میں کسی مقصد صالح کے لیے کرتے ہیں۔ ہر عہد کی عند اللہ ذمہ داری ہے اس وجہ سے ہر عہد عہد اللہ ہے اگر وہ خدا کے حدود کے اندر ہے۔ چنانچہ سورۂ بنی اسرائیل میں اس کو عام ہی رکھا ہے 'وَاَوْفُوْا بِالْعَهْدِ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُوْلًا' ۳۴ (اور عہد کو

پورا کرو، ہر عہد کی بابت پرسش ہونی ہے۔

تعقل، تذکر اور تقویٰ میں معنوی ربط

'ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ' اس ٹکڑے کو اس شرح کی روشنی میں سمجھیے جو اوپر ہم نے 'ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ' کی کی ہے۔ البتہ یہ بات یہاں قابلِ توجہ ہے کہ اوپر 'تَعْقِلُوْنَ' فرمایا ہے اور یہاں 'تَذَكَّرُوْنَ' اور آگے والی آیت میں، بالکل اسی سیاق میں 'لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ' ہے۔ 'تعقل، تذکر اور تقویٰ' میں بڑا گہرا معنوی ربط ہے۔ انسان جب اندھی تقلید کی بیڑیوں سے آزاد ہو کر سنجیدگی سے ایک بات پر غور کرنے کا عزم کرتا ہے تو یہ 'تَعَقُّل' ہے۔ اس 'تَعَقُّل' سے وہ حقائق آشکارا ہوتے ہیں جو فطرتِ انسانی کے اندر ودیعت ہیں لیکن انسان کی غفلت کی وجہ سے ان پر ذھول کا پردہ پڑا ہوا ہوتا ہے، ان حقائق کا آشکارا ہونا 'تَذَكُّر' ہے۔ یہ تذکر انسان کی رہنمائی 'تقویٰ' کی منزل کی طرف کرتا ہے جو خلاصہ ہے تمام تعلیم و تزکیہ اور تمام قانونِ شریعت کا۔ ہم آگے کسی مناسب مقام میں واضح کریں گے کہ تمام شریعت کی بنیاد انسان کی فطرت پر ہے۔ اس وجہ سے جہاں تک دین کے مبادی اور اصول کا تعلق ہے وہ خارج سے نہیں آتے بلکہ انسان کی فطرت ہی سے برآمد ہوتے ہیں بشرطیکہ انسان خدا کی 'تذکیر' سے بیدار ہو کر 'تذکر' کرے۔ شریعت درحقیقت ہمارے ہی معدنِ فطرت کا برآمد شدہ خزانہ ہے جو ہماری گود میں ڈال دیا جاتا ہے بشرطیکہ ہم اس کی قدر کریں۔

حضرت ابراہیمؑ کی اصل راہ

'وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ' 'مُسْتَقِيْمًا' یہاں 'صِرَاط' سے حال پڑا ہوا ہے۔ ہم پیچھے بیان کر آئے ہیں کہ اسم اشارہ کے اندر فعل کے معنی پائے جاتے ہیں اس وجہ سے وہ فعل کا عمل بھی کرتا ہے۔ اب یہ سلسلۂ بیان کی آخری بات ارشاد ہوئی ہے کہ یہ سیدھی راہ جو میں تمھارے سامنے پیش کر رہا ہوں بس اس کی پیروی کرو۔ خدا کی بتائی ہوئی راہ یہی ہے اور یہی ابراہیمؑ کی بتائی ہوئی راہ ہے جس پر چلنے کی انھوں نے اپنی اولاد کو وصیت کی تھی۔ اس راہ سے ہٹ کر جو کج پیچ کی راہیں نکال لی گئی ہیں ان سے بچو۔ وہ ساری راہیں اس صراطِ مستقیم سے دور اور ملتِ ابراہیم سے گمراہ کرنے والی ہیں۔ اسی راہ پر قائم رہنے کی، ابراہیمؑ کے واسطے سے خدا نے تم کو ہدایت فرمائی تھی اور اب میرے واسطے سے خدا نے یہ از سرِ نو تمھارے لیے بازکی ہے تاکہ تم ہلاکت کی وادیوں میں بھٹکنے اور خدا کی پکڑ میں آنے سے بچو۔

ملت ابراہیم و ملت اسلام میں امونہی کی اساسات

یہاں یہ بات خاص طور پر ذہن میں رکھنے کی ہے کہ جس طرح کھانے پینے کی چیزوں میں حلال و حرام کے درمیان امتیاز کی فطری کسوٹی طیبات اور خبائث کو ٹھہرایا گیا ہے، اسی طرح حقوق و فرائض اور کردار و اخلاق کے باب میں فطری و عقلی اصول یہ ہے کہ جن باتوں کا حکم دیا گیا ہے وہ تو سب عدل و احسان اور معروف کے منبع سے نکلی ہیں اور جن باتوں سے روکا گیا ہے وہ سب بغی، فحشا اور منکر کے خاندانوں سے تعلق رکھنے والی ہیں۔ ملتِ ابراہیم اور ملتِ اسلام میں امر و نہی کی اساسات اللہ تعالیٰ نے انھی چیزوں کو بنایا ہے۔ اس مسئلہ پر انشاء اللہ سورۂ نحل کی آیت ۹۰ کے تحت ہم تفصیل سے بحث کریں گے۔

'ثُمَّ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ تَمَامًا عَلَى الَّذِيْٓ اَحْسَنَ وَتَفْصِيْلًا لِّكُلِّ شَيْءٍ وَّهُدًى وَّرَحْمَةً لَّعَلَّهُمْ بِلِقَآءِ

رَبِّهِمْ يُؤْمِنُوْنَ (۱۵۴)

ملتِ موسوی اور ملتِ ابراہیمی میں اشتراک

'ثُمَّ' یہاں ترتیب کو ظاہر کرتا ہے۔ اوپر، جیسا کہ واضح ہوا، ملتِ ابراہیمؑ کا بیان تھا۔ حضرت ابراہیمؑ کے بعد صاحب شریعت اور صاحب کتاب رسول سیدنا موسیٰؑ ہی ہیں۔ فرمایا کہ ابراہیمؑ کے بعد ہم نے موسیٰؑ کو کتاب دی تاکہ اپنے خوب کار بندے پر اپنی شریعت کی نعمت تمام کریں، اس میں ہر ضروری بات کی تفصیل کر دیں اور اس کو ہدایت و رحمت بنائیں تاکہ لوگ آخرت میں اپنے رب کی ملاقات پر ایمان لائیں۔

یہاں یہ بات ذہن میں رکھنے کی ہے کہ حضرت موسیٰؑ کو جو کتاب دی گئی اس میں بھی بنیادی احکام وہی ہیں جو ملت ابراہیمؑ کے باب میں بیان ہوئے ہیں۔ آپؑ کو سب سے پہلے جو احکام الواح میں لکھ کر دیے گئے' احکامِ عشرہ کے نام سے مشہور ہیں۔ تورات میں دیکھ لیجیے، الفاظ میں فرق ہو تو ہو لیکن باتوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ عدد یہ ہے کہ تعداد میں بھی فرق نہیں ہے۔ اوپر ملت ابراہیمؑ کے جو احکام گنائے گئے ہیں وہ امر و نہی سب ملا کر دس بنتے ہیں۔ یہی دس احکام شریعت موسوی کی بھی بنیاد ہیں۔ ان پر اضافہ ہوا ہے تو تفصیلات کا اضافہ ہوا ہے جیسا کہ قرآن نے اشارہ کیا ہے اور بعینہٖ یہی احکام ابتدائی طور پر، جیسا کہ ہم سورۂ نحل اور سورۂ بنی اسرائیل میں واضح کریں گے، اس امت کو دیے گئے۔ گویا اصل دین بنیادی طور پر ایک ہی ہے، فرق ہے تو اجمال و تفصیل اور آغاز و تکمیل کا ہے۔ اس ملت میں دین کو اس کی اصل اساس یعنی ملتِ ابراہیمی پر لوٹا کر کامل اور ان قیدوں اور پابندیوں سے آزاد کر دیا گیا جو یہود پر، جیسا کہ اوپر واضح ہوا، ان کی سرکشی کے سبب سے عاید ہوئی تھیں۔

یہود پر ایک تعریض

'تَمَامًا عَلَى الَّذِيْٓ اَحْسَنَ' سے مراد لوگوں نے جماعت بھی لی ہے۔ لیکن میرے نزدیک اس سے مراد حضرت موسیٰؑ ہی ہیں۔ 'الَّذِیْ' کا معروف استعمال معرفہ ہی کے لیے ہے اور جب واحد ہو تو اس سے کوئی خاص ذات ہی مراد لی جا سکتی ہے۔ قرآنی تمثیلات میں کہیں کہیں اس کا ما صدق جماعت بھی ہے لیکن اس کے خاص قرائن اور خاص وجوہ ہیں جن کی تفصیل اپنے محل میں آئے گی۔ حضرت موسیٰؑ کے لیے یہ صفت اسی طرح استعمال ہوئی ہے جس طرح حضرت ابراہیمؑ کے لیے سورۂ نجم میں 'الَّذِیْ وَفّٰٓی' استعمال ہوئی ہے۔ مقصود اس صفت کے اظہار سے حضرت موسیٰؑ کا اس اتمامِ نعمت کا سزاوار ہونا ظاہر کرنا ہے کہ اللہ نے ان کو اس نعمت کا سزاوار اس لیے گردانا کہ وہ خوب کار تھے۔ اللہ نے ان کے ظاہر و باطن میں جو کچھ ان کو بخشا اس کا حق انھوں نے پہچانا اور ہر حق نہایت خوبی سے ادا کیا۔ ایسے ہی بندے اللہ کی نعمتوں کے سزاوار بنتے ہیں اور جب وہ کسی کو اپنے منصبِ نبوت کے لیے انتخاب فرمانا چاہتا ہے تو کسی ایسے ہی خوب کار کو چنتا ہے اور اس پر اپنی نعمت تمام کرتا ہے۔ یہ صفت یہود کو نہایت لطیف انداز میں یاد دہانی کر رہی ہے کہ وہ ذرا اپنے گریبانوں میں منہ ڈال کر دیکھیں کہ جس سے انھوں نے دین کی وراثت حاصل کی وہ کیا تھا اور یہ کیا ہیں؟ اس کو اللہ نے اس لیے اس نعمت سے نوازا تھا کہ اس نے ہر نعمت کا حق پہچانا اور اس کو نہایت خوبی سے

ادا کیا۔ ان کا حال یہ ہے کہ انھوں نے ہر نعمت کی ناقدری کی، ہر ہدایت سے اعراض کیا۔ ہر حکم کا حلیہ بگاڑا لیکن مدعی ہیں کہ دنیا و آخرت کی تمام سعادتیں انہی کا حصہ ہیں۔

ہدایت اور رحمت۔

تَفْصِيلًا لِّكُلِّ شَيْءٍ میں کل شیء سے مراد وہ مسائل ہیں جو دین کے دائرے میں آتے ہیں۔ دین کے اصول اور بنیادی مسائل تو وہی ہیں جو اوپر ملت ابراہیم سے متعلق، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، بیان ہوئے لیکن ان میں سے ہر چیز کے تحت تفصیلات و جزئیات ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ کو جو کتاب عطا فرمائی اس میں یہ تمام تفصیلات و جزئیات بھی بیان فرمائیں۔ اس طرح یہ کتاب ہدایت اور رحمت کا مجموعہ بن گئی۔

'ہدایت' اور 'رحمت' کے الفاظ نہایت حکیمانہ ترتیب کے ساتھ اس مقصد کو ظاہر کرتے ہیں جس کے لیے اللہ تعالیٰ بندوں پر اپنی کتاب اتارتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کتاب اس لیے اتارتا ہے کہ دنیا میں زندگی بسر کرنے کا وہ طریقہ بتائے جو آخرت میں بندوں کو اس کی رحمت کا سزاوار بنائے۔ اس پہلو سے کتاب اپنے مقصد کے اعتبار سے ہدایت اور اپنے ثمرہ اور انجام کے لحاظ سے رحمت ہوتی ہے۔ پھر زندگی کی اصل غایت تو آخرت ہے، اس دنیا کی زندگی تو فانی اور عارضی ہے۔ اس وجہ سے کتاب الٰہی کا اصل مقصد یہ ہوا کہ وہ اس دنیا کی زندگی کو وہ جلوہ دے کہ لوگ اللہ کی ملاقات پر ایمان لائیں اور اسی کو نصب العین بنا کر زندگی کا سفر طے کریں۔ اسی حقیقت کی طرف 'لَعَلَّهُمْ بِلِقَاءِ رَبِّهِمْ' کے الفاظ اشارہ کر رہے ہیں۔

وَهٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ فَاتَّبِعُوْهُ وَاتَّقُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ۝ اَنْ تَقُوْلُوْٓا اِنَّمَآ اُنْزِلَ الْكِتٰبُ عَلٰى طَآئِفَتَيْنِ مِنْ قَبْلِنَا وَاِنْ كُنَّا عَنْ دِرَاسَتِهِمْ لَغٰفِلِيْنَ ۝ اَوْ تَقُوْلُوْا لَوْ اَنَّآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا الْكِتٰبُ لَكُنَّآ اَهْدٰى مِنْهُمْ ۚ فَقَدْ جَآءَكُمْ بَيِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ ۚ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَصَدَفَ عَنْهَا ۭ سَنَجْزِي الَّذِيْنَ يَصْدِفُوْنَ عَنْ اٰيٰتِنَا سُوْٓءَ الْعَذَابِ بِمَا كَانُوْا يَصْدِفُوْنَ (۱۵۵-۱۵۷)

'وَهٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ فَاتَّبِعُوْهُ' الایۃ۔ تورات کے بعد اب یہ قرآن کے اتارے جانے کا ذکر فرمایا اور اس کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ نے تمام خلق پر عموماً اور اہل عرب پر خصوصاً جو فضل فرمایا ہے پہلے اس کا حوالہ دیا پھر عربوں کو دھمکی سنائی کہ اس کتاب کے ذریعہ سے تم پر حجت پوری ہو چکی ہے۔ اب خدا کے سامنے تمھارے لیے کوئی عذر باقی نہیں رہا اس وجہ سے اگر اس کو جھٹلاتے ہو تو اس جھٹلانے کے انجام کو سوچ لو۔

قرآن کی عظیم برکت

لفظ 'مُبٰرَكٌ' اس بارش کے لیے قرآن میں بار بار استعمال ہوا ہے جو زمین کی سیرابی، روئیدگی اور سرسبزی کا ذریعہ بنتی، اس کے خزانوں اور اس کی برکتوں کو ابھارتی اور اس کے مردہ اور بے آب و گیاہ ہو جانے کے بعد اس کو از سر نو حیات تازہ بخشتی ہے۔ قرآن کے لیے اس لفظ کے استعمال میں یہ استعارہ

ہے کہ یہ بھی دنیا کو اس کی روحانی موت کے بعد از سر نو حیات تازہ بخشنے اور شریعت و ہدایت کے خزاں رسیدہ چمن کو پھر سے بہار کی روئیدگیوں سے معمور کرنے کے لیے نازل ہوا ہے۔ فرمایا کہ اس کی ناقدری نہ کرو بلکہ قبول کرو اور اس کی پیروی کرو جس نے تم پر یہ رحمت نازل فرمائی ہے اس کے غضب سے بچو تاکہ اس کی رحمت کے سزاوار ٹھہرو۔

قطع عذر

اَنْ تَقُوْلُوْٓا اِنَّمَآ اُنْزِلَ الْكِتٰبُ عَلٰى طَآىِٕفَتَيْنِ مِنْ قَبْلِنَا وَاِنْ كُنَّا عَنْ دِرَاسَتِهِمْ لَغٰفِلِيْنَ۔ اَنْ تَقُوْلُوْا یعنی 'کراھۃ ان تقولوا' یا ملوب اور یہ مضمون مائدہ آیت ۱۹ میں بھی گزر چکا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ نے تم پر یہ رحمت اس لیے نازل فرمائی ہے کہ مبادا کل کو تم خدا کے سامنے یہ عذر کرو کہ جس طرح یہود و نصاریٰ کو کتاب عطا ہوئی آخر ہم کو اسی طرح کتاب کیوں نہیں عطا ہوئی، ان کا علم و مطالعہ ہمارے کیا کام آسکتا تھا، ہم تو ان کے علم و مطالعہ اور ان کے درس و تعلیم سے بے خبر ہی رہے۔

قرآن ایک حجت قاطع ہے

اَوْ تَقُوْلُوْا لَوْ اَنَّآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا الْكِتٰبُ لَكُنَّآ اَهْدٰى مِنْهُمْ 'یا یہ عذر کرو کہ اگر ہم پر کتاب اترتی تو ہم ان سے زیادہ ہدایت قبول کرنے والے بنتے، پھر ہم اس نعمت سے کیوں محروم رکھے گئے!

فَقَدْ جَآءَكُمْ بَيِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ 'یعنی تمھارے یہ تمام عذرات ختم کر دینے کے لیے خدا نے تم پر ایک حجت قاطع اور ہدایت و رحمت اتار دی ہے، اب تم اس قسم کا کوئی عذر پیش نہیں کر سکتے۔ قرآن کے لیے یہاں 'بَيِّنَةٌ' اور 'ہدایت و رحمت' کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ 'ہدایت و رحمت' کے الفاظ پر اوپر بحث گزر چکی ہے۔ 'بَيِّنَةٌ' کے معنی روشن دلیل اور حجت قاطع کے ہیں۔ قرآن کے لیے یہ لفظ دو پہلوؤں سے استعمال ہوا ہے۔ ایک یہ کہ اس نے عربوں کے ان تمام عذرات کا خاتمہ کر دیا جن کا اوپر حوالہ دیا گیا ہے، دوسرے یہ کہ قرآن بجائے خود حجت و برہان ہے۔ اس کا کتاب الٰہی ہونا کسی خارجی دلیل کا محتاج نہیں ہے، یہ ایک ایسا معجزہ ہے جس کے چیلنج کا، جیسا کہ قرآن کے متعدد مقامات سے واضح ہے، اہل عرب کوئی جواب نہ دے سکے۔ علاوہ ازیں یہ تورات کی طرح صرف احکام و ہدایات کا مجموعہ ہی نہیں ہے بلکہ اپنے ہر دعوے اور ہر تعلیم کے دلائل و براہین بھی اپنے ساتھ لے کر نازل ہوا ہے اور وہ ایسے مضبوط و مستحکم اور ایسے عقلی و فطری ہیں کہ ان کے مقابل میں کٹ حجتی تو کی جا سکتی ہے لیکن ان کی تردید ممکن نہیں ہے۔

فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَصَدَفَ عَنْهَا الایۃ 'صَدَفَ' لازم اور متعدی دونوں آتا ہے۔ یعنی کسی چیز سے اعراض کرنے اور منہ پھیرنے کے معنی میں بھی اور کسی کو اس سے پھیرنے اور موڑنے کے معنی میں بھی۔ جن لوگوں نے اس کو متعدی کے مفہوم میں لیا ہے ان کی بات قوی معلوم ہوتی ہے۔ اس سے پہلے 'كَذَّبَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ' ہے، جس کے اندر اعراض اور کٹ حجتی کا مضمون خود آ گیا۔ اس کے بعد موزوں بات یہی معلوم ہوتی ہے کہ اس کو متعدی کے معنی میں لیا جائے۔ یعنی جنھوں نے آیات الٰہی کی تکذیب کی

اور دوسروں کو ان کے سننے سمجھنے سے روکا۔

مَنْ اَظْلَمُ یعنی ان سے بڑھ کر محروم القسمت اور بدبخت کون ہو سکتا ہے جن کے پاس ایسی کتاب آئے جو ان کے تمام عذرات کا خاتمہ کر دے، جو ان کے لیے حجت و برہان ہو، جو ابرِ رحمت بن کر برسے، جو رہنمائی کے لیے روشنی کا مینار اور آخرت میں رحمت الٰہی کی ضامن ہو، لیکن وہ اس کو خود بھی جھٹلائیں اور دوسروں کو بھی اس سے روکیں۔

هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ تَاْتِيَهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَوْ يَاْتِيَ رَبُّكَ اَوْ يَاْتِيَ بَعْضُ اٰيٰتِ رَبِّكَ ۭ يَوْمَ يَاْتِيْ بَعْضُ اٰيٰتِ رَبِّكَ لَا يَنْفَعُ نَفْسًا اِيْمَانُهَا لَمْ تَكُنْ اٰمَنَتْ مِنْ قَبْلُ اَوْ كَسَبَتْ فِيْٓ اِيْمَانِهَا خَيْرًا ۭ قُلِ انْتَظِرُوْٓا اِنَّا مُنْتَظِرُوْنَ (۱۵۸)

یعنی ان کے تمام عذرات ختم ہو گئے اور ہر پہلو سے ان پر حجت قائم کر دی گئی لیکن یہ دلیلوں اور حجتوں سے قائل ہونے والے آدمی نہیں۔ یہ تو منتظر ہیں کہ ان پر فرشتے اتریں، یا خدا خود ان کے لیے نمودار ہو یا نہیں تو عذاب الٰہی کی نشانیوں میں سے کوئی فیصلہ کن نشانی ظاہر ہو۔ بقرہ ۲۱۰ اور انعام ۱۱۱ میں کفار کے مطالبات کا ذکر گزر چکا ہے۔ آگے کی سورتوں میں بھی اس کا ذکر آئے گا۔ مثلاً هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ تَاْتِيَهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَوْ يَاْتِيَ اَمْرُ رَبِّكَ (نحل ۳۳) (یہ نہیں منتظر ہیں مگر اس بات کے کہ ان کے پاس فرشتے آئیں یا تیرے رب کا فیصلہ ظاہر ہو جائے) وَقَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَاۗءَنَا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا الْمَلٰٓئِكَةُ اَوْ نَرٰى رَبَّنَا ۭ لَقَدِ اسْتَكْبَرُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ وَعَتَوْ عُتُوًّا كَبِيْرًا (الفرقان ۲۱) (اور جو لوگ ہماری ملاقات کے متوقع نہیں ہیں کہتے ہیں آخر ہمارے اوپر فرشتے کیوں نہیں اتارے جاتے یا ہم اپنے رب کو کیوں نہیں دیکھتے؟ انھوں نے اپنے آپ کو بہت بڑی چیز سمجھا اور بڑی اکڑ دکھائی)

يَوْمَ يَاْتِيْ بَعْضُ اٰيٰتِ رَبِّكَ یعنی خدا اور فرشتوں کا اترنا تو الگ رہا جس فیصلہ عذاب کے یہ منتظر ہیں وہ بھی اگر ظاہر ہو جائے تو اس کو دیکھ کر کسی کا ایمان لانا کچھ سود مند نہیں۔ ایمان معتبر صرف وہ ہے جو آنکھ، کان، دل، دماغ اور عقل کی صلاحیتوں کو استعمال کر کے لایا جائے نہ کہ عذاب الٰہی کا ڈنڈا دیکھ کر۔ عذاب الٰہی کے ظہور کے بعد کسی کا ایمان کچھ سود مند نہیں ہو گا، سود مند ایمان وہی ہو گا جو اس سے پہلے لایا جائے اور اس میں کچھ عمل صالح کی کمائی کر لی جائے۔

فیصلہ کا انتظار

قُلِ انْتَظِرُوْٓا اِنَّا مُنْتَظِرُوْنَ مطلب یہ ہے کہ اگر تم اس کتاب پر ایمان لانے کے لیے نشانیٔ عذاب کے منتظر ہو تو انتظار کرو، اب ہم بھی تمھارے لیے اسی کے منتظر ہیں اس لیے کہ وہ ساری علامتیں جو کسی قوم کو مستحق عذاب بناتی ہیں تم میں نمایاں ہو چکی ہیں۔ سنتِ الٰہی کے مطابق اب ایک ہی چیز باقی رہ گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ حق و باطل کے درمیان فیصلہ فرما دے۔ باطل نابود ہو اور حق کا بول بالا ہو۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ نبی اور اس کے ساتھی جب اپنا حق ادا کر چکتے ہیں لیکن ضدی اور سرکش لوگ کسی طرح ان باتوں پر کان نہیں دھرتے تو انھیں بھی فیصلۂ الٰہی کا انتظار ہوتا ہے کیونکہ اسی فیصلہ کے ظہور کے ساتھ حق کا غلبہ وابستہ ہوتا ہے۔ اس انتظار میں اصلاً مخالفوں کی تباہی کی خواہش مضمر نہیں ہوتی بلکہ حق کی فتحمندی

کا جذبہ کارفرما ہوتا ہے۔ انبیاء علیہم السلام دنیا میں تزکیہ و اصلاح کے مشن پر آتے ہیں۔ وہ اس کام میں اپنی پوری قوت نچوڑ دیتے ہیں۔ جن کے اندر خیر کی ادنیٰ رمق بھی ہوتی ہے وہ اصلاح قبول کر لیتے ہیں۔ جو بالکل اندھے بہرے بن جاتے ہیں وہ مردوں کے حکم میں داخل ہیں جو زمین پر پڑے رہیں تو عفونت اور فساد کے سوا کچھ نہیں پھیلا سکتے اس وجہ سے ان کے فنا ہو جانے میں ہی خلق کی بہبود ہوتی ہے۔ یہاں اس اشارے پر ہم اکتفا کرتے ہیں۔ سورۂ نوح میں انشاء اللہ یہ مسئلہ تفصیل سے زیر بحث آئے گا۔

اِنَّ الَّذِیْنَ فَرَّقُوْا دِیْنَهُمْ وَكَانُوْا شِیَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِیْ شَیْءٍ ؕ اِنَّمَاۤ اَمْرُهُمْ اِلَى اللّٰهِ ثُمَّ یُنَبِّئُهُمْ بِمَا كَانُوْا یَفْعَلُوْنَ ۝ مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا ۚ وَمَنْ جَآءَ بِالسَّیِّئَةِ فَلَا یُجْزٰۤى اِلَّا مِثْلَهَا وَهُمْ لَا یُظْلَمُوْنَ ۝ قُلْ اِنَّنِیْ هَدٰىنِیْ رَبِّیْۤ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ۚ دِیْنًا قِیَمًا مِّلَّةَ اِبْرٰهِیْمَ حَنِیْفًا ۚ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ ۝ قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُكِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝ لَا شَرِیْكَ لَهٗ ۚ وَبِذٰلِكَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ ۝ قُلْ اَغَیْرَ اللّٰهِ اَبْغِیْ رَبًّا وَّهُوَ رَبُّ كُلِّ شَیْءٍ ؕ وَلَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ اِلَّا عَلَیْهَا ۚ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ۚ ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمْ مَّرْجِعُكُمْ فَیُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ فِیْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ۝ (۱۵۹ تا ۱۶۴)

پیغمبر کو آخری ہدایت

اِنَّ الَّذِیْنَ فَرَّقُوْا دِیْنَهُمْ وَكَانُوْا شِیَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِیْ شَیْءٍ ۔ اوپر آیت ۱۵۳ میں فرمایا تھا کہ وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِیْمًا فَاتَّبِعُوْهُ ۚ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِیْلِهٖ ؕ ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۔ اور یہ کہ یہ میرا سیدھا راستہ ہے تو اس کی پیروی کرو اور مختلف پگ ڈنڈیوں میں نہ بھٹکو کہ خدا کی راہ سے دور جا پڑو، یہ ہے جس کی تمہیں ہدایت فرمائی ہے تاکہ تم خدا کے غضب سے بچو۔ ہم نے اس آیت کی وضاحت کرتے ہوئے بتایا ہے کہ یہ اصل ملت ابراہیمؑ کا بیان ہے جو حضرت ابراہیمؑ کی ذریت کی دونوں شاخوں —— بنی اسرائیل اور بنی اسمٰعیل —— کو ودیعت ہوئی لیکن ان دونوں ہی شاخوں نے اس میں بدعتیں پیدا کر کے مختلف پگ ڈنڈیاں نکال لیں۔ عربوں نے شرک و بت پرستی کی راہ اختیار کر لی، یہود و نصاریٰ نے یہودیت و نصرانیت کے شاخسانے کھڑے کر لیے۔ اس طرح اصل شاہراہ گم ہو گئی۔ اللہ تعالیٰ نے خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے یہ صراط مستقیم دنیا کے لیے پھر کھولی، اور جیسا کہ اس سورہ کے پچھلے مباحث سے واضح ہوا، اس کے دلائل تفصیل سے بیان فرمائے لیکن مذکورہ تمام گروہوں نے اس واضح حقیقت کی مخالفت اور اپنی اپنی ایجاد کردہ ضلالتوں ہی پر جمے رہنے کے لیے ضد کی۔ اب یہ آخر میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت فرمائی جا رہی ہے کہ جن لوگوں نے اس دین میں، جو اللہ نے ان کو عطا فرمایا تھا، تفرقہ پیدا کیا اور مختلف گروہوں میں بٹ گئے تم کو ان سے کچھ سروکار نہیں۔ تم نے اپنا فرض ادا کر دیا۔ اب ان کو ان کے حال پر چھوڑ دو۔ ان کا معاملہ اللہ کے حوالے ہے۔ وہی ان کو بتائے گا کہ وہ کیا کرتوتیں انجام دے کے آئے ہیں۔ اس میں اس بات کی طرف اشارہ بھی ہے کہ اب پیغمبرؐ کے لیے ان سے

اعلان برأت کا وقت بہت قریب آ رہا ہے۔ چنانچہ سورۂ برأت میں، جو اس گروپ کی آخری سورہ ہے یہ اعلان بیسا کہ واضح ہوگا، آ گیا۔

'مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا الایۃ، یہ ثُمَّ يُنَبِّئُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ کی وضاحت ہے۔ ان کے اعمال کی خبر دینے سے مقصود ظاہر ہے کہ مجرموں کو رپورٹ سنانا نہیں ہے بلکہ اس کا لازم یعنی جزا اور سزا ہے۔ چنانچہ اس آیت میں واضح فرما دیا کہ جو نیکی لے کر آئے گا وہ اس کا دس گنا صلہ پائے گا اور جو کوئی برائی لے کر آئے گا وہ ٹھیک ٹھیک اپنی برائی کے بقدر سزا پائے گا۔ نہ نیکی کرنے والوں کے ساتھ کوئی کمی کی جائے گی، نہ برائی کرنے والوں کے ساتھ کوئی زیادتی۔ یہ ملحوظ رہے کہ آیت میں 'اَمْثَالِهَا' اور 'مِثْلَهَا' کے جو الفاظ ہیں ان سے مراد ان کا وہ مثل ہے جو اللہ تعالیٰ نے آخرت میں ٹھہرا رکھا ہے۔ وہ مثل مراد نہیں ہے جو دنیا میں سمجھا جاتا یا سمجھا جا سکتا ہے۔ نیز یہاں نیکی کے صلہ کی جو مقدار بیان ہوئی ہے وہ کم سے کم ہے اس سے اس فضل کی نفی نہیں ہوتی جو دوسرے مقامات میں مذکور ہے۔

پیغمبر کی زبان سے نیصلہ کن اعلان

قُلْ اِنَّنِيْ هَدٰىنِيْ رَبِّيْۤ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۚ دِيْنًا قِيَمًا مِّلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا ۚ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ۔ 'دِيْنًا قِيَمًا' 'صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ' سے بدل ہے اور لحاظ اس کے موقع و محل کا ہے قِيَمٌ اور قَيِّمٌ دونوں ہم معنی ہیں یعنی سیدھا اور فطری دین جس میں کوئی کجی اور انحراف نہیں ہے۔ قرآن میں یہ لفظ ملت ابراہیمؑ اور ملت اسلام کے لیے استعمال ہوا ہے اور مقصود اس سے اس ملت کے اس پہلو کو واضح کرنا ہوتا ہے کہ یہ اس زیغ و انحراف سے بالکل پاک ہے جو مشرکین، یہود اور نصاریٰ نے اپنے دین میں پیدا کر لیا۔

یہ وہی اوپر والی بات نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے مثبت انداز میں کہلائی گئی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تمہیں مشرکین اور یہود و نصاریٰ کی پیدا کردہ بدعات و خرافات سے کوئی سروکار نہیں۔ تم واضح الفاظ میں ان سب کو یہ اعلان سنا دو کہ مجھے تو میرے پروردگار نے صراط مستقیم —— دین قیم، ملت ابراہیمؑ —— کی ہدایت بخشی ہے جو اپنے رب کی طرف یکسو تھے، مشرکین میں سے نہ تھے۔ گویا وہ بحث جو اس سورہ میں شروع سے چلی تھی اپنے آخری نتیجہ تک پہنچ گئی، آخر میں آنحضرتؐ نے اعلان فرما دیا کہ اصل ملت ابراہیمؑ یہ ہے جس پر میں ہوں، جس کو پیروی کرنی ہو اس کی پیروی کرے، اس کے سوا سب کج پیچ کی راہیں ہیں جن سے مجھے کوئی تعلق نہیں، میں ان سے بری ہوں۔

قُلْ اِنَّ صَلَاتِيْ وَنُسُكِيْ الایۃ، 'نُسُكٌ' کے لفظ پر ہم دوسرے مقام میں گفتگو کر چکے ہیں۔ یہاں نسک کے معنی قربانی کے ہیں اور نماز کے ساتھ اس کا جوڑ اس مفہوم کے لیے قرینہ فراہم کرتا ہے۔ سورۂ کوثر میں ارشاد ہے فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ (پس اپنے رب ہی کی نماز پڑھ اور اسی کے لیے قربانی کر)

یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے ملت ابراہیمؑ اور ملت اسلام کی اصل روح کی تعبیر کرائی گئی ہے

ملتِ ابراہیم و ملتِ اسلام کی اصل روح

نماز اور قربانی، زندگی اور موت دونوں میں غور کیجیے نہایت حسین تقابل ہے۔ نماز کے مقابل میں زندگی اور قربانی کے مقابل میں موت ہے۔ یہ اشارہ ہے کہ جو اس ملت پر ہے وہ جیتا ہے تو خدا کے لیے اور مرتا ہے تو خدا کے لیے۔ اس کی زندگی میں کوئی تقسیم نہیں ہے۔ یہ از ابتدا تا انتہا بالکل ہم رنگ اور ہم آہنگ ہے۔ خدا کا کوئی ساجھی نہیں۔ 'لَا شَرِيكَ لَهُ' اس وجہ سے بندے کی زندگی میں بھی کوئی ساجھی نہیں۔ یہ پوری کی پوری، بغیر کسی تقسیم و تجزیہ اور بغیر کسی تحفظ و استثنا کے صرف اللہ وحدہٗ لا شریک لہٗ کے لیے ہے۔ فرمایا کہ 'وَبِذٰلِكَ أُمِرْتُ وَأَنَا أَوَّلُ الْمُسْلِمِينَ' یہی میری فطرت ہے اور اسی کی مجھے اوپر سے ہدایت آئی ہے، اس وجہ سے میں نے سب سے آگے بڑھ کر اس قلادہ کو اپنی گردن میں ڈالا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ میں تو اس راہ پر چل پڑا ہوں اب جس میں ہمت ہو اس راہ میں میرا ساتھ دے۔ میں اپنا سفر دوسروں کے انتظار میں ملتوی نہیں کر سکتا۔

'قُلْ أَغَيْرَ اللّٰهِ أَبْغِي رَبًّا وَّهُوَ رَبُّ كُلِّ شَيْءٍ' الآیۃ یہ اس اسلام اور اس سرفگندگی و سپردگی کی دلیل بیان ہوئی ہے جس کا اظہار اوپر والی آیت میں ہوا کہ جب اللہ تعالیٰ ہی ہر چیز کا رب ہے تو میں آخر کس طرح اس کے سوا کسی اور کو رب بناؤں اور اپنی زندگی میں کسی اور کی شرکت تسلیم کروں؟ ہر جان جو کمائی کرے گی اس کی ذمہ داری بہر حال اسی پر آنی ہے، کوئی دوسرا اس کے بوجھ کا اٹھانے والا نہیں بنے گا۔ خدا ہی کی طرف سب کا پلٹنا ہوگا، اور وہ ان سارے اختلافات کا فیصلہ سنائے گا جن میں آج تم مبتلا ہو۔

وَهُوَ الَّذِي جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ الْأَرْضِ وَرَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّيَبْلُوَكُمْ فِي مَآ اٰتٰىكُمْ ۗ إِنَّ رَبَّكَ سَرِيعُ الْعِقَابِ ۖ وَإِنَّهُ لَغَفُورٌ رَّحِيمٌ (۱۶۵)

قریش کو آخری تنبیہ

یہ قریش کو آخری تنبیہ ہے کہ اس دنیا کے اسٹیج پر نمودار ہونے والی تم پہلی قوم نہیں ہو۔ تم سے پہلے کتنی قومیں اس اسٹیج پر نمودار ہوئیں، پھر غائب ہو گئیں۔ یہاں تک کہ خدا نے ان کی جگہ تم کو دی۔ یہ خلافت خود اس بات کی دلیل ہے کہ اس دنیا کے مالک نے جس باٹ اور ترازو سے ان کو تولا اسی باٹ، اسی ترازو سے وہ تم کو بھی تولے گا اور اس کی میزان میں اگر تم پورے نہ اترے تو جس طرح اس نے دوسروں کو پھینک دیا اسی طرح تم کو بھی اٹھا پھینکے گا، خدا کی جو سنت دوسروں کے معاملہ میں رہی ہے، کوئی وجہ نہیں ہے کہ وہ تمہارے معاملہ میں بدل جائے۔ یہاں یہ بات اختصار کے ساتھ فرمائی ہے۔ اس کی پوری تفصیل آگے والی سورہ — اعراف میں آ رہی ہے جو اس کی توام سورہ ہے۔

'رَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّيَبْلُوَكُمْ فِي مَآ اٰتٰىكُمْ' یہ اس مغالطے کو رفع فرمایا ہے جو نادانوں کو بالعموم لاحق ہوتا ہے کہ جب وہ دیکھتے ہیں کہ وہ اپنی دنیا کی زندگی میں کامیاب ہیں اور دنیوی اسباب و وسائل ان کو ان لوگوں کی نسبت زیادہ ہی حاصل ہیں جو انھیں آخرت کے ڈراوے سنا رہے ہیں تو وہ یہ سمجھ بیٹھتے ہیں

کہ ان کو ڈرا دے سنانے والے بے وقوف ہیں، اگر ان کی زندگی غلط ہوتی تو ان کو یہ کامیابیاں کہاں سے حاصل ہوتیں؟ اس طرح وہ اپنی سرکشی میں اور زیادہ دلیر ہو جاتے ہیں۔ فرمایا کہ اس مغالطے میں پڑ کر اپنے کو تباہ نہ کرو۔ یہ جو کچھ تمھیں ملا ہے، تمھاری خوبیوں اور قابلیتوں کا ثمرہ نہیں ہے بلکہ اللہ کی طرف سے تمھارا امتحان ہے کہ تم شکر گزار بنتے ہو یا ناشکرے۔ نیکیوں اور بدیوں کی جزا اور سزا کا دن آگے آنے والا ہے اور یہ نہ سمجھو کہ وہ بہت دور ہے۔ وہ جلد آنے والا ہے اور اس دن ہر شخص اپنی نیکی اور بدی دیکھ لے گا۔ جنھوں نے اپنے رب کی ناشکری کی ہوگی۔ وہ اس ناشکری کی سزا بھگتیں گے، جنھوں نے اس کا حق پہچانا ہوگا، اللہ تعالیٰ ان کو اپنی مغفرت اور رحمت سے نوازے گا۔

یہ آخری سطریں ہیں جو اس بے مایہ اور گنہگار کے قلم سے اس سورہ کی تفسیر میں رقم ہوئیں۔ وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین۔

لاہور

۱۱- صفر ۱۳۸۸ھ

۱۰- مئی ۱۹۶۸ء